برجِ نور



حیات و حالات شیخ نور الدین

برج نور



حیات و حالات شیخ نورالدین

برِنج نور

حیات و حالات

حضرت شیخ نور الدّین نورانی

جموّں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر

برِنج نورُ

حیات و حالات

حضرتِ شیخ نورُالدّین نورانی

جموّں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر

ناشر: سیکرٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز
سری نگر

چھاپ خانہ: جے کے آفسیٹ۔ دہلی

پہلا ایڈیشن: ۱۹۸۱ء

دوسرا ایڈیشن: ۱۹۹۱ء

قیمت:

انچارج پبلیکیشن:
بشیر اختر

سرورق:
یوسف مسکین

سرورق ———

خطِ ارشاد جو حضرتِ میر محمد ہمدانیؒ نے
حضرتِ شیخ نورالدینؒ ولی کو عطا کیا ———
———۸۱۴ھ

ترتیب

عرضِ ناشر		۵
ایک تہذیبی پریاگ	محمد یوسف ٹینگ	۷
منظر اور پس منظر	رسول پونپر	۱۷
دائرہ ریشیت کے مرکز	رشید نازکی	۹۹
معاصرین	بشیر اختر	۱۴۷
منسوب مقامات	مسعود سامون	۲۰۱
تجزیۂ سخن	موتی لال ساقی	۲۱۷
حلقۂ یاران	محمد اسد اللہ وانی	۲۵۲

عرضِ ناشر

علمدارِ کشمیرؒ کے ورودِ مسعود کی چھٹی صدی تقریبات پر اکادمی نے اُن کے امن وعرفان کے پیغام کو عام کرنے کیلئے جتنا کام کیا۔ تواریخ گواہ ہے کہ چھ سو سال پر پھیلے ہوئے زمانے میں اتنا نہ ہوسکا تھا۔ یہ ہم سب کیلئے بڑی سعادت اور مسرت کا مقام ہے کہ ان تقاریب کے دوران اکادمی نے جتنی بھی مطبوعات شایع کیں، اُن کی بہت پذیرائی ہوئی اور کشمیر کی شناخت کے اُن پہلوؤں کے نظر نواز رنگ اپنی پوری آب و تاب سے قوسِ قزح بن کر چمکے۔ جن کا سرچشمہ علمدارِ کشمیر کی تابدار ذات اور اُن کے کارنامے ہیں۔ بُرجِ نور ایسی ہی شعاعوں کا ایک پرتو آباد ہے۔ اِس کا پہلا ایڈیشن کب کا نایاب بن چکا ہے۔ ہم اس کے دوسرے چھاپ کو اس اُمید کے ساتھ شایع کرتے ہیں کہ آج کشمیر کے عوام کیلئے حضرتِ علمدارؒ کے پیغامِ خیر و برکت کی جتنی ضرورت ہے پہلے کبھی نہ تھی۔ حضرت علمدارؒ نے اپنے وقت میں بھی ایک زبردست تصادم میں کشمیر کی خاص شناخت کا بول بالا کردیا اور اس عصر میں بھی اُن کے دامانِ رحمت میں ہماری فلاح و نجات کے سارے سامان موجود ہیں ع آرزو کی ہے تیری جب بھی تو دعاؤں کی طرح

جموں
۲۸ فروری ۱۹۹۱ء

محمد یوسف ٹینگ
سیکرٹری

ایک تہذیبی پریاگ

محمد یوسف ٹینگ

نُندہ ریشی۔ ایک تہذیبی پریاگ

کشمیری کا ایک لوک گیت، جس کی جانب بابا کمال نے اپنے ریشی نامے میں اشارہ کیا ہے، بڑے معنی خیز انداز میں ایک مقامی اسطور کی یاد تازہ کرتا ہے:

خاب ییلہِ وُچھنے میرزہٕ کاشگاری　　تاب تَس رُوُدُے نہٕ کُشیر آو

مارنہِ آسی کاشرِ ین نِوان زاری زاری　　یا شیخ نورالدینؒ یاری کر

(مرزا کاشغری نے خواب دیکھا کہ کشمیریوں کو چُن چُن کر قتل گاہ کی طرف لے جایا جا رہا ہے اُس کو تاب نہ رہی اور کشمیر آیا۔ یا شیخ نورالدینؒ ہماری مدد کر)

مرزا کاشغری بابر کا رضاعی بھائی تھا۔ اُس نے اپنی "تاریخ رشیدی" میں اس کا ذکر تو نہیں کیا مگر وہ تاریخ کے اس مقام کے بیانیئے سے پہلے ہی قتل کر دیا گیا۔ روایت کے مطابق اُس نے وسطی ایشیا میں اپنے مکان میں ایک خواب دیکھا، کیا دیکھتا ہے کہ ایک خدا ترس درویش صحرائے گوبی میں کچھ ہڈیاں چُن رہا ہے۔ مرزا تعظیماً درویش کے حضور میں آیا اور اُس سے کہا کہ آپ کون حضرت ہیں اور یہ کیا کر رہے ہیں؟ درویش نے بڑی طمأنیت سے کہا کہ میں کشمیر کا شیخ نورالدین ہوں اور یہاں اُن کشمیریوں کی ہڈیاں چُننے کیلئے آیا ہوں جنہیں اُن کے بے رحم حکمران یہاں قتل ہونے کیلئے لاتے رہے ہیں۔ روایت

کے مطابق شیخ نور الدینؒ نے مرزا کاشغری کو کشمیر آنے اور یہاں کے معاملات سُلجھانے کا بھی مشورہ دیا۔ چنانچہ یہ خواب مرزا کاشغری کے اعصاب پر چھایا رہا اور اس نے ۱۵۴۰ء میں کشمیر پر حملہ کرکے مرزا حیدر دوغلات کے نام سے یہاں پر دس سال تک حکومت کی اور مزار سلاطین سرینگر میں دفن ہوا۔

علمِ تواریخ کے ثقہ معیارات کے مطابق یہ روایت ایک رنگ آمیزانہ عقیدہ ہی قرار پائے گی جس کا تانا بانا ایک عظیم مرشد و مولا کے اردگرد اُس کے خوش عقیدہ لوگ بُن لیتے ہیں۔ یہاں اس روائت کی پامال MUNDANE تاریخی صداقت پر اصرار کرنا مقصود نہیں ہے۔ اس سے صرف یہ بات ظاہر کرنا مطلوب ہے کہ کشمیر کے اجتماعی شعور پر حضرتِ شیخؒ کی کون سی آرکی ٹائپ والی شبیہہ کندہ ہے۔ ایک دوست۔۔۔۔ ایک نجات دہندہ اور ایک شفیق محسن۔۔۔ یہ شبیہہ ایک بڑی ہی غیر معمولی اور بصیرت افروز علامت کی صورت میں بھی جلوہ گر ہوئی ہے۔ انہیں کشمیری علمدارِ کشمیر یعنی کشمیر کے پرچم بردار کے پُراسرار نام سے یاد کرتے ہیں اور یہ خطاب اُن کے چہیتے شاگرد بابا نصر الدین نے اُس وقت تراشا جب حضرتِ شیخؒ ابھی بقیدِ حیات تھے۔ اس خطاب میں وہ بھی سیکولر، قومی اور اجتماعی سُر بج رہے ہیں جو کشمیریوں کے قومی مزاج کا خاصہ رہے ہیں اور وہ بھی اُس وقت جبکہ یہ تصورات بہت ہی دُھندلے تھے۔ بعد کے واقعات نے اس استعارے میں چھپے ہوئے مفہوم کو آشکارا کر دیا۔ کشمیری کلچر کے ہر موڑ پر شیخ نور الدینؒ کی قوم سازی کی چھاپ انتہائی گہری نظر آتی ہے۔

نور الدینؒ کا وقت صرف کشمیر کیلئے ہی نہیں بلکہ اس کے مضافات میں واقع ممالک کیلئے بھی بحران، آویزش اور اُبھار کا زمانہ تھا۔ اسلامی انقلاب کی طاقتور موجیں ساحلِ

سندھ سے اس وقت ٹکرائیں۔ جب ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم نے راجہ داہر کا تختہ اُلٹ دیا۔ راجہ داہر کا بیٹا جے سیا، جو کشمیر کے راجے کا قرابت دار تھا، ہانپتا کانپتا یہاں پناہ لینے کیلئے آن پہنچا۔ محمد بن قاسم اُس کے تعاقب میں کشمیر کے گرد نواح تک پہنچا اور اگر کشمیر کی محیط پہاڑوں کی فصیلیں راستہ نہ روکتیں تو صحرائے عرب سے اُٹھی ہوئی یہ موجِ بلاخیز اُسی وقت کشمیر کو اپنی آغوش میں سمو لیتی۔ بہرحال حمیم بن سام نامی ایک شامی نژاد مسلمان یہاں آنے میں کامیاب ہوا۔ اُس نے کشمیر کی پہلی مسجد تعمیر کی اور اسلام کی تبلیغ کا وہ سلسلہ شروع کر دیا جس کے مقدّر میں کشمیر کا سارا رنگ روپ اور ناک و نقشہ تبدیل کرنا لکھا تھا۔ اس سلسلے میں ہمارا آمنا سامنا عظیم کشمیری فاتح للتا دتیہ مکتا پیڈ (۶۲۵ - ۷۵۳) سے بھی ہو جاتا ہے۔ للتا دتیہ نے عربوں کی پیش قدمی کو روکنے کی کوشش کی۔ کیونکہ وہ ملتان اور سندھ کے اڈوں سے چاروں طرف چڑھ آ رہے تھے۔ خطرے کی یہ گھنٹیاں کلہن پنڈت کے بیانات کے بین السطور میں بھی بجتی نظر آتی ہیں اور یہ پرچھائیاں اتنی لمبی ہو رہی تھیں کہ للتا دتیہ نے ان سے خائف ہو کر چین کے خاقان کی اعانت طلب کرنے میں ہی خیریت سمجھی۔ ہرش دیو کے وقت (۱۰۸۹ — ۱۱۰۱) میں ترکوں نے جو کلہن کی فرہنگ میں مسلمانوں کی مترادف اصطلاح ہے کشمیر کی فوج میں سینکڑوں کی تعداد پر مشتمل جتھوں کی کمان سنبھال لی تھی۔ یہ وہی زمانہ ہے جب ہرش نے ہندو ہونے کے باوجود مندروں اور تیرتھ استھانوں کی بے حرمتی کی اور اُن کے خزانے لوٹ لئے۔ (کشمیری زبان میں "ہرشہ دیو" آج تک ابتلاء نازل ہو جانے کے معنوں میں مستعمل ہے)۔ بہرحال یہ دو عملی اُس وقت ختم ہوئی جب ۱۳۲۰ء میں ایک لداخی بودھ رنگچن (جسے غلطی سے رینچن پڑھا جاتا ہے) نے سلطان صدر الدّین

کا اسلامی لقب اختیار کر کے کشمیر میں اسلام کے سیاسی اقتدار کا آغاز کر دیا۔

یہ اگرچہ نئی آزمائش کا بنیادی رُخ تھا لیکن اس میں دوسرے عناصر کی آمیزش کچھ کم نہ تھی۔ دانش و بینش کے قلمرو میں چند نہایت ہی دور رس اور اہم معاملات سر اُٹھا رہے تھے۔ یہ بات معنی خیز ہے کہ ایک فرسودہ کلچر نے نئے تصورات کے لمس سے حاملہ ہو کر ایک ایسے غیر معمولی علمی اور ادبی چراغان کو جنم دیا۔ جو کشمیر کے سارے اُفق کو اپنی پھلجڑیوں سے جگمگا دیتا ہے۔ . . . . یہ ایک مرتے ہوئے نظام کی آخری ہچکی تھی۔ ایک دو صدیوں کے زمانے میں دانشوری اور ادب کی سطح پر ایسی سرگرمی دِکھائی دی۔ جو اپنے معیار اور مقدار کے لحاظ سے کشمیر کی ساری تاریخ میں عدیم المثال اور بے نظیر ہے۔ اس دوران اُتپل دیو ___ آچاریہ ممٹ، ابھینو گپت اچاریہ، کھیمندر اور کلہن جیسے درخشاں ستارے پیدا ہوئے۔ ابھینو گپت نے کشمیری شیومت کے فلسفے کو ایک گلدستے کی شکل دی جس سے اسلام کی وحدانیت اور اس کی قوتِ عمل کی خوشبو آتی تھی۔ اُس نے بُت پرستی اور رہبانیت کو ٹکسال باہر کر کے اسلام کے بنیادی نظریات کیلئے راستہ ہموار کر دیا۔ اُس کا کہنا ہے کہ انسان شیو تک پہنچنے کیلئے ترکِ لذات کا نہیں، بلکہ زندگی کی نعمتوں سے سرشار ہونے کی راہ بھی اختیار کر سکتا ہے۔ یہ بات بحث طلب ہو سکتی ہے کہ اُس کے نظریاتی آمیزے کی ہیئتِ ترکیبی کیا تھی لیکن ایک بات عیاں ہے کہ اسلام نے کشمیری فکر و نظر کے ایستادہ پانیوں میں ایک بڑا پتھر پھینک کر اسے تنقید، تجزیے اور تجربے کے نئے گرداب پہنا دیئے تھے۔ یہ بات ظن و تخمین کی قوت کو شہ دیتی ہے کہ اُس کا نام کلہن پنڈت نے کہیں نہیں لیا ہے۔ وہ کلہن کا اتنا قریبی ہم عصر اور اس قدر عظیم قدو قامت کا دانشور اور فلسفی تھا کہ کلہن کو اُسے نظر انداز

کرنے کیلئے جان بوجھ کر کوشش کرنا پڑی ہوگی۔ (ابھینو گپت کلہن سے صرف ایک سو سال پہلے گذرا تھا) ایسا لگتا ہے کہ ابھینو گپت نے اسلام کے چیلنج کی دھار کو کُند کرنے کیلئے اُس کے بلند آہنگ ہروں کو کشمیری فلسفے کی رسفینی میں سمو دیا لیکن اُس کا خمیازہ اُسے یوں اُٹھانا پڑا کہ کلہن جیسے کٹر پنتھوں نے اُسے اپنے غم و غصے کا شکار بنا کر فرطِ غضب سے نظر انداز ہی کر دیا۔ ابھینو گپت ..... یعنی ایک نہایت ہی جدید فلسفے کا بانی ...... کا خطاب بھی شاید اپنے اندر اُس کے تواریخی رول کی عقدہ کشائی کی کلید پوشیدہ رکھتا ہے۔ ابھینو گپت اور کلہن کے مختلف ردِ عمل شاید اُس وقت کی جدلیات کے دو متوازی دھاراؤں کو واضح کرتے ہیں۔ ایک لچک دار نئے خیالات کو جذب کرنے کی صلاحیت سے لیس، دوسرا قلعہ بند اور منجمد اور رجعت پسندی کو بچانے کیلئے آخری لڑائی لڑتا ہوا۔

یہ ابتدائی معروضات اُس عہد ساز رول کو نمایاں کرنے کے لئے کچھ ضروری تھیں جو شیخ نور الدینؒ نے کشمیر کے تواریخی سٹیج پر انجام دیا۔ وہ چودھویں صدی کی آخری چوتھائی میں پیدا ہوئے اور پندرہویں صدی کے چوتھے دہے میں انتقال کر گئے۔ اُس وقت مسلمان کشمیر کے سیاسی اقتدار کے مالک بن چکے تھے۔ لیکن کشمیر کا سماجی اور تہذیبی تانا بانا جوں کا توں تھا۔ اس تفصیل کے اجمال کیلئے "راج ترنگنی" کے فاضل مرتب آرل سٹائن کا یہ جملہ کافی ہوگا۔

"اسلام کشمیر میں زبردستی کی فتح سے نہیں بلکہ مرحلہ وار تبلیغ سے آیا اور اس کیلئے جنوب اور وسطی ایشیاء سے آئے ہوئے اجنبی مہم جوئوں نے راستہ ہموار کیا تھا۔" سٹائن کے بیان کے مطابق قبولِ اسلام نے نہ تو کشمیر کی آزادی کو متاثر کیا اور نہ ہی یہاں کی سیاسی اور

تہذیبی فضائیں پہلے پہلے کوئی انقلاب لایا۔ اگرچہ رنگ چن حضرت شرف الدین عبدالرحمان المعروف بُلبُل شاہ کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہوا۔ لیکن کشمیر میں "بانئ مسلمان" کا خطاب حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی کے حصّے میں آیا۔ اُن کی کشمیر میں تین بار آمد کا دعوٰی کیا جاتا ہے اور ایک تشریف آوری کا ذکر تو تقریباً ایک ہم عصر مورّخ مرزا حیدر بدخشی نے اپنی "منقبت الجواہر" میں ۱۴۳۰ھ میں کیا ہے۔ جس کے مطابق وہ ۱۳۸۵ء میں کشمیر آئے۔ وہ سیّدوں کے ایک بڑے قافلہ کے میرِ کارواں تھے۔ ان سیّد مبلغوں نے کشمیر میں اسلام کے خالص مسلک کی تبلیغ شروع کی اور اس سے یہاں تہذیبی ٹکراؤ کا عمل تیز تر ہو گیا۔ برہمن تعصبات کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ اور چار ورنوں کی جابرانہ تقسیم کے نیچے کچلی ہوئی جنتا اسلام کی طرف سے مساوات کے دعوٰی کی طرف پُر امید نگاہیں مرکوز کئے ہوئے تھی۔ لیکن وسطی ایشیا کے مبلغ جسطرح کشمیر کی روایتی زندگی پر حملہ بول رہے تھے اُس سے ایک کلچرل شاک کا سماں پیدا ہو رہا تھا۔ یہ مبلغ ایک توانا اور تنومند تہذیبی لہر کے نقیب تھے۔ وہ بہتر طریق بہتر تیکنک اور بہتر حرفت کے سفیر تھے۔

علامہ اقبال نے اپنی شاعرانہ رنگ آمیزی کے ساتھ اسی صداقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

خط را آں شاہِ دریاء آستین — داد علم و صنعت و تہذیب و دین

آمزید آں مردِ ایرانِ صغیر — با ہُنر ہائے غریب و دلپذیر

اس تہذیبی پیش رفت نے کشمیر کی گھاٹی میں پہاڑوں کی اوٹ میں رہنے والے سادہ لوح لوگوں کو تقریباً مبہوت کر کے رکھ دیا۔ اس کے نتیجے میں نئے

مبلغوں کا اثر صرف طبقۂ اُمراء تک ہی محدود رہا۔ اس نازک مرحلے پر جب اسلام کی چڑھتی ہوئی لہر بھی اس عجیب و غریب صورتحال کے آگے تقریباً ٹھٹری کی ٹھٹری ہو کر رہ گئی تھی، شیخ نورالدینؒ ایک سنبھالا دینے SHOCK ABSORBER کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ وہ صرف دوسری پیڑھی کے نومسلم تھے اور کشمیری رہن سہن کے طریق و مسلک میں شرابور تھے۔ اس سلسلے میں مقامی تہذیب کے ساتھ اُن کے معانقے کے متعلق ایک بہت ہی پُرمغز تلمیح ملتی ہے۔

لل دید، جسے کشمیری شیومت کا ایک بڑا شارح اور ترجمان مانا جاتا ہے حضرت شیخ سے سابقہ ایک عجیب انداز میں ہونے کی روایت ہے۔ اس کے مطابق حضرت شیخ نے جب جنم لینے کے بعد ماں کی چھاتی سے دودھ نہیں پیا۔ تو لل مجذوبہ آئیں۔ انہوں نے ننھے بالک کو اپنی چھاتی سے لگالیا اور اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگی "پیو، پیو کہ جب پیدا ہونے سے نہ شرمائے اب پینے سے کیوں لاج آتی ہے"۔ روایت کے مطابق بچے نے اس پر اُن کی چھاتیوں کو چوسنا شروع کیا۔ ظاہر ہے کہ وہ للہ کی چھاتی سے کشمیر کی قدیم تہذیبی روایت کا امرت چکھ رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے خود بڑا ہو کر اس کا اقرار کیا۔ اور کہا ع

تس پدمان پورچہ للے تمہ گلے امرتھ پیو
سوے ساًنز اوتار لوٗنے تتھے مے ور دِتم دیو

یہ کہہ کر لل دید میری اوتار ہیں۔ شیخ نے اپنے روحانی ورثے سے ہم آہنگی اور اس کی بہترین تہذیبی روایات سے ہمسائیگی کا اعتراف کیا ہے۔

حضرتِ شیخ علمِ قدیم کا بھی عرفان لے کر نکلے، لیکن انہیں نئے مسلک پر

پورا ایمان و ایقان تھا۔ وہ نئے مذہب و مسلک کی علمبرداری میں نہ کسی کو اپنے سے بالاتر سمجھتے تھے اور نہ اپنے آپ کو کسی سے ہیٹے۔ وہ صرف ظاہر اور وضع کی برتری کو باطن کی طہارت و پاکیزگی کا نعم البدل نہیں سمجھتے تھے بلکہ انہیں یقین تھا کہ جس خُدا کا پیغام قرآن اور اسلام لے آیا ہے اُس کے دربار میں حسب و نسب کی نہیں، اعمال و افعال کی برتری و بالادستی قائم ہے۔ چنانچہ وہ اس پُراعتماد لہجے میں کہتے ہیں۔ ع

زراڈِ پوشَس دیوّل اوزوتے
نہ کھیٔیس گرُ گُپن گاو
شہ ییلہِ شاہَس شیرِ ووتو
شہ اَوِ ذوتو اَدِ کتہِ رُود

(ایک گلدستے کو اپنی پیٹ میں لئے ہوئے جب حقیر برگِ گیاہ کا بندھن جسے نہ مویشی کھائیں اور نہ گھوڑے، اگر بادشاہ کی کلغی تک پہنچ گیا تو اُس کی ذات کی حقارت کا کیا پوچھتے ہو؟)

اور شاہ کی کلغی تک پہنچنا اعمالِ صالحہ کا ثمر ہے۔ تلفظ کی مُرکبوں، طرزِ ادا کے نستعلیق ہونے یا لباس و پوشاک کی نفاست کا اثر نہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ خود کشمیری گدڑی میں رہے۔ کشمیر کی روکھی سوکھی خود رو سبزی ترکاریاں کھاتے رہے اور کشمیری عوام کی اکثریت کے ہم سطح رہے۔ انہیں اپنے مسلک کی پختگی کا اتنا زبردست یقین تھا کہ انہوں نے نئے طبقۂ شرفا پر یوں چھینٹے اُڑائے ؎

ملن ہنگہ پھیتی کیاہ شبالی پکان اُلتھ وُلتھ کیتھ
کھوٗرن نہ کونش تہ کاسم نالی کرتھ ٹلی ترکہٕ ٹھالی ہیتھ

(ان ملاؤں کو دیکھو۔ سر کی کلغیاں کیا لہراتے ہیں کس طرح زیب زینت رچے بسے ہیں۔ پاؤں میں ندی کے جوتے اور جسم پر چغے ہیں۔ لیکن..... آستینوں میں کاسہ گدائی بھی موجود ہے)

اس طنز میں زہر خندہ ہی نہیں۔ مزاح کی لطیف چاشنی بھی موجود ہے لیکن معاملہ اس سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے اور وہ کہتے ہیں:

نێبرٕ ے شۆہلہٕ، اَندرٕ شۆمی — مێمبرن کھَسن تہٕ کَرن کرٕی کار

لُکھ ڈُپز تہٕ مولوی رُومی — نَتہٕ مُلہٕ ڈیشتھ استغفار

(باہر سے آراستہ پیراستہ اور اندر سے بھیانک۔ منبروں پر کس انداز وادا سے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ لیکن مُلا ہو تو مولوی رومی جیسا۔ ورنہ ہر مُلا کو دیکھ کر توبہ پڑھنی بہتر)۔

یہ شیخ نورالدینؒ کی اسلام سے برگشتگی نہیں تھی بلکہ اس کے سطحی علمبرداروں سے خفگی۔ انہوں نے ان کا خوف دور کر کے اسلام کو کشمیری عوام کیلئے زیادہ قابلِ قبول اور زیادہ مرغوبِ خاطر بنادیا اور اس کے جو نتایج نکلے، وہ ظاہر ہیں، اسی لئے حضرتِ شیخ ایک عظیم تہذیبی سنگم کے نمائیندے اور ایک شاندار روحانی پریاگ کے مرکزی نقطے ہیں۔ یہی اُن کو کشمیر کے خاص کلچر کے عظیم الشان بانیوں میں ایک الگ اور منفرد مقام عطا کرتا ہے۔

حضرتِ شیخ کی سوانح اور اُن کے شعری کارنامے، اور تہذیبی کارنامے کی ان عظیم جہتوں کو نمایاں کرنے کیلئے اکادمی نے زیرِ نظر کتاب کی اشاعت ہاتھ میں لی ہے۔ اور ہمیں اُمید ہے کہ یہ اپنے موضوع کے متعلق چند نئے اور تازہ کارانہ خیالات پیش کرنے میں کامیاب ہوگی۔ حضرتِ شیخ کا مستند اور مفصل کلیات دو حصوں میں ترتیب دے کر شایع کیا جاچکا ہے۔ اب اس تفصیلی سوانح سے اس بارِ امانت کا دوسرا دور پورا ہو جاتا ہے۔

○

منظر اور پس منظر

رسول پونپُر

حضرت شیخ العالمؒ سے قبل کشمیر کے سیاسی و سماجی حالات

اشاعت اسلام سے قبل

غور سے دیکھا جائے تو تاریخ سے زیادہ ادب ہی زندگی کے قریب تر ہے کیونکہ تاریخ راجوں مہاراجوں اور شہنشاہوں کے مکمل و نامکمل سلاطینی اور انتظامی امور سے متعلق ایک یک رُخی تصویر پیش کرتی ہے اور ادب بالخصوص اساطیری ادب ہمیں عام انسان کے ذہنی افق کی غیر مرئی روشنیوں تک رہنمائی کرتا ہے ہم اپنی قدیم مدنی اور معاشرتی زندگی کے خدوخال نیل مت پوران کے براق لیکن دھندلکوں میں گھرے ہوئے اوراق کے آئینے میں دیکھ سکتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر رادھا کرشنن پورانوں میں حقیقت کو اساطیری اور افسانوی رنگ میں پیش کیا گیا ہے تاکہ اکثریت کے شعور و ادراک سے ایک طرح کی مطابقت پیدا کی جاسکے۔

The Puranas contain the Truth dressed up in Myth and stories to suit the weak understanding of the majority. The hard task of interesting the multitude in Metaphysics is achieved in India.

حقیقت بھی یہی ہے کہ انسانی زندگی اساطیری اور مابعد طبیعاتی تصورات سے مزین ہے، اگر

ایسا نہ ہوتا تو جینا دبال ہوتا ستی سر کے خشک ہونے، ناگوں اور پشاچوں کے یہاں آباد ہونے کے ساتھ ہی ہماری قدیم تہذیب کے خدّ و خال نمایاں ہونے لگتے ہیں جنہیں سمجھنے میں نیل مت پوران اور راج ترنگنی سے بہت حد تک رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ ہماری قدیم تواریخ گونند اول سے شروع ہوئی یہ وہی وقت ہے جب شمالی ہندوستان میں کوروؤں کا راج تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے گوتم بدھ (۵۶۳ تا ۴۸۳ ق م) کا بھی ذکر خیر ہو جس نے بنی نوع انسان کو عدم تشدد کے سچے کردار و عمل اور محبت کا پیغام دیا۔ وہ قادرِ مطلق کے بارے میں خاموش ہی رہے لیکن انہوں نے معتدل اور متوازن انسانی شخصیت و سماج کو مکمل شانتی کے لئے لازمی قرار دیا۔ اشوک کے عہد زرین (۲۷۳-۲۳۲ ق م) کے دوران بدھ مت کو کشمیر میں عروج حاصل ہوتا ہے۔ اشوک مدھینتکا کو یہاں بدھ مت کا پرچار کرنے کے لئے بھیجتا ہے تو وہ اُس وقت بھی یہاں کئی بودھ دہار دیکھتا ہے جو اوّلین بودھ شہنشاہ راجہ سریندر کے عہد سے تعمیر کئے جا چکے تھے۔

ہیون سانگ کا کہنا ہے کہ اشوک کے زمانے میں پانچ سو سے زائد بودھ بھکشو بدھ مت کی تبلیغ کے لئے سرینگر میں قیام پذیر ہوئے۔ کنشک کے عہد میں یہاں چوتھی بودھ کونسل ہاروان میں منعقد ہوئی ہے۔ گوتم بدھ کے اقوال زرین کو جمع کرکے باشرح ترتیب دیا گیا۔ اس طرح بدھ مت کشمیر میں سنسکرت زبان میں رواج پاتا ہے۔

بودھ مفکرین مہایان فرقے کی بنیاد ڈالتے ہیں۔ اس ضمن میں ناگ ارجن، ناگ سین و دیگر مفکرین قابل ذکر ہیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جب بدھ مت، ہین یان اور مہایان فرقوں میں بٹ جاتا ہے۔ کمارا جیوا دھرم یشا، گنہ ورمن، پنیا یاترا، چین و دیگر ممالک میں بدھ مت کے عروج کے عناصر ترکیبی مانے جاتے ہیں۔ انہی تردمست و تردماغ اور خدا شناس بزرگوں کی مستحسن کوششوں کے نتیجے میں کشمیر دیگر علوم و فنون کے دوش بدوش بدھ مت کا گہوارہ قرار پاتا ہے۔

متعدد چینی سیاح بہشت ارضی کی خارجی اور داخلی عنایات سے بہرہ ور ہونے کے لئے یہاں آتے ہیں چین یئ، چی مانگ، فاہیان، ہیون سانگ، او سوان تے اور واو کانگ کے نام اس سلسلے میں

بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

فطرت کی معروضی، موضوعی اور غیر مرئی قوتیں ہماری خارجی اور داخلی بساط کے لیئے ابتلائے مسلسل ہیں، جس کی وجہ سے ہمارے پُر اسرار اندرون کو انتشار و اضمحلال کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ بقول غالب ؎

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر ہی میرا رنگ زرد تھا

یہی وہ ابدی اور بنیادی حقیقت ہے، جس کی استوار بنیاد پر مذاہب عالم وجود میں آئے اور فطرت بوقلموں کے بارے میں فلسفیانہ ایقان و ایجاب نے جنم لیا۔ دور کیوں جائیے اپنشدوں، ویدوں اور پُرانوں کے غائر مطالعہ سے یہ بات اور بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ اپنے سیمیائی من بدن کو کھنگالنے اور ذاتِ کل کے ہمہ جہت بکھرے جلوؤں کو سمیٹنے کا فطری جذبہ بہت ہی قدیم ہے راہیں جداگانہ لیکن منزل ایک ہی تو تھی، نا یافت ہی سہی ؎

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

ہندو مت ایسے روحانی تصورات، خیالات و مشاہدات کا مجموعہ ہے، جس کا پرچار مختلف ادوار میں برِ صغیر کے اوتار، سنت سادھو اور رشی منی کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ دیوی دیوتاؤں کی کثرت نے وحدتِ تصور کے لئے زمین ہموار کی اور توحید کی بنیادیں استوار ہوئیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس بات کی طرف غبارِ خاطر میں یوں اشارہ کرتے ہیں "دنیا میں وحدت الوجود کے عقیدہ کا سب سے قدیم سرچشمہ ہندوستان ہے۔ غالباً یونان اور اسکندریہ میں بھی یہیں سے یہ عقیدہ پہنچا اور جدید افلاطونی الٰہیات (Neoplatonism) نے (جسے غلطی سے عربوں نے افلاطون کا مذہب خیال کیا تھا) اس پر اپنی اشراقی عمارتیں استوار کیں تھیں۔ یہ عقیدہ حقیقت کے تصور کو ہر طرح کے تصوری تشخصات سے منزہ کر کے ایک کامل مطلق تصور قائم کر دیتا ہے۔"

"ایک اگنی ہے، جو جگہ جگہ شعلہ زن ہے، ایک سورج ہے ساری مخلوق پر ضیا بار ہے ایک اوشا ہے کہ کائنات کو منور کرتی ہے، وہ "جو ایک" ہے۔ اُسی نے یہ سبھی روپ دھار لئے ہیں (رگ وید) یہ جاننا چاہیئے کہ یہاں کثرت یا تعدد نہیں۔ جو کوئی بھی یہاں کثرت دیکھتا ہے وہ مہد سے لحد تک اندھیرے میں غلطاں ہے۔"—

جو انسان اُس کی پوجا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ "ایک" ہے اور میرا وجود دوسرا، وہ تہی مغز ہے۔

"جس نے اپنے آپ کو جانا، پرکھا، سنا اور پہچانا، اُسے ساری کائنات کا گیان حاصل ہوا۔" اُسے کیا غم جسے جیو آتما کی وحدت کو جانا، اس کا دل زنجیروں سے مکتی پا چکا، اُس کے سارے شکوک دُھل گئے۔"

امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ سیاسی و سماجی مصلحتوں کے پیشِ نظر مروجہ عقائد کو آریائی عقائد کے تطابق میں تشکیل دے کر حقیقتِ مطلق کو شو شکتی اور وشنو کے الوہی صفات سے متصف کیا گیا۔ اِس کے دوش بدوش جنم کرم کا نظریہ یا فلسفۂ آواگون بھی متشکل ہوتا ہے بار بار کے اسی چکر سے نجات پانے کے لئے عرفان و آگہی کی ضرورت محسوس کی گئی جسے ریاضت و نفس کُشی کے مندرجہ ذیل مراحل سے گزرنے کے بعد ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

یہ جاننا کہ ابدیت کیسے حاصل ہے اور کیسے نہیں، دوسرے الفاظ میں یہ تمیز کر سکنا کہ دُنیا اصل حقیقت کا روپ ہے اور وہی ابدی ہے۔ وحدہٗ لاشریک ہے (ادویت)۔ 2

ترکِ لذات و خواہشات کر کے ہر قسم کے حرص و ہوا سے بے نیاز ہو کر عرفانِ حق حاصل کرنا، شم (آنند) پرانایام (حبسِ نفس) ترک (ویریت)، توکل (تتی کھیا)، تفکر (سمادھ) اور یقین (شردھا) جیسی روحانی صفات سے مزین ہونا۔

کرم یوگ، بھگتی یوگ، گیان یوگ اور راج یوگ کو رہنما بنا کر ہی پرم آنند حاصل ہو سکتا ہے۔

کشمیر کو عرفانِ ذات و کائنات کے خالق ہونے کی برتری بھی حاصل ہے یہاں کے خلاق و ذہین دانشور معرفتِ الٰہی کا فطری جذبہ سینہ سے لگا کر خود نگری کی اتھاہ گہرائیوں میں اُترتے رہے

شیومت ہندوستان کا بہت ہی قدیم عقیدہ ہے، جو ویدی عقائد کے پہلو بہ پہلو سارے برِصغیر میں رائج تھا۔ راج ترنگنی میں بھی ایسے حوالے ملتے ہیں، جن سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شیومت یہاں اگلے وقتوں سے طمانیتِ قلب کا سامان فراہم کرتا آیا ہے علم و آگہی کے لئے کشمیر کی فضائیں رواداراور وسیع رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باہر سے آئے ہوئے عقائد یہاں کے لوگوں کے دِلوں میں گھر کرتے رہے۔ ساتویں صدی عیسوی سے کشمیر میں شیومت کی تجدید کا آغاز ہوتا ہے اور آٹھویں، نویں صدی عیسوی تک یہاں بدھ مت کا زور رفتہ رفتہ گھٹ جاتا ہے۔ نویں صدی عیسوی میں واسوگپتا شوسوتروں سے کشمیر شیومت کی بنیاد ڈالتا ہے جس پر بھٹ کلٹ، سومانند، ابھنو گپت اور اُتپل دیو اپنی تردستی، تردماغی اور وجدانی آگہی سے کشمیر شیوازم کی جدید عمارت تعمیر کرتے ہیں یہ کہنا شاید بے جا نہیں ہوگا کہ اس کی تعمیرِ جدید میں بدھ مت کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ ہندوستانی شیومت میں کشمیر شیوازم کا سب سے اہم اور تاریخی اضافہ یہ ہے کہ اس نے ذات پات کی بندشوں سے اسے آزاد کر کے عام انسانی زندگی سے بہت قریب لایا۔ اس کی یعنی کشمیر شیومت کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس نے مایاواد سے اپنا دامن چھڑایا۔ اس طرح خودنگری و عرفانِ ذات کا مبنی بر عمل نظریہ وجود میں آیا جس کی بنیادیں اُدویت واد پر استوار تھیں۔ اس نے رسوم و قیود کے بندھنوں سے عبادات کو آزاد کیا۔ کشمیر شیومت کے عناصرِ ترکیبی کو ترکا شاستر کا نام دیا گیا ہے، جو آگمہ شاستر، سپند شاستر اور پرتیہ بجھیا شاستر پر مشتمل ہے۔ اس لئے جب آٹھویں صدی عیسوی سے رفتہ رفتہ یہاں اشاعتِ اسلام کا سلسلہ شروع ہوا تو نظریاتی طور بھی تبلیغ وحدت کے لئے بھی یہاں کی فضا بڑی سازگار تھی۔

معاشرتی اور سماجی زندگی

تاریخ کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہاں کی آبادی زیادہ تر زراعت پیشہ تھی گھریلو صنعتوں اور دستکاریوں کا بھی رواج تھا کشمیریوں کی ذہانت، ہنرمندی و تردستی کے شواہد دُور دُور تک بکھرے پڑے ہیں۔ لارنس کشمیریوں کی ہنرمندی کی داد یوں دیتا ہے کہ شاید ہی کوئی کام ہو جسے وہ بطریقِ احسن انجام نہ دے سکتا ہو چین دیگر وسط ایشائی ممالک سے تجارتی تعلقات بھی قدیم ہیں ہندو عہد کے اختتام کے ساتھ ہی چین سے

تجارتی تعلقات محدود ہوئے۔ ناگ پوجا عام تھی شیش ناگ، اننت ناگ، ویر ناگ ایسے متعدد چشمے آج
بھی اُن کی یاد تازہ کرتے ہیں شِو، وشنو اور برہما کی پوجا بھی کی جاتی تھی۔ تعددِ ازواج کے پہلو بہ پہلو تعددِ
شواہر کی رسم بھی عام تھی۔ ستی کے رسم بھی رائج تھی۔ تاریخ سے کئی رانیوں کے اپنے آپ کو خاوند کی
چتا میں زندہ جلانے کی شہادتیں ملتی ہیں۔ چار ذاتوں برہمن، کھتری، ویش اور شودر کے برعکس
یہاں کا سماج کئی ذاتوں میں منقسم تھا، جس میں چنڈال اور ڈوم جیسی ذاتیں بھی چوتھے
ورن میں شامل تھیں۔ زندگی کی طرح تاریخ بھی کوئی خطِ مستقیم نہیں، ہر فرعونے را موسیٰ۔ جہاں للتادتیہ اور
اونتی ورمن جیسے عادل، رعایا پرور اور اعلیٰ ذوق کے باصلاحیت بادشاہ ہمارے لئے محلِ افتخار میں
وہاں ہرش دیو جیسے کئی راجاؤں کے سفاک و بہیمانہ طرزِ نظام و طرزِ زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے ہمارے
سر شرم سے جھک جاتے ہیں گو کہ وہ کئی ذاتی خوبیوں کا مالک تھا۔ انہی جیسے بادشاہوں کی ریشہ
دوانیوں سے یہاں کے برہمن جاتی اپنے آپ کو برہمن ذات سے منسوب تصور کرنا گناہ سمجھنے لگے
تھے۔ اگر کوئی کسر رہی تھی وہ ذولچو نے ۱۳۲۰ء میں پوری کر دی۔ ذولچو جو ہلاکو اور چنگیز کے خاندان سے تعلق
رکھتا تھا منگول بادشاہوں کی کشمیر فتح کرنے کی خواہش پوری کرنے کے لئے پکھلی (بارہ مولہ) کے
راستے سے ستر ہزار منگول اور ترک فوج کی معیت میں کشمیر پر دھاوا بول دیتا ہے سرحد محفوظ نہ
ہونے کی وجہ سے اُسے کسی مزاحمت کا سامنا نہ ہوا۔ وہ آگے بڑھتا گیا۔ راجہ سہہ دیو اُسے زرِ کثیر
دے کر واپس کرانے میں ناکام ہوا۔ غلط طریقہ پر سفاک دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے اُس نے لوگوں
پر مختلف قسم کے ٹیکس عاید کئے یہاں تک کہ برہمن بھی اُس کے ظلم و ستم کا شکار ہوئے منگول فوج
مار دھاڑ، قتل و غارت کا بازار گرم کرتی گئی۔ ہر طرف کہرام مچ گیا۔ تباہی اس حد تک بڑھی کہ راجہ
سہہ دیو سر چھپانے کے لئے کشتواڑ بھاگ نکلا۔ بدنظمی اور بداخلاقی کا اس سے زیادہ اور کیا
ثبوت ہو سکتا ہے کہ ایک راجہ اپنی جان بچانے کے لئے گدی چھوڑ کے چلا جائے اور اپنی رعایا
کو اللہ کے رحم و کرم پہ چھوڑ دے۔ ذولچو کی سفاکی اور بربریت آٹھ ماہ تک جاری رہی۔ اور آخر
کار فطرت کرم پہ آئی اور ساری منگول فوج برنتل (پرگنہ دیوسر) سے واپس جاتے ہوئے برفانی

طوفان کی زد میں آئی اور ذولچو سمیت فنا ہوئی۔ حضرت شیخ العالم شیخ نور الدین ولیؒ کے آباء و اجداد میں سے ادگر دیو کا پوتا اسی طوفان بد تمیزی میں شہید ہوا۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ ذولچو، مسلمان تھا۔ گیارہویں صدی کے اوائل ہی سے ہندو عہد روبہ زوال ہوتا ہے۔ راجا اپنی رعایا کو بھول جاتے ہیں۔ نفس پرستی اور ہوس رانی کے حاوی ماحول میں محمود غزنوی کشمیر پر دوبار حملہ آور ہونے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اُسے لوہر کوٹ کے مقام پر دو بار شکست بھی ملی لیکن اس میں فطرت کی سفاک نیرنگیوں کا بھی ہاتھ تھا۔ منگول تباہی کے بعد بے بس کشمیری پہاڑوں کی چوٹیوں سے اپنی بستیوں کی طرف لوٹے۔ ہر طرف بد نظمی کا دور دورہ تھا۔ یہی وہ اندرونی خلفشار تھا جس کے نتیجہ میں تبت کے راجہ کا بیٹا شہزادہ رینچن بڑی ہوشیاری سے رام چندر کو اپنے لداخی حواریوں کی مدد سے قتل کر کے کشمیر کی گدی پر براجمان ہوتا ہے۔ رینچن کا باپ بلتیوں اور لداخیوں (تبتیوں) کے تصادم میں مارا گیا تھا اور وہ کشمیر بھاگ کر پرگنہ لار میں پناہ گزین ہوا تھا۔ رامچندر نے نظم و نسق کا قیام اُسی کے سپرد کیا۔ اپنی صلاحیتوں کی بناء پر وہ بہت حد تک اپنی ساکھ قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔ جس کا بہترین فائدہ اُس نے بہیمانہ منگول حملہ کے بعد اُٹھایا۔

راجہ سہدیو، ذولچو کے نیست و نابود ہونے کے بعد کشتواڑ سے پھر گدی حاصل کرنے کے لئے آیا لیکن اُسے ناکام ہو کر واپس لوٹنا پڑا۔ رینچن حالات سے بے خبر نہیں تھا۔ جن پر اُس نے بڑی ہوشیاری سے قابو پا لیا۔ اب اُسے سکونِ قلب کی اشد ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ بدھ مت میں اُس کے لئے کشش نہیں تھی، کیونکہ وہ بودھ مذہب کا پیرو رہ چکا تھا۔ ہندو مت ذات پات اور برہمنوں کے سخت گیر رویہ کی وجہ سے اُسے قابل قبول نہیں تھا۔ حضرت سید شرف الدینؒ المعروف بلبل شاہؒ کی روح پرور شخصیت اُس کے درد کا مداوا ثابت ہوئی۔ وہ آن کے زورِ بیان سے اتنے متاثر ہوئے کہ حلقۂ اسلام میں آئے اور صدر الدین نام پایا۔ سید شرف الدین بلبل شاہؒ نعمت اللہ فارسی کے خلیفہ تھے اور سلسلۂ سہروردیہ کے صوفی تھے۔ وہ ایک ہزار پیروکاروں کی رہنمائی کرتے ہوئے سہدیو

Kashmir under Sultans: Mohibbul Hassan P. 34, 35, 36.

کے عہد میں چنگیزی چیرہ دستیوں کے دوران واردِ کشمیر ہوئے۔ سب سے پہلے جو لوگ قبولیت اسلام کا شرف حاصل کر چکے وہ بودھ اور ادنیٰ ذاتوں سے تعلق رکھنے والے ہندو تھے۔ رینچن نے حضرت بلبل شاہ کے نام سے دعناواری میں ایک خانقاہ تعمیر کروائی اور اُسی کے نام سے سرکاری اخراجات سے ایک لنگر بھی جاری کیا۔ اس خانقاہ کو کشمیر میں اوّلین مسجد کی حیثیت حاصل ہے مگر چغتائیہ عہد تک چلتا رہا۔ اِسی بناء پر اس محلہ کا نام بلبل لنگر پڑ گیا۔ اگرچہ رینچن کو زیادہ دیر تک حکومت کرنے کا موقعہ نہ ملا لیکن پھر بھی وہ بڑی چابکدستی سے نظم و نسق قائم کرنے اور ملک کو انتشار و اضطراب سے بچانے میں کامیاب ہوا۔ رینچن نے حیدر نام کا نابالغ بیٹا پیچھے چھوڑا تھا۔ اُس کی بیوہ کوٹہ رانی نے شاہ میر کے مشورے سے سہدیو کے بھائی اُدیان دیو کو سوات سے بلا کر گدی پر بٹھایا اور اُس سے شادی رچائی۔ جوں ہی اُدیان دیو تخت پر بیٹھا، تو ترک حملہ آور پھر نمودار ہوئے۔ اُدیان دیو اپنے بھائی کی طرح لداخ کی طرف بھاگ نکلا۔ کوٹہ رانی نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور انہیں پسپا کر کے اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے لگی۔ ۱۳۳۸ء؁ اُدیان دیو کی وفات پر اُس نے اپنے دو بیٹوں کو نظر انداز کر کے خود تخت سنبھالا۔ وہ حکومت کی باگ ڈور ہاتھ میں لے ہی رہی تھی کہ شاہ میر اُس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔

اور اُس کے بعد شاہ میری خاندان

شاہ میری خاندان کے دو سو سالہ عہدِ حکومت کی شروعات ہوتی ہیں۔ شاہ میر کی شخصیت تاریخی دھندلکوں میں کھوئی ہوئی ہے کئی مورخوں کا کہنا ہے کہ وہ پانڈوؤں کی اولاد میں سے تھا۔ جونراج اِس کے بارے میں خاموش ہے۔ بہارستانِ شاہی کا مصنف اور مورخ حسن اُس کا رشتہ سوات کے حکمرانوں سے جوڑتے ہیں۔ اُس کے حسنِ تدبر اور کارناموں کے جائزے سے شاہ میر کے ترکی ہونے پر یقین کرنا ہی پڑتا ہے۔ وہ وقور شاہ کا پوتا تھا اور اُن کے والد کا نام طاہر تھا۔ وقور شاہ بڑا مذہبی اور پارسا آدمی تھا۔ جونراج نے غلطی سے اُن کا نام قور شاہ درج

لہ۔ طبقاتِ اکبری۔ نظام الدین۔ تاریخِ فرشتہ۔

کیا ہے شاہ میر اپنے قبیلے کے ساتھ ۱۳۱۳ء میں قسمت آزمائی کے لئے سہدیو کے دورِ حکومت میں واردِ کشمیر ہوا۔ سہدیو نے اُسے ملازمت کے علاوہ بارہ مولہ میں کسی جگہ جاگیر بھی عطا کی۔ اُدیان دیو کے عہدِ حکومت میں اُس نے کشمیر کو ترکوں کے ایک اور تباہ کن حملے سے بچا لیا ۱۳۲۵ء میں جیسا کہ پہلے ہی ذکر کیا جا چکا ہے کہ اُدیان دیو کی موت پر کوٹا رانی تخت نشین ہوئیں اور اُس نے بھٹا بھکشنا کو اپنا وزیر اعظم بنایا تا کہ شاہ میر کی بڑھتی ہوئی سیاسی قوت کی مدافعت کا ساماں کیا جا سکے۔ شاہ میر کی سرینگر میں مقبولیت کے پیش نظر اُس نے اندرکوٹ (سنبل) کو دار الخلافہ بنایا۔ شاہ میر بھکشنا کا قلع قمع کرنے میں کامیاب ہونے کے بعد کوٹا رانی کی طرف متوجہ ہوا، اور اُس سے اپنی زوجیت میں لینے کی پیش کش کی جو کوٹا رانی نے رد کر دی۔ شاہ میر نے سرینگر سے اندرکوٹ پر فوج کشی کی۔ کوٹا رانی ناکام ہوئی اور اُسے شاہ میر کے تجاویز کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ شاہ میر نے کہنے کو تو اُس سے شادی کی لیکن اُس کے شکوک نہ مٹ سکے۔ کیونکہ اُس نے بادلِ ناخواستہ اُس کے کہنے پر عمل کیا تھا۔ اس لئے اُس نے کوٹا رانی کو دونوں بیٹوں سمیت قید کر لیا جہاں وہ ۱۳۳۹ء میں چل بسی۔ اُس کے دو بیٹوں کے ساتھ کیا بیتی، مورخین اس بارے میں خاموش ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کوٹا رانی نے شاہ میر کی قربت میں رہنے سے پہلے ہی اپنے پیٹ میں چھُرا گھونپ کر خود کشی کی۔[۱] لیکن جونراج اس کی تصدیق نہیں کرتا۔ شاہ میر سلطان شمس الدین کے نام سے ۱۳۳۹ء میں تخت نشین ہوا۔ وہ بھی (رینچن) سلطان صدر الدین کی طرح دو سو سالہ طوائف الملوکی کے تباہ کُن اثرات ہٹانے کی جانب متوجہ ہوا، گو کہ اُس کا عہد تین ہی سال تک پھیلا ہے۔[۲] پھر بھی اُس نے اپنے حُسنِ تدبر سے لوگوں کے دل جیت لئے جو اُسے اپنا نجات دہندہ تصور کرتے تھے۔ اُس نے وہ تمام ٹیکس معاف کئے جو اُس کی پیشرو حکومتوں نے لگائے تھے۔ اور وہ جابرانہ نوعیت کے قوانین منسوخ کئے جن سے عام لوگوں کے حقوق سلب ہوتے تھے۔ اُس نے پیداوار کا چھٹا حصہ لگان کے طور زمینداروں سے وصول کیا۔

۱۔ تاریخ حسن ۲۔ مورخ حسن کے مطابق اُس نے تین سال پانچ ماہ کشمیر پر حکومت کی۔

اور انہیں بددیانت اہلکاروں سے نجات دلائی۔[1] سلطان شمس الدین نے ماگرے اور چک دونوں خاندانوں کو اعلیٰ رتبہ عطا کیا۔ چک خاندان سہدیو کے دورِ حکومت میں لنکر چک کی رہنمائی میں دردِستان کے راستے سے کشمیر داخل ہوا تھا۔ سلطان شمس الدین نے لنکر چک کو اپنے فوج کا سپہ سالار مقرر کیا۔ ماگرے خاندان کے کئی اشخاص بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ اِسی بادشاہ کے دور میں نیا کشمیری سنہ رائج ہوا۔[2] نئے کشمیری سمت کی ابتدا ۲۰ھ سے روا رکھی گئی جب رینچن تخت پر بیٹھا اور سید شرف الدین بلبل کے نورِ بصیرت سے حلقۂ اسلام میں آیا۔ یہ سنہ عہدِ چغتائیہ تک رائج رہا۔ دیہات میں اب بھی یہ سنہ بطور جاری ہے۔ شاہ مرزا سلطان شمس الدین نے اپنے آخری ایام میں حکومت کی باگ ڈور اپنے دو شہزادوں جمشید اور علی شیر کے ہاتھ منتقل کر دی۔ جونراج کے کہنے کے مطابق وہ ۱۳۴۲ء میں اِس جہانِ فانی سے چل بسا۔ سنبل کے قریب اندرکوٹ میں ابدی نیند سو رہا ہے۔ قطعہ تاریخِ وفات یوں باندھی گئی ہے ع : آمدہ شمس یاؤ زیرِ سحاب۔

سلطان جمشید (۱۳۴۲-۴۳): سلطان شمس الدین کی وفات پر اُس کا بڑا بیٹا جمشید مسندِ شاہی پر براجمان ہوا۔ اُدیان دیو کے عہدِ حکومت میں وہ اور اُس کا بھائی کمراز اور مراز کے گورنر رہ چکے تھے۔ اپنے والد سلطان شمس الدین کے وقت بھی وہ اُمورِ سلطنت سے وابستہ رہ چکا تھا۔ گو کہ اپنی شرافتِ نفس کی وجہ سے وہ زیادہ دیر حکومت نہ کر سکا، پھر بھی اُس نے رعایا کی فلاح و بہبود کی طرف فوری توجہ دی۔ اُس نے پرگنہ آڈونی میں جام نگر نام کا قصبہ بسایا۔ دریائے جہلم پر سوپور میں ایک پُل تعمیر کرنے کے علاوہ عام لوگوں کی آسائش کے لئے مسافر خانے بھی تعمیر کرائے۔[3] سلطان جمشید اپنے بھائی علی شیر سے شفقت و مروت روا رکھی لیکن ہوس رانیوں نے اُسے اپنے بھائی کے خلاف بھڑکایا۔ سلطان جمشید نے اپنے بیٹے کی رہنمائی میں اُسے پسپا کرنے کے لئے دیوہ سر کی طرف فوج روانہ کی۔[4] علی شیر نے اُسے شکست

---

[1] راج ترنگنی، جونراج انگریزی ترجمہ۔ جے سی دت (شاہانِ کشمیر)۔

[3] راج ترنگنی۔ جونراج۔ ۲۶ ۔ کشمیر سلاطین کے عہد میں۔ ڈاکٹر محب الحسن مورخ نے میاں زینہ پورہ کا نام درج کیا ہے۔

دی۔ دریں اثناء سلطان جمشید نے اپنے وزیر رکشمن بھٹ کے مشورے سے اپنے بھائی کے مرکزِ اقتدار اونتی پور کو فتح کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے اس کا محاصرہ کر لیا۔ شیر علی کی فوج کو کافی مالی و جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ شیر علی پسپا ہوا اور اس نے سلطان جمشید کے ساتھ معاہدۂ امن پر دستخط کیے۔ سلطان جمشید کو کامراج میں پا کر شیر علی نے معاہدۂ امن توڑا اور سراج الدین کو (جس کی تحویل میں اس وقت سرینگر شہر تھا) رشوت دے کر سرینگر شہر پر قبضہ کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ سلطان جمشید نے جب اپنے آپ کو بے بس پایا۔ اس نے میدانِ بادشاہت چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کی، جس کے بعد وہ ایک سال دس ماہ زندہ رہ کر ملکِ عدم کو ہو لیا۔ مورخ حسن کا کہنا ہے۔ کہ وہ اقتدار سے محرومی کے بعد ہی اسی سال وفات پا گیا۔

سلطان علاؤالدین
۱۳۴۳ - ۵۴ء

سلطان جمشید کا چھوٹا بھائی علی شیر سلطان علاؤالدین کے نام سے ۱۳۴۳ء میں گدی پر بیٹھا۔ اپنے گیارہ سالہ دورِ حکومت اس نے وہ تمام تر اصلاحات زیادہ مستعدی سے لاگو کیں جو اس کے پیشرو لاگو کر چکے تھے۔ اس نے ذولچو کے حملہ سے بے گھر ہوئے لوگوں کو واپس بلا کر پھر سے آباد کیا۔ سلطان علاؤالدین کے سالِ جلوس کے ساتھ ہی بے وقت بارشوں کی وجہ سے شدید قحط پڑا۔ لیکن اس نے رعایا کی مصائب میں کمی کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس نے اپنے نام سے سرینگر کے قریب علاؤالدین پورہ[1] نام کا قصبہ آباد کیا۔ اندرکوٹ میں کئی شاندار محل بنا کر اسے اپنی راجدھانی بنائی۔[2] ایک حکم کے ذریعہ بدکردار عورتوں کو بدکردار ہونے کی صورت میں جائداد کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ سلطان علاؤالدین ۱۳۵۴ء میں رحلت فرما گئے۔[3] اپنے ہی آباد کئے ہوئے قصبے میں آسودہ ہیں۔[4]

سلطان شہاب الدین (۱۳۵۴ء - ۷۳ء)

شیر اشامک - (شا شیر خوار) -

ملقب بہ سلطان شہاب الدین اپنے والد سلطان علاؤالدین کی وفات کے بعد ۱۳۵۴ء میں تخت نشینی کے بعد اپنے ملک کی حالت

۱۔ م۔۵: راج ترنگنی۔ جونراج ص ۳۔ ص ۲۶ واقعات کشمیر۔ محمد اعظم دیدہ مری۔ ۲۔ بہارستانِ شاہی علاؤالدین پورہ وہی قصبہ ہے جسے آج کل ملک آنگن کہتے ہیں۔

سندھار نے کی طرف متوجہ ہوا۔ انہیں ذولچو کے حملہ کے نتیجہ میں باقی ماندہ سرکش و باغی سرداروں کی سرکوبی کی اور انہیں اپنا مطیع بنایا۔ اس طرح وہ ملک میں جاری بدنظمی کو بہت حد تک دور کرنے میں کامیاب ہوا۔ اندرونی حالت سدھارنے کے بعد سلطان شہاب الدین کشمیر کی سرحدوں کو دور دور تک پھیلانے کی طرف لگ گیا۔ اور گلگت، دردستان، بلتستان، لداخ، کشتواڑ، جموں، دوسری جنوبی پہاڑی ریاستوں شمالی اور مغربی پنجاب اور پشاور کو کشمیری سلطنت کے زیر نگین کر دیا۔ محاربۂ دہلی کے بعد فیروز شاہ اور سلطان شہاب کے درمیان صلح نامہ طے ہوا جس میں حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی کا بڑا ہاتھ ہے مورخ حسن کا کہنا ہے کہ انہی کے ایماء پر فیروز شاہ والئی دہلی کی تین لڑکیاں علی الترتیب حسن خان فرزند سلطان شہاب الدین، برادر شاہ قطب الدین اور سید حسن بن تاج الدین کی زوجیت میں آئیں محب الحسن نوادر الاخبار کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ فیروز شاہ کی دو بیٹیاں سلطان شہاب الدین اور ان کے بھائی قطب الدین اور شہاب الدین کی بیٹی فیروز شاہ کے رشتۂ ازدواج سے منسلک ہوئی۔

مورخ حسن صاحب وقائع کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ سلطان شہاب الدین کے دورِ حکومت میں امیر کبیر میر سید علی ہمدانی نے ۷۷۴ھ میں پہلی بار کشمیر کو اپنے ورودِ مسعود کی سعادت بخشتے ہیں وہ یوں رقمطراز ہیں۔

"صاحب وقائع کشمیری نگارد کہ در ایام محاربۂ سلطان شہاب الدین با فیروز شاہ، جناب حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی قدس سرہٗ بقدوم میمنت لزوم خود خطۂ کشمیر را رونق بخشیدند و سلطان قطب الدین کہ نائب سلطنت بود خدمت ایشاں کما ینبغی بجا آورد و آنجناب بعد چہار ماہ مراجعت فرمودہ" بمقام فیروز پور با سلطان شہاب الدین ملاقات کردند" سلطان شہاب الدین اور لل دید کی اتفاقیہ ملاقات کے دوران سلطان کے لل دید کے ہاتھوں "جام شیر" پینے کا ذکر بھی مختلف رنگوں میں پیش کیا گیا ہے گو کہ اس بارے میں قدیم ترین معاصر شہادت بالکل ناپید ہے

سلطان شہاب الدین ایک اعلیٰ پایہ فاتح ہونے کے ساتھ ساتھ باصلاحیت ناظم اور نہایت عادل بادشاہ تھا۔ جس نے عزم و استقلال سے امورِ سلطنت انجام دئے۔ وہ

علم وادب کا دلدادہ تھا۔ اُس نے قرآن و حدیث کی تعلیم کو رائج کیا۔ اپنے عہد کے آخری ایام میں کہا جاتا ہے کہ وہ بُت شکنی کی طرف مائل ہوا لیکن قدیم اور قریب تر معاصر شہادت سے اس بات کی پُرزور تردید ہوتی ہے جو نراج لکھتا ہے" اپنے وزیر اُدیا شری کے مشورے پر گوتم بدھ کے مجسمے کو پگھلا کر سکوں میں تبدیل کرکے مہمات کے نتیجہ میں خزانۂ عامرہ پر پڑے بوجھ کو ہلکا کیا جائے سلطان شہاب الدین یوں برافروختہ ہوا "پچھلی نسلیں شہرت و عظمت کے لئے دلربا پیکر تراش چکی ہیں اور تم مجھے وہ توڑنے کا مشورہ دیتے ہو۔ کچھ تو دیوتاؤں کے صنم تراش کر نام پا چکے، کئی اُن کی عبادت کر کے جاہ و حشم کے مالک بنے، کئی اُن کی نگہداشت سے قائم رہے اور کئی انہیں منہدم کر کے۔ ایسے عمل کا ارتکاب کتنے بڑے جرم کے مترادف ہے[1]"۔ سلطان شہاب الدین نے بھی اپنے نام شہاب الدین پورہ کے نام سے ایک قصبہ آباد کیا۔ اُس نے مسجدیں تعمیر کرائیں۔ اور باغات لگوائے۔ ۱۳۶۰ء میں کشمیر میں ایک تباہ کن سیلاب آیا جس کے بعد اُس نے کوہِ ماران کے دامن میں اپنی چہیتی رانی لکشمی کے نام سے لکھمی نگر آباد کیا[2]۔

سلطان شہاب الدین کی زندگی کے آخری ایام کچھ اچھے نہ کٹے۔ ہوس رانیاں انسان کو لے ڈوبتی ہیں۔ سلطان شہاب الدین بھی اپنی جملہ خوبیوں کے باوصف اس کا شکار ہوا۔ وہ اپنی بیوی لکشمی کی بیٹی راسا کا اتنا ہو لیا کہ وہ اُس کے ایما پر اپنے دونوں شہزادوں حسن خان اور علی خان کو جلاوطن کرنے پر مجبور ہوا تاہم مرنے سے پہلے ۱۳۷۳ء اُس نے انہیں شفقت نامہ بھیج کر بلا لیا۔ دہلی سے صرف شہزادہ حسن خان آیا لیکن اُسے بھی اپنے باپ کے آخری دیدار سے محروم ہی رہنا پڑا۔

سلطان قطب الدین (۱۳۷۳-۸۹ء)۔ اپنے بڑے بھائی سلطان شہاب الدین کی وفات پر اُس کا چھوٹا بھائی ہندال سلطان قطب الدین کے نام سے گدی پر بیٹھا۔ وہ نہ صرف ایک بلند پایہ منتظم تھا بلکہ ایک مہذب و شائستہ انسان ہونے کے علاوہ شاعری اور علم و ادب کا بے حد دلدادہ تھا۔ اُدیا شری کی بغاوت کچلنے کے بعد اس نے اپنے نام پر قصبہ قطب الدین پورہ بسایا[3]۔

---

[1] نجیبہ الحسن کشمیر و سلاطین کے عہد میں ص ۵۷ یہ سرینگر کا ایک حصہ ہے اور دو محلوں پر مشتمل ہے جن کے نام محلہ لنگر ہٹہ اور پیر حاجی محمد ہیں۔
[2] اس کا تاریخی نام شادرکا پورہ بھی ہے۔

آفاتِ سماوی انسان کا مقدر رہی ہیں، سلطان قطب الدین کے عہد میں بھی یہاں شدید قحط پڑا لیکن بادشاہ نے لوگوں کی مشکلات کم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور لوگوں میں غلہ اور روپیہ تقسیم کیا۔ اُدیا شری کی سرکشی کے نتیجے میں قطب الدین نے اپنے بھتیجے شہزادہ حسن کو جموں سے بُلایا تاکہ وہ گدی کا وارث بنے۔ جوں ہی شہزادہ حسن قطب الدین کے دربار میں پہنچا تو درباریوں کی سازشوں سے اُن کے درمیان غلط فہمیاں بڑھنی گئیں۔ کئی درباری یہ چاہتے تھے کہ شہزادہ حسن کو قید کیا جائے۔ اُدیا شری کے حواری سلطان قطب الدین کو قتل کرکے شہزادہ حسن کو تخت پر بٹھانا چاہتے تھے۔ سلطان کو سازش کا پتہ چلا۔ شہزادہ حسن اُدیا شری کے مشورے پر لوہر کوٹ بھاگ نکلا اور وہاں باغیوں کی پشت پناہی کی طرف لگ گیا۔ اُدیا شری کو قید کرنے کے بعد سرارائی کی شاہی پر سابقہ خدمات کے پیش نظر رہا کیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود وہ شہزادہ حسن سے ملنے کے لئے بیتاب تھا اس لئے دوبارہ پکڑنے کے بعد اُس کا سر قلم کر لیا گیا۔ شہزادہ حسن نے بھی ہتھیار ڈالے اور اُسے بھی قید کر لیا گیا۔[۱]

سلطان قطب الدین کے عہد کا اہم ترین واقعہ حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی کا ورود مسعود ہے وہ پہلی دفعہ سلطان شہاب الدین کے دورِ حکومت میں ۱۳۷۲ء میں کشمیر تشریف لائے، چار ماہ کے مختصر قیام کے بعد حج کا فریضہ انجام دینے کے لئے مکہ معظمہ چلے گئے۔ اب کی بار وہ ۱۳۷۹ء میں قدم رنجہ کشمیر ہوئے اور ڈھائی سال یہاں رہنے کے بعد لداخ سے ہوتے ہوئے اشاعت اسلام کے لئے ترکستان چلے گئے۔ ۱۳۸۳ء میں تیمور نے عراق کو فتح کیا اور وہاں سے علوی سادات کے اخراج کی طرف لگا۔ نتیجتاً حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی تیسری بار بھی قطب الدین ہی کے عہد میں کشمیر کو عرفان و آگہی کی ضیا باریوں سے فیضیاب کرنے آئے۔ اسلامی تاریخ ہجرت ہی سے شروع ہوتی ہے اس لئے اُن کا ورود مسعود ہمارے لئے فیوض و برکات کا باعث ہوا۔ سلطان نے اسلامی قانون کے خلاف دو بہنوں کو بیک وقت اپنی زوجیت میں رکھا تھا حضرت امیر کبیر کی ہدایات کے پیش نظر اُس نے سولہ کی بڑی بہن کو طلاق دی۔ حضرت امیر کبیر نے سلطان قطب الدین کو اپنی کلاہِ مبارک عطا فرمائی جسے وہ اپنے تاج شاہی کے نیچے پہنا کرتے تھے اُس کے بعد آنے والے سبھی بادشاہوں نے یہی طریقہ جاری رکھا یہاں تک کہ فتح شاہ کی وصیت کے مطابق کلاہ مبارک کو بھی

۱۔ راج ترنگنی۔ جونراج۔ صفحہ ۷، ۹، ۵۳ ترجمہ انگریزی جے۔ سی۔ دت۔

اُن کی میت کے ساتھ دفنایا گیا[1]۔ سلطان قطب الدین کے اصرار پر حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ نے مولانا محمد بلخی المعروف میر حاجی محمد کو سلطان کی اسلامی معاملات میں راہ نمائی کے لئے آخری بار یہاں سے رخصت ہوتے وقت چھوڑا۔ وہ پکھلی کے راستے سے جا رہے تھے کہ کنڑ کے قریب شدید بیمار ہوئے اور ۱۹ جنوری ۱۳۸۵ء میں انتقال فرما گئے۔ مادۂ تاریخ "بسم اللہ الرحمن الرحیم" اُن کی زبانِ مبارک پر تھا جب اُن کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ ختلان میں آسودہ ہیں۔ کشمیری امراء میں سے اُن کے جسد خاکی کو وہاں پہنچانے کے لئے لدی رینہ بھی ہم قدم تھے[2]۔ سلطان قطب الدین ۱۳۸۹ء میں وفات پا گئے۔ محلہ لنگر ہٹہ مقبرۂ شگین میں امیر حاجی محمدؒ کے روضہ کے ساتھ ہی مدفون ہیں۔

سلطان سکندر (۱۳۸۹-۱۴۱۳ء) محب الحسن جونراج کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ سلطان قطب الدین کو بڑھاپے میں اولاد عطا ہوئی۔ پہلے سکندر پیدا ہوا پھر اُن کا دوسرا بیٹا ہیبت۔ ۱۳۸۹ء میں سلطان قطب الدین کی وفات پر اُس کا بڑا بیٹا شہزادہ سکندر تخت پر بیٹھا۔ چونکہ وہ ابھی نابالغ تھا اِس لئے اُس کی ماں شورا عبوری طور نظام مملکت چلاتی رہی[3]۔ سورا ایک باصلاحیت خاتون تھی جس نے بڑی مضبوطی سے حکومت چلائی۔ اس نے اپنی بیٹی اور اپنے داماد کو جو سکندر کے خلاف سازش کر رہے تھے مار ڈالا۔ وزیر اتنار رائے ماگرے (جو بڑا مضبوط ہو چلا تھا) نے سکندر کے چھوٹے بھائی شہزادہ ہیبت خان کو زہر دے کر مارا۔ وزیر سہا کا کو بھی اُس کے ہاتھوں زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ سکندر نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی رائے ماگرے کا قلع قمع کرنے کی ٹھانی۔

پا تخت آ ستہ قبضہ کیا جہاں بعد میں اُس نے خودکشی کی ۱۳۹۸ء میں حسنِ اتفاق سے تیموری حملے سے بچا۔ سکندر نے نئی فتوحات کی طرف توجہ دی۔ اُس نے اپنے باپ کی چھوڑی سلطنت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی اوہند کے حکمران کو اُس نے مطیع کر کے اُس کی بیٹی میرا اپنے عقدِ نکاح میں لائی۔ سہہ بٹ کی رہنمائی میں اُس نے جموں کے راجا بالدیو کو ہرانے کے لئے اپنی فوج بھیج دی۔ اُس نے ہتھیار ڈال دئے اور اپنی بیٹی تحفتاً سکندر کے حضور بھیج دی۔ لیکن اُس کے بعد اُس نے پھر خود مختاری کا اعلان کیا۔ اِس لئے سکندر نے دوبارہ سہہ بٹ اور

---

[1] کہا جاتا ہے کہ جب ایک درویش نے کلاہِ مبارک کے دفنائے جانے کی خبر سنی تو اُس نے پیشن گوئی کرتے ہوئے کہا کہ اِس خاندان کا خاتمہ قریب ہے [2] محب الحسن صفحہ ۵۷۔ [3] تاریخِ فرشتہ و تاریخ کشمیر (مورخ اسلام)

جسرت کھوکر کو جموں پر دھاوا بولنے کے لئے بھیجا۔ راجا پالدیو نے شکست کھائی اور جموں سکندر کے ہاتھ آیا۔[1]

سلطان سکندر کی نجی زندگی کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ اتنا کہا گیا ہے کہ وہ شراب اور دوسری نشہ آور چیزوں کا عادی نہیں تھا۔ اُسے موسیقی کا بھی شوق نہیں تھا۔ سکندر نے پہلے اوہند کے راجا فیروز کی بیٹی کو عقدِ نکاح میں لایا۔ اُس کے بطن سے تین بیٹے میر خان، شادی خان اور بہرام خان پیدا ہوئے۔ ازاں بعد اُس نے شوبھا دیوی سے شادی کی، اُس کے بطن سے دو لڑکے محمد اور فیروز جنم پائے۔ اُس کے بطن سے سکندر کی دو لڑکیاں بھی تھیں جو والیِ اوہند اور سندھ کی زوجیت میں آئیں۔ سکندر کو شوبھا دیوی سے اُتنی محبت نہیں تھی جتنا عشق اُسے میرا سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فیروز کو سکندر نے کشمیر سے نکال دیا تاکہ بادشاہت کی وراثت پر کوئی جھگڑا سر نہ اٹھانے پائے۔ اُس نے اپنے بڑے بیٹے میر خان کو علی شاہ کا لقب دے کر تخت کا جائز وارث قرار دیا۔ وہ اِس جہانِ فانی سے ۱۴۱۳ء چل بسا۔

سکندر نہایت ہی عادل اور رحم دل بادشاہ تھا جس نے رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے اقدام کئے۔ اُس نے باج، و دیگر ٹیکس منسوخ کئے، سکول کھولے اور ہسپتال تعمیر کرائے۔ سکندر کے عہد میں ایران اور وسط ایشیا سے علماء اور فضلا آئے جنہوں نے یہاں اسلام کی ترویج و اشاعت کے کام کو آگے بڑھایا۔ علماء اور فضلاء میں سید حسن شیرازی، سید محمد اصفہانی، سید محمد خوارزم، سید جلال الدین بخاریؒ، بابا حاجی ادھمؒ اور اُس کا خلیفہ بابا حسن قابلِ ذکر ہیں۔

حضرت امیرِ کبیر میر سید علی ہمدانیؒ کے فرزندِ ارجمند سید میر محمد ہمدانیؒ بھی اُنہی کے عہد میں ۷۹۳ھ میں کشمیر آئے۔ اور یہاں بائیس سال قیام کر کے واپس لوٹے۔[2] انہوں نے ۱۵ رجب ۸۱۴ھ میں حضرت شیخ نور الدین ولی کو خطِ ارشاد عطا فرمایا جو خانقاہِ معلیٰ میں محفوظ ہے۔

سلطان سکندر نے اپنے نام سے سکندر پورہ نام کا قصبہ آباد کیا جس سے اب نوہٹہ کہتے ہیں۔ جامع مسجد کی عالیشان تعمیر میں بھی اُسی کا ہاتھ ہے کہتے ہیں کہ اس مسجدِ شریف کا معمار صدر الدین خراسانی تھا۔ اِس کے علاوہ اُس نے بجبہاڑہ، عیدگاہ (سرینگر میں) [illegible] و خانقاہِ معلیٰ بھی اُسی کی یادگار ہے۔

---

[2] محبّ الحسن صفحہ ۶۱ پر بعض مورخین کا خیال ہے کہ وہ یہاں بارہ سال ٹھہرے، اس معاملے پر آگے بحث ہوگی۔

جو حضرت میر محمد ہمدانیؒ کی نگہداشت میں تعمیر ہوئی۔ اِس کے علاوہ وچی، ترال اور سوپور میں خانقاہیں تعمیر کروائیں۔ سکندر نے مٹن کے چشمہ کے قریب ہی ایک مسجد تعمیر کی جہاں وہ موسم بہار میں قدرت کی فیاضیوں سے بہرہ ور ہونے کے لئے جایا کرتا تھا۔

سہہ بٹ جو سلطان سکندر کا وزیر تھا حضرتِ میر محمد ہمدانیؒ کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہوا اور سیف الدین کے نام سے ملقب ہوا، اُس نے شریعتِ اسلامیہ کے نفاذ کے بارے میں بہت ہی سخت گیر رویہ روا رکھا جس کے نتیجہ میں سلطان سکندر کے بت شکن ہونے میں مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ کئی مقامات پر جہاں اب مساجد اور خانقاہیں، وہاں پہلے منادر تھے۔ لیکن منادر کے منہدم کرنے کے لئے صرف سلطان سکندر کو بدنام کرنا ٹھیک نہیں۔ راجا ہرش دیو نے اس سلسلے میں کون سی کمی کی۔ یہ سکندر ہی کا عہد ہے کہ حضرت میر محمد ہمدانیؒ کی رہنمائی میں یہاں شریعت اسلامیہ کے رائج کرنے کی جانب بھرپور توجہ دی گئی اُس نے اِس مقصد کے لئے ادارہ شیخ الاسلام کی بنیاد بھی ڈالی۔ اُس نے شراب نوشی پر پابندی عاید کی اور رقص و سرور کو بھی بند کیا۔ حضرت میر محمد ہمدانیؒ کی ہدایات پر سلطان سکندر نے غیر مسلموں پر دو پل چاندی کا جزیہ لگایا، ستی کی رسم کو بند کیا، غیر مسلموں کو ٹیکا لگانے کی بھی اجازت نہیں تھی[۱]۔ سیف الدین کی کٹر مذہبیت کی وجہ سے بہت سارے برہمن وطن چھوڑ کے چلے گئے۔ بہت سے غیر مسلموں کو جان سے ہاتھ بھی دھونا پڑا۔ ہر اُمت کے لئے حیات و ممات کا وقت معین ہے اس لئے یہاں کے مقامی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ اشاعتِ اسلام سے یہاں ایک نئی تہذیب جنم لیتی رہی۔ فروگذاشتیں تو انسانی تاریخ کا کوئی بھی دور اِن سے خالی نہیں۔ جونراج اور مسلم مؤرخین نے بت شکنی اور منادر کی تباہی کی جو تفاصیل دی ہیں، اگر اُن پر یقین کیا جائے تو یہاں کوئی بھی مندر موجود نہ ہوتا۔ سکندر کے تقریباً ایک سو سال بعد مرزا حیدر دوغلت (جس نے کشمیر پر دس سال حکومت کی) نے ۱۵۴۶ء میں لکھا "کشمیر کے عجائبات میں اوّلین حیثیت یہاں کے منادر کو حاصل ہے۔ کشمیر کے اندر اور باہر ایک سو کے پاس کے قریب صنم خانے موجود ہیں۔ بقیہ دُنیا میں کوئی ایسی مثالی تعمیر کا ملنا

---

[۱] راج ترنگنی۔ جونراج۔ صفحہ ۶۰ انگریزی ترجمہ جے۔ سی۔ دت۔

محال ہے۔ کتنا ہی اچھا ہے کہ یہاں ایک سو پچاس حیرت زا منادر موجود ہیں[۱]۔ ابوالفضل کا کہنا ہے کہ کئی منادر اپنی صحیح حالت میں تھے[۲]۔ جہانگیر بھی اِس انداز سے اظہارِ خیال کرتا ہے کہ "منادر کی فلک بوس عمارتیں جو اشاعتِ اسلام سے قبل تعمیر کی گئی تھیں، اب بھی اپنی اصلی حالت میں موجود ہیں[۳]۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ زلزلوں سے بھی اِن کے زمین بوس ہونے کا امکان ہے۔ یہ معاملہ الگ بحث چاہتا ہے۔ یہاں اِتنا ہی کافی ہے۔

سلطان علی شاہ:

(۱۴۱۳-۲۰ء)۔ سلطان سکندر کا سب سے بڑا شہزادہ میرخان سلطان علی شاہ کے نام سے ملقّب ہو کر گدّی نشین ہوا۔ وہ ایک کامیاب حکمران ثابت نہیں ہوا۔ وہ بزدِل اور تلوّن مزاج تھا۔ اُس کی ذات اپنی کوتاہیوں کی بنا پر پسِ منظر میں رہی۔ اُس کے عہد پر سیف الدین وزیرِ اعلیٰ کی ذات چھائی رہی۔ لدّی ماگرے کو بڑی مکّاری سے اُس کا سر قلم کیا اور اُس کے چھوٹے بھائی محمود ماگرے کو قید کر ڈالا۔ فیروز جس کو سکندر نے جلاوطن کیا تھا، ترک فوج کی مدد سے کشمیر کی بادشاہت قابض ہونا چاہتا تھا[۴]۔ سیف الدین نے لدّا راجا اور گورا بھٹ کو اُسے شکست فاش دینے کے لئے روانہ کیا۔ فیروز کو شکست ہوئی، جس کے عوض سیف الدین نے لدّا راجا کو میر بخشی کے عہدے پر تعینات کیا اور گورا بھٹ کو کامراج کا گورنر مقرّر کیا۔ لدّا راجا اور سیف الدین کے درمیان اَن بن ہوئی۔ لدّا راجا نے بھاگنا چاہا۔ لیکن سیف الدین کے بھائی حمزہ بٹ نے اُسے قید کر لیا۔ دریں اثنا سیف الدین تپ دق کے مہلک روگ سے جاں بحق ہوا۔ حمزہ بٹ نے اپنی سیاسی قوت بڑھانے کے لئے لدّا راجا کو رہا کیا اور اُسی کی مدد سے گورا بھٹ کو قتل کرنے میں کامیاب ہوا۔ ساتھ ہی اُس نے اُسے (حمزہ بٹ کو) بھی موت کی گھاٹ اتارا۔

۱۔ تاریخِ رشیدی۔ صفحہ ۴۲۶ ۲۔ آئینہ اکبری۔ ۳۔ تزکِ جہانگیری ۴۔ دہلی کے اُس وقت کے حکمران کا نام مورخین نے نہیں لکھا ہے۔ شاید یہ خضر خان ہی ہو جس نے خاندان سادات کی بنیاد ڈالی اور جو اُس وقت دہلی پر حکومت کرتا تھا۔ (محبّ الحسن)۔
۵۔ راج ترنگنی۔ جونراج۔ صفحہ ۶۵۔

سلطان علی شاہ کے چھوٹے بھائی شاہی خان کو وہ ختم کرنا چاہتا تھا لیکن سلطان علی شاہ کی رضامندی اور ٹھوکروں کی مدد سے اُس نے حمزہ بٹ کو عیدگاہ میں عید الاضحٰی کے روز قتل کیا۔ علی شاہ نے خوش ہو کر شاہی خان کو وزیر اعظم بنایا جس کا لوگوں نے خیر مقدم کیا۔ سلطان علی شاہ (جو مذہبی قسم کا آدمی ہونے کے ساتھ ساتھ متلون مزاج بھی تھا) نے حج کو جانے کی ٹھانی۔ اور شاہی خان کو زین العابدین کے لقب سے نواز۔ حکومت کا سارا نظام اُسی کے ذمہ کر کے چل نکلا۔ سلطان علی شاہ جموں کے راجا سے (جو اُس کا سسر بھی تھا) رخصت حاصل کرنے گیا۔ جس نے اُسے مکہ معظمہ جانے سے روکا۔ وہ جموں اور راجوری کے راجاؤں کی فوج کی معیت میں دوبارہ تخت حاصل کرنے کے لئے لوٹا۔ زین العابدین نے سیالکوٹ کے کھوکر سردار سے امداد حاصل کی۔ جسرت کھوکر نے سلطان علی شاہ کو نھنہ کے مقام پر شکست دی۔[1] اس کے بعد زین العابدین سرینگر کی طرف بڑھا۔ جہاں لوگوں نے اُس کا خیر مقدم کیا۔ علی شاہ نے دوبارہ حملہ کیا تو زین العابدین نے اُسے اوڈی کے مقام پر شکست فاش دی۔ حیدر ملک کا کہنا ہے کہ علی شاہ کو قید کیا گیا جہاں وہ کئی سال گزرنے کے بعد فوت ہوا۔ لیکن سری ور کا کہنا ہے کہ اُسے جسرت نے پکڑ کر موت کی گھاٹ اتارا۔ اس طرح اس اقتدار کی کشمکش کے بعد سلطان زین العابدین کا عہد شروع ہوتا ہے۔

سلطان زین العابدین:

(۱۴۲۰-۷۰ء)۔ جتنے بھی بادشاہوں نے کشمیر پر حکومت کی ہے، سلطان زین العابدین اُن میں سے اعلیٰ ترین رتبے کا مالک ہے یہ وہی عظیم ترین بادشاہ ہے جس نے کشمیر میں دستکاریوں و دیگر فنون کے پہلو بہ پہلو علم و ادب، موسیقی اور مصوری کو بھی فروغ دیا۔ اُس نے نصف صدی تک کشمیر پر حکومت کی۔ وہ نہایت ہی رحم دل، رعایا پرور اور امن پسند بادشاہ تھا جس کی وجہ سے اسے آج بھی بڈشاہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سلطان زین العابدین نے فتوحات کے ضمن میں بڑے معرکے سر تو نہیں کئے لیکن اپنے

---

[1] تاریخ مبارک شاہی۔ یحییٰ سرہندی۔

دوبارہ سلطان شہاب الدین کے حدودِ سلطنت کو بحال کرنے میں کامیاب ہوا۔ اُسے مُلک گیری کی ہوس نہیں تھی کیونکہ وہ اپنے ملک کو مضبوط و خوشحال دیکھنا چاہتا تھا۔ سلطان سکندر کی وفات کے بعد لداخ اور بلتستان پھر خود مختار ہوئے تھے۔ سلطان زین العابدین نے پرگنہ لار میں بھاری فوج جمع کرکے ملمت رینہ، احمد رینہ اور محمد ماگرے کی ہمراہی میں بلتی حکمران ایملدی چہارم (Lha chen Lde Gums) کو مطیع کیا۔ بڈشاہ نے کلو کو بھی فتح لیا۔ اور اُہند کے راجا کو سندھ کے حکمران کی پشت پناہی کے باوجود شکست فاش دی[1]۔ بڈشاہ کے عدل و انصاف، اُس کے علم و دانش کی سرپرستی کا شہرہ دُور دُور تک پھیلا۔ خراسان، مکہ معظمہ، گوالیار، سندھ، بنگال، تبت، گجرات، مالوہ، پنجاب کے حکمرانوں سے اُس کے دوستانہ تعلقات تھے۔ وہ باہمی تحائف کے تبادلوں میں دانشوروں، عالموں اور شاعروں کو ترجیح دیتا تھا۔ اپنے پیشرو حکمرانوں کی طرح سلطان زین العابدین کو بھی بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پانڈو چک کی بغاوت کو ابتدا ہی کچل دیا گیا۔ بڈشاہ کی زندگی کے آخری بیس سال اپنے تین بیٹوں ادہم، حاجی اور بہرام کی بدنظمیوں کی نذر ہوئے۔ بالآخر بادشاہ کے جسمانی قوا مضمحل ہوتے گئے۔ اُس کا حافظہ بھی جاتا رہا۔ اس طرح کشمیری تہذیب و تمدن کا یہ پاسبان ۱۲ مئی ۱۴۷۰ء کو ۶۹ سال کی عمر پا کر ابدی نیند سو گیا۔ سارے کشمیر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ کشمیر کا یہ مایہ ناز تاجدار مزارِ سلاطین سرینگر میں آسودہ ہے[2]۔

زین العابدین نے انصاف کی عدالت میں اپنوں کو بھی نہیں بخشا۔ وہ لوگوں کی نجی حالات کا جائزہ لینے کے لئے خود ہی گشت لگایا کرتا تھا۔ اُس نے زراعت کی طرف خاص توجہ کی اور مندرجہ ذیل نہریں کھدوائیں:۔

پنچھم نہر کو دریائے سندھ سے پانی آتا تھا۔ یہ نہر نوشہرہ اور جامع مسجد سے ہوتے ہوئے نالہ مار میں جا گرتی تھی۔ اس کے علاوہ چکدر کنال، کرالا کنال جو موجودہ پرگنہ "آڈوِن" کو سیراب کرتی تھی اسی کے کنارے بڈشاہ نے زینہ پورہ کا قصبہ بسایا تھا۔ اونتی پورہ کنال، شاہ کہل (صفا پورہ کنال)، مٹن کنال (شاہ کہل)، مار کنال یا نالہ مار و دیگر آبپاشی کی نہریں قابلِ ذکر ہیں جن سے چاول و

---

[1] راج ترنگنی - جونراج [2] شری ور - زینہ راج ترنگنی - ترجمہ جے - سی - دت +

دیگر اجناس کی پیداوار بڑھی۔ مؤرخ کرافٹ کا کہنا ہے کہ زین العابدین کے وقت میں شالی کی پیداوار ساڑھے سات لاکھ خروار تک جا پہنچی۔ مالیہ جنس کی صورت میں وصول ہوتا تھا۔ بڈشاہ کے عہد میں مذہبی رواداری عروج کو جا پہنچی۔ اُس نے اُن غیر مسلموں کو واپس بُلایا جو کشتواڑ اور جموں بھاگ گئے تھے۔ گاؤکشی بند کر کے اُس نے ہندوؤں کو پھر سے ستی کی رسم ادا کرنے کی اجازت بھی دی جو ہندو مسلمان ہوئے تھے انہیں پھر اپنا مذہب اختیار کرنے کی آزادی ملی۔ اپنے والد سُلطان سکندر کے دور میں گرائے مندروں کی پھر سے اُس نے مرمت کرائی اور نئے سرے تعمیر کرایا۔ وہ ہندوؤں کے تہواروں میں خود شریک ہوتا تھا۔ غیر مسلموں پر سکندر کے دور میں عائد رکھے گئے جزیہ کو بہت حد تک کم کیا گیا۔ چاندی کے دو پل کے بدلے ایک ماشہ مقرر کیا[1]۔ زین العابدین کے دربار میں غیر مسلموں کو بھی عزت و توقیر کا مقام حاصل تھا۔ ایک برہمن شری بھٹ اُس کا معالج تھا، بادشاہ اُس کے ساتھ اہم انتظامی امور پر مشورہ کرتا تھا۔ تلک آچاریہ اُس کا ایک بودھ مشیر تھا۔ دو برہمن رمبھار اور رد بیا بھٹ اُس کے درباری جوتشی تھے۔ کرپورا بھٹ اُس کا ایک اور برہمن معالج تھا شری یا بھٹ شعبۂ عدلیہ کا سربراہ تھا۔ بڈشاہ کا درباری مورخ جونراج اُس کی[2] آزاد مشربی، مذہبی رواداری منصف مزاجی اور بلا لحاظِ مذہب و ملّت عدل گستری کی تصویر یوں کھینچتا ہے۔

Zainul-Abidin ushered in an era of religious toleration. His most benevolent act was that of granting religious liberty to his subjects. He patronized the Brahmins. The Muslims know no auth-

---

۱؎ ایک پل چار تولہ وزن کے برابر ہے گویا کہ ایک غیر مسلم پر بارہ تولہ (چاندی) جزیہ مقرر تھا جو کم کر کے ۹۶ ماشہ بنتا ہے۔ ایک ماشہ برائے نام رکھا گیا۔

۲؎ زینہ راج ترنگنی۔ شری ور۔ ترجمہ۔ پروفیسر سری کنٹھ کول صفحہ ۱۰۵۔

orty to terrorize them. He harmonized antagonistic religions by propogating a moral out look on life. It was a great relief for the Hindus to be governed by a magnanimous Muslim relur who reeeved the burdensome Jizya from three palls of silver to one masha. The chronicler Sayed Ali supports Jonrajas information when he says that jizya collected by Zainul Abidin was a trifle.

سُلطان زین العابدین بڈشاہ نے علم وادب کی سرپرستی بھی کی۔ اُس کا دربار علم و آگہی کا گہوارہ تھا۔ سید محمد رومی، سید احمد رومی، قاضی سید علی شیرازی، سید محمد لورستانی، قاضی جمال، سید محمد سیستانی جیسے علماء اُس کے دربار سے مُنسلک تھے۔ مولانا کبیر زین العابدین کے اُستاد تھے۔ مُلّا احمد درباری شاعر تھا۔ مُلّا نادری اور مُلّا احمد شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخ سے بھی شغف رکھتے تھے۔ اُنہوں نے بھی کشمیر کی تاریخ لکھی۔ جونراج اور شری وَر دونوں کو درباری مؤرخین ہونے کے علاوہ بڈشاہ کے معتمد تھے۔ یود بھٹ نہ صرف سنسکرت زبان کا عالم تھا بلکہ اُسے فارسی زبان پر بھی دسترس حاصل تھی۔ شاہنامۂ فردوسی اُسے زبانی یاد تھا۔ سوم پنڈت نے اُس پر زینہ چرت نام کی کتاب لکھی۔ بھٹ اوتار نے شاہنامے سے متاثر ہو کر زینہ وِلاس میں بادشاہ کے اقوال درج کئے۔ منصور بن محمدؐ ایک بہت بڑا عالم تھا جس نے علم الادویات پر "کیفیات مُجاہدیہ" نام کی کتاب لکھی۔ زین العابدین نے ایک دارالترجمہ کا قیام عمل میں لایا۔ جہاں فارسی کُتب کو سنسکرت

اور سنسکرت کتب کو فارسی میں منتقل کیا جاتا تھا۔ شری ور نے جامی کی یوسف زلیخا کا سنسکرت میں ترجمہ ۱۵۰۵ء میں مکمل کیا۔[۱] ملا احمد نے بڈشاہ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے مہابھارت اور کلہن کی راج ترنگنی کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ بڈشاہ خود بھی شاعر اور عالم تھا اور کشمیری کے علاوہ سنسکرت فارسی اور تبتی جانتا تھا بڈشاہ کے زمانے میں تعلیم کے میدان میں بھی بڑی پیش رفت ہوئی۔ اس نے دور دور سے عالموں کو بلا کر یہاں علم کی مشعل روشن کی۔

دستکاریوں کی طرف بھی خاص توجہ دی گئی اور جو کچھ بھی اس فن کی صورت میں آج ہمارے سامنے ہے یہ اسی کی دین ہے۔ گو کہ اس سے پہلے بھی یہاں دستکاریوں کا رواج تھا لیکن ذوالچو کی تباہ کاریوں سے انہیں زوال آیا تھا۔ بڈشاہ نے نہ صرف روایتی دستکاریوں کو از سر نو فروغ دیا بلکہ اس میں جدت بھی لائی۔ کاغذ سازی، جلد سازی اور ریشم کی صنعت کی بنیادیں اسی نے استوار کیں۔ خوشنویسی اور فنِ خطاطی کو بھی فروغ ملا۔ بڈشاہ کے وقت خطِ نسخ رواج پا چکا تھا۔

ہماری پسند و ناپسند سے الگ تہذیبیں بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔ مبلغین اسلام کی زبان فارسی تھی، یہ امر بھی مسلمہ ہے کہ اشاعتِ اسلام میں سرکاری سرپرستی کو بڑا دخل رہا ہے۔ شاہمیری سلاطین اور سادات کے مبارک ہاتھوں یہاں اسلامی تعلیمات سرعت سے عام ہوئیں۔ حضراتِ سادات نے سلاطین کی وساطت سے شریعتِ اسلامی کا نفاذ عمل میں لایا اور ریشیانِ کشمیر نے یہی ابدی پیغام عام لوگوں کے دلوں میں جاگزین کیا۔ قطب الاقطاب شمس العارفینؒ حضرت شیخ نورالدین ریشیؒ اسی کاروانِ عرفان و آگہی کے پیش رو ہیں۔ فارسی کو چونکہ سرکاری زبان کا درجہ حاصل تھا اس لئے اس کا استعمال روز بروز بڑھتا گیا اور کشمیری زبان کے روزمرہ کے ذخیرہ الفاظ میں بھی بہت حد تک اضافہ ہوا۔ قطع نظر اس کے کہ خطِ نسخ کشمیری زبان کے لسانی مزاج کے موافق تھا یا نہیں، ہم فطرت کے غیر مرئی سخت گیر قوانین کے سہارے زندہ رہتے ہیں وہ یہ کہ ہماری مادری زبان لل دید اور حضرت شیخ نورالدین ریشیؒ کی باطنی وجدانی کیفیات کا آئینہ بن کر رہی اور ہم بھی ایک قومی اکائی

---

[۱] اس کا سنسکرت نام کتھا کوتکا ہے۔ رتن کشمیر۔ ڈاکٹر جی ایم ڈی صوفی۔

کی حیثیت سے سخت جانی کے دن کاٹتے رہے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اشاعتِ اسلام سے قبل یہاں کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کا مختصر سا خاکہ پہلے ہی پیش کیا گیا ہے۔ اسلام کے فروغ سے ایک نئی امتزاجی تہذیب نے جنم لیا۔ امتزاجی اس لئے کہ کسی قوم کے لاشعور کو بدلنے کے لئے صدیاں لگتی ہیں جس کی وجہ سے سبھی سماجی رشتوں اور قدروں کو یک لخت بدلنا قدرے مشکل سا ہو جاتا ہے۔ اس بات کا ثبوت اور باتوں کے علاوہ حضرتِ امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ کا مقامی روایات کے پیشِ نظر خاص انداز سے اورادِ فتحیہ با الجہر پڑھنے کی اجازت ہے اس طرح انہوں نے وسیع النظری سے کام لے کر توحید کے تبلیغ جاریہ کو مضبوط بنیاد بخشی۔ زکواۃ، روزہ، حج، نماز اور صدقۂ فطر کا چلن ہوا۔ ستی کی رسم مٹ گئی۔ ذات پات کے بندھن ٹوٹے۔ پھر بھی سماجی اور ثقافتی سطح پر انسانی برابری اور اقتصادی مساوات کا خواب پورا نہ ہوا، کیونکہ کسی نہ کسی رنگ میں ذاتی مفادات رکاوٹ بنتے رہے۔ یہی ہمارا وہ صدیوں پرانا سماجی اور اجتماعی لاشعور ہے جو حضرتِ شیخ نور الدینؒ کی ذاتِ بابرکات کی صورت میں للہ عارفہ کے بعد ہمارے درد کا مداوا بنی۔ یہی وہ نورانی پیکر ہے جس نے ہمارے دل کے نہاں خانوں کو منور کر کے ہمیں حق و صداقت، زہد و تقویٰ اور اخوت و محبت کا پیغام دیا ہے۔ آیئے ذرا فلک بوس پہاڑی چوٹیوں کو سر کر کے کشتواڑ کی خوش بخت و پرنم سرزمین سے آنکھیں ملا کر دیکھیں کہ اقلیم عرفان کا یہ بادشاہ کب سے رختِ سفر باندھے پشتیں بدل بدل کر یہاں آنے کے لئے بیتاب یا تھا۔ دیر آمدئی براہِ دور آمدئی۔

حضرت شیخ العالم کا خاندان

شمس العارفین حضرتِ شیخ نور الدین ولیؒ کے جدِ بزرگوار کشتواڑ کے راجا تھے رشی ناموں اور نور ناموں سے اُن کے خاندانی حالات کے بارے میں جو کچھ بھی درج ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ اُن کے جدِ امجد اگر اسنز (تیز) ناساز گار سیاسی حالات سے کشمیر چلے آئے۔ اُن کے ایک بھائی نے موضع ڈور کوٹ تحصیل کولگام میں سکونت اختیار کی اور دوسرا بھائی چرار کے نزدیک تلہ سرگام میں خمنی وانو کے یہاں پناہ گزین ہوا۔

خمنی والو اِس علاقہ کا سردار تھا۔ اوگراسنز اپنی قابلیت وصلاحیت کی بنا پر خمنی والو کے معتمدوں میں شامل ہوا۔ خمنی والو جب بھی شکار کھیلنے یا کسی دوسرے کام سے کہیں چلا جاتا تو اپنے سارے اختیارات اوگرا سنز کو سونپ دیتا۔ راجہ مانرے ہجن کوٹ کے علاقہ کا حاکم خمنی والو کا دوست تھا۔ ایک دن وہ شکار کھیلتے کھیلتے اُس کے یہاں پہنچ گیا اور کئی دن وہاں ٹھہرا۔ سکندر راجہ کریوہ بارہ وہ کے ایک بڑے زمیندار کی خمنی والو سے عداوت تھی۔ اُس نے موقعہ پاکر "تلہ سر" پر حملہ کیا اور اوگراسنز (تیز) "راہ کاٹے" کے میدانِ کارزار میں مارا گیا۔ جب خمنی والو کو اِس واقعہ کی خبر ہوئی تو وہ راجہ مانرے کی فوج لے کر "کریوہ بارہ وہ" کی طرف چل پڑا اور سکندر راجہ کے قلعہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ خمنی والو نے اوگرسنز کی وفات کے بعد گرزاسنز (تیز) کو منصب سپہ سالاری بخشا۔ گرزاسنز کے بیٹے کا نام دریتاسنز (تیز) تھا۔ دریتا سنز کا بیٹا زنگا بڑا بہادر تھا اور راجہ سہہ دیو کے زمانے میں ذولچوؔ کی تباہ کاریوں کا شکار ہو کر لڑائی میں مارا گیا۔ انہی حالات کو تاریخی تقابل وتطابق کے ساتھ یوں کہی جاسکتی ہے کہ کشتواڑ میں اگلے وقتوں سے راجپوتوں کے سورج بنسی خاندان کا راج تھا۔ اسی خاندان کا ایک راجہ اوگردیو یا اوگرسنز اپنے چچیرے بھائی بولدر دیو کی بغاوت کے نتیجہ میں کشمیر چلا آیا۔ اس وقت کشمیر پر ہندو راجا حکومت کرتے تھے۔ جے سمہا کے بعد آنے والے راجاؤں میں سے کسی نے اوگردیو کو کھدپورن میں جاگیر عطا کی۔ جہاں وہ رہائش پذیر ہوا۔ اوگرسنز کا پوتا زنگا سنز راجہ کا درباری تھا۔ غالباً یہ راجہ سہدیو ہونا چاہیئے کیونکہ اسی کے عہد میں ذولچوؔ نے کشمیر پر حملہ کیا جس میں زنگا سنز بھی مارا گیا اور سہدیو دُم دبا کر کشتواڑ بھاگ چلا۔ زنگا سنز کا بیٹا ہمبر (ممتز) اپنی جان بچانے کے لئے جگہ جگہ مارا پھرتا رہا۔ جب حالات ذرا سدھرے تو وہ گوڈ ستھو میں آکر بسا۔ ہمبر سنز کا بیٹا گرزاسنز تلہ سر کے کوٹہ راجہ کھمی والو کا سپہ سالار ہوا۔ جو بورد پہاڑی پر ایک لڑائی میں مارا گیا۔ گرزا سنز کا بیٹا بسلرسنزا اپنے والد کے مارے جانے کے بعد برداشتہ خاطر ہو کر سکونِ قلب کی تلاش میں حضرت سیّد حسین سمنانی رح کے حضور پہنچا اور انہیں کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام

لہ۔ کشمیری زبان اور شاعری۔ عبدالاحد آزاد۔ صفحہ ۱۴۷، ۱۴۸۔

ہوا۔ سلرسنز کو شیخ سالار دین لقب پانے کی سعادت نصیب ہوئی اور حضرت نورالدین ولیؒ کے مولودِ مسعود کی گھڑی قریب تر آتی گئی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ العالمؒ کا لکھا منظوم نسب نامہ من وعن پیش کیا جائے۔ ؎

سَنزے چھم مول تے سنزرے چھم ماجی
کُل تھاوُ کول میون چھ سَنزرے ہو

جَد میون یِگن وُدن اوگرا سُنزرا دسو
سَنیَہ رۄدُس درپتا سَنز

وڑپتا سَنزس سمے ییٚلہِ ودتو
پوٚتے پَتھ رۄدُس زَنگا سَنز

زنگا سنز ییٚلہِ رَنہِ اَندرَ موٚدو
پَتھ تش رۄدُس ہیٚنز سَنز

ہیٚنز سَنزس ست کم دہ پتو
اَکھ ست رۄدُس گرزا سَنز

گرزا سَنزس سلرتیہ سلو
سَلرن پتہ چھس نندا سَنز

اسی شجرۂ نسب کو یوں ترتیب دیا جاسکتا ہے

اوگرا سنز

دریتا سنز

زنگا سنز

ہنز سنز

گرزا سنز

سلر سنز (شیخ سالار)

نندا سنز (شیخ العالم)

بابا حیدر[۱]

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سلر سنز یا سمن رشی کی محبتِ عارفانہ میں دائرہ اسلام میں آیا لیکن حضرتِ شیخ رح کے کلام کی داخلی شہادت سے اِس بات کی تردید ہوتی ہے ؎

اَکھ سَنت سلت سَنز پڑمانو   وُڈی مُسلمان گتہٕ ییہٕن

تَس گور سیّد حُسین سمنانو   یَس حیدر کوہ لگاٗین رین

جملہ رشی نامے اِسی بات پر مُتفق بھی ہیں۔ حضرتِ سیّد حسن سمنانی رح ۷۷۴ھ میں واردِ کشمیر ہوئے۔ قدرتی امر ہے کہ اُن کے وردِ مسعود کے بعد ہی اُن کے (سلر سنز) کے مراسم اُن سے بڑھتے گئے اور شیخ سالار دین رح کے نام سے ملقب ہو کر مسلمان ہوئے۔ ہر عہد ساز شخصیت روایات و عقائد کے دھندلکوں میں کھو جاتی ہے۔ یہی کچھ بہت حد تک شیخ سالار دین اور شُدر موج کی رشتۂ زن و شو کے بارے میں واقع ہوا ہے۔ شُدر موج بھی کشتواڑ کے راجپوت خاندان سے

۱؎ یہ بھی روایت ہے کہ یہ دراصل ہمبر سنز ہے۔ واللہ اعلم!

تعلق رکھتی تھی۔ روایت ہے جودھ کوٹ کا راجہ تھا دھایا کی بغاوت کے دوران قتل کیا گیا۔ سدرہ موزج بھی کی دخترِ نیک اختر ہے، جو اپنے والد کے مارے جانے کے وقت نابالغ تھی۔ مروجہ دستور کے مطابق اس نے کبھی جوگی پورہ کے چوکیدار کے یہاں پناہ لی اور انہی کی سرپرستی میں پلی بڑھی اور جوان ہوئی۔ کبھی جوگی پورہ کے چوکیدار دیہہ اور سدرہ موزج کے سرپرست کو اس کی شادی کی فکر دامن گیر ہوئی۔ اس نے ایک نوجوان کو (جس کے پہلی بیوی سے دو بیٹے تھے) خانہ داماد بنایا۔ رشتہ مواصلت کے بندھ جانے سے پیشتر ہی وہ نوجوان فوت ہوا۔ یہ سارا ماجرا کبھی جوگی پورہ کے چوکیدار نے حضرت سید حسین سمنانیؒ سے عرض کیا۔ اس نے حضرت سید حسین سمنانیؒ (جو اس وقت کونگام میں قیام پذیر تھے) کے سامنے سارے خدشات رکھے کہ کہیں مجھ سے اس نیک سیرت بیٹی کے رشتۂ زوجیت باندھنے میں کوئی غلطی سرزد نہ ہو اس لئے میری اس معاملے میں خود راہنمائی فرمائیے مرشدِ ضیا بار یہ سن کر مراقبہ میں ڈوب گئے۔ سرِ مبارک اٹھا۔ تبسم کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اللہ نے اس گوہر تاب دار کی مواصلت شیخ سالار کی قسمت میں لکھی ہے اسی دوران شیخ سالار دین بھی حضرتِ سید حسن سمنانیؒ کی صحبتِ عارفانہ میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ اس طرح انہوں نے ان کو رشتہ ازدواج میں منسلک کیا۔ حضرت سید حسین سمنانیؒ کے ارشاد پر وہ ازاں بعد کیموہ میں قیام پذیر ہوئے۔ اغلب ہے کہ سدرہ موزج اور شیخ سالار دین کے کبھی جوگی پورہ سے خاندانی روابط منقطع نہیں ہوئے ہونگے لیکن اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ انہوں نے اپنی عارفانہ زندگی کے ۳۲ سال یہیں گزارے۔ کشتوار سے متعلق تواریخی کتب میں اوگردیو کا حوالہ ملتا ہے حشمت اللہ خان، شیوجی دَر، نجم الدین اور عشرت کاشمیری نے تاریخ کشتوار پر قلم اٹھایا ہے نجم الدین اوگردیو حضرتِ شیخ کے جدِ امجد کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں: "اوگردیو کے خلاف چچیرے بھائی بولدردیو نے بغاوت کی اور وہ بھاگ کر کشمیر چلا آیا جہاں بادشاہِ وقت نے اُسے "رویہ دن" کی جاگیر عطا کی۔"[2]

---

[1] یہ بھی روایت ہے کہ شش اور گندر کبھی جوگی پورہ کے چوکیدار دیہہ کے اپنے بیٹے تھے[3] غلام محمد مغل کا یہ دعویٰ بے بنیاد ہے کہ حضرت شیخ کے آباؤ اجداد نگرکوٹ کانگڑا سے تھے، ان کا تعلق چندربنسی خاندان سے تھا

حضرت شیخ نورالدین رشیؒ کا معاصر مورخ اُن کے بارے میں خاموش ہے اُس سے صرف اتنا لکھا ہے کہ "ملا نورالدینؒ پر سلطان علی شاہ کے عہدِ حکومت میں اُس کے وزیرِ اعظم سُہہ بٹ نے اُن پر پابندی عاید کی تھی۔ اِس امر کی وضاحت اگلے صفحات میں کی جائے گی۔

سَنْز کشتواری میں پہلوان کو کہتے ہیں۔ تاریخ کشتوار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سنگھ یا سین کُنیت کے طور ناموں کے ساتھ برتنے کا رواج تھا۔ سنگھ لفظ سنسکرت لفظ سِمہ سے ماخوذ ہے جس کے لغوی معانی شیر کے ہیں اور مجازی معانی بہادر و شُجاع کے ہیں۔ سین کا سنگھ یا سِمہ سے ماخوذ ہونا قرین قیاس نہیں۔ سین بھی اصلاً سنسکرت لفظ ہے جس کے لغوی معنی نوکر ماتحت اور جیدو یدَن کے ہیں۔ جس کو بعد میں عوام کے خادم کے معنوں میں برتا گیا ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ کوئی لفظ اپنے اصلی معنی میں روزمرہ میں کھپ جائے۔ کچھ بھی ہو، سِمہ، سنگھ، سین اور سَنْز کا آپس میں معنوی رشتہ ضرور ہے۔ ان الفاظ کے لسانی ارتقائی تاخیر تقدم کو زیرِ بحث لانا میرا مقصد نہیں لیکن یہ سوال ضرور اُبھرتا ہے کہ اگر حضرتِ شیخ کے جدِ امجد کا نام اوگر دیو تھا، تو سَنْز کا استعمال کب سے شروع ہوا۔ یہ ایک تحقیق طلب امر ہے۔

حضرت شیخ العالمؒ کی ولادت

حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کشمیر میں "اورادِ فتحیہ" رائج کرنے کے موجب ہیں۔ روایت ہے کہ جب وہ "اورادِ فتحیہ" مرتب کر چکے تو ایک دفعہ حضرت خضر علیہ السلام اُن کے پاس تشریف لائے۔ اورادِ فتحیہ دیکھ کر اُس میں چودہ کلمات کا اضافہ کر کے غائب ہو گئے۔ حضرتِ میر سید علی ہمدانیؒ اپنے جدِ بزرگوار کے مرقدِ پاک پر حاضر ہوئے اُن پر ربودگی کی کیفیت طاری ہوئی۔ روضۂ مطہرہ سے ایک حسین و جمیل لڑکا باہر نکلا۔ میر سید علی کا وہی مجموعۂ کلمات ہاتھ میں لے کر پھر واپس چلا گیا۔ دوبارہ باہر آ کر یہ مجموعہ حضرت میر سید کے حوالے کر دیا کہا کہ حضرتِ نبیِ اکرمؐ نے فرمایا کہ ھٰذا الفتحیہ۔ میر سید خدا کا شکر بجا لائے اور لڑکے کے حسن و جمال پر متعجب ہوئے۔ حضور صلعم سے عرض کی "کہ ایں فرزندِ ارجمند از نسلِ کدام اصل است"۔ جواب ملا کہ یہ لڑکا رشیانِ کشمیر کا سردار ہے۔ نور الدین نام ابھی پردۂ غیب ہی میں پوشیدہ ہے، "عنقریب از پشتِ پدر در شکم مادر قرار گیرد، بر تو لازم است کہ در خطۂ کشمیر رفتہ نامش نور الدین گذاری و این فتحیہ در ملکش دلوی۔"

حضرتِ میر سید علی ہمدانیؒ اپنے جدِ امجد شافعِ اُمت حضرتِ محمدؐ کے ارشاد سے قدم رنجہ کشمیر ہوئے۔ اسلام آباد پہنچے، لوگ جوق در جوق آنے لگے للہ عارفہ نے انہیں آتے دیکھا۔ تن ڈھانپنے کا موقع نہ پا کر نانبائی کے تنور میں جھٹ کود پڑی۔ "ہیہات مرد آمد" للہ عارفہ کی زبان پر تھا۔ نانبائی گھبرا گیا تنور پر بڑی سی ہانڈی رکھ دی۔ حضرت امیر کبیرؒ نے تنور کا ڈھکنا جا کر خود اٹھایا۔ عارفہ ملبس از تنور مانندِ حور بروں آمد" اور سلام و تحیات بجا لائی۔ حضرت امیر نے اُس سے پوچھا "اے عارفہ اب تک تو عریاں تھی اس وقت جلتے تنور میں کیوں کود پڑی۔ عارفہ نے جواب دیا "ہمہ مردمانِ شہر و دیہات زناں بودند، زن از زن چہ ترسیدے، اکنوں مرد را دیدمت۔ خواستم کہ خود را پنہاں سازم، غیر از تنور جائے میسر نگشت۔ حضرت

امیر کبیر کو للہ عارفہ سے معلوم ہوا کہ حضرتِ شیخ پردۂ بطنِ مادر سے باہر نہیں آئے ہیں۔ حضرتِ امیر اور للہ عارفہ دونوں کیموہ کی طرف روانہ ہوئے۔ حضرتِ شیخ نے بطنِ مادر سے سلام عرض کیا۔ اتنے میں اُن کی والدۂ ماجدہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ ہوش میں آئی تو حضرتِ امیر نے نام پوچھا اور ترجمان سے "سدرہ ماجی" نام کے معنی پوچھ کر فرمایا کہ البتہ ایں چنیں ولدِ شہوار دُرِ صدفِ جمالی خواہد شد۔ سدرہ موج نے عرض کی کہ نمازِ پنجگانہ کی اذان کے وقت میری یہی حالت ہوتی ہے۔ میر سید علی ہمدانیؒ نے فرمایا کہ اُس وقت پُشت بہ قبلہ رہنا چاہیئے تاکہ بچہ (حضرتِ شیخ) رو بہ قبلہ ہو کر نماز ادا کر سکے ایسا کرنے سے تجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ للہ عارفہ کو ارشاد ہوا کہ "در نگہبانی ایں دُرِ گرامی گرانی نہ کنی"۔

یہ بھی روایت ہے وفات پانے سے پہلے بی بی یاسمن رشیؒ نے سدرۂ موج کو بشارت دی تھی کہ تمہارے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوگا جو بڑا نیک نام اور خدا ترس ہوگا۔

عورت کا سرمایۂ عزیز اُس کا تخلیقی جذبہ ہے، اِس لئے کوکھ خالی رہے تو وہ اپنی زندگی کو بے معنی، بے سود اور ادھوری سمجھتی ہے، اُسے اپنی جان بھی دینا پڑے لیکن تخلیقی جوہر سے اُس کی کوکھ بھر جائے تو وہ اپنے آپ کو خوش بخت تصور کرے۔ کہتے ہیں کہ کبھی جوگی پورہ میں ایک پنڈت جی رہا کرتے تھے۔ وہ مدت سے اولادِ نرینہ کے لئے ترستے تھے۔ ایک دن وہ شاستر پڑھتے پڑھتے اپنی بیوی کو بلا کر کہا۔

"کل شبھ ساعت ہے، گاؤں کے پاس والے چشمہ میں سے شب کے پچھلے پہر دو گلدستے ظاہر ہوں گے، ایک چنبیلی اور ایک اڑہر کا، پو پھٹتے ہی چلے جانا چنبیلی کے گلدستے کو سونگھنا، بھگوان تیری گود ضرور بھر دے گا۔

اتفاق سے شیخ سالار دین یہ گفتگو سن رہے تھے، وہ جاکر اپنی اہلیہ محترمہ سے یہ سبھی باتیں کہہ گئے، وہ صبح سویرے جاگ کر چشمے کے آس پاس ڈیرہ لگائے بیٹھی رہی۔ رات کی پُر اسرار و پُر معنی خاموشی میں چشمے میں سے دو گلدستے اُبھرے، وہ سہمی سہمی چلی اور چنبیلی کا گلدستہ ہاتھ میں اُٹھا کر سونگھ لیا، پنڈتانی نے اڑہر کا گلدستہ سونگھا، مطلوبہ مدت گزر جانے کے بعد

صدرہ موج کے بطن سے شیخ نورالدین عدم سے وجود میں آئے اور پنڈتانی کی کوکھ بمہ ساد (جو بعد میں بابا بام الدین کہلائے) کے سدا بہار پھولوں سے بھر گئی۔ روایت ہے کہ بمہ ساد کے والد آتن پنڈت "پنگش تیلی کیمہ" میں قیام پذیر تھے۔ "نندکے اور اُنکی والدہ محترمہ غلمرکٹنی کے درمیان یہ گفتگو شیخ سالاردین نے کہاں تھی یہ ایک تحقیق طلب معاملہ ہے خیر ان جملہ مقامی روایات کی روشنی میں اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ حضرتِ شیخ کی ولادت باسعادت کی بشارت اگر شیخ سالاردین کو کھی جوگی پورہ میں ہی ملی لیکن اُسے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ وہ وہیں پیدا بھی ہوئے درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ "تہ کھی ہُرک منے زم دِتو نَند سنز بہ مُسلمان" کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ اللہ نے عدم سے میرے وجود کو بطنِ مادر میں منتقل کر کے ٹھرایا۔ نندا سنز میں مسلمان۔ یہ مقام کھی جوگی پورہ ہی ہو۔ اُسے حضرتِ شیخؒ کی لامکانی اور لازمانی ذات میں کوئی فرق نہیں آتا۔ یہ بھی اغلب ہے کہ صدرہ موج روایتاً بہلاپ جننے کے لئے کھی جوگی پورہ گئی ہو کھی جوگی پورہ کی تاریخی اور روایتی حیثیت مُسلّم ہے لیکن کثرتِ رائے یہی ہے کہ حضرتِ شیخ نورالدین کیموہ ہی میں پیدا ہوئے۔ روضۃ الریاض کے مصنف بابا خلیل اُن کی ولادت کے بارے میں لکھتے ہیں" کہ اس سرمایہ سعادت کی ولادت سلطان قطب الدین کے نویں سال جلوس کو قریہ کیموہ میں ۱۰ر جمادی الاوّل ۷۷۹ھ (م: ۱۳۷۸ء) کو ہوئی"

"ولادتِ آں سرمایۂ سعادت نہم جلوسِ سلطنت سلطان قطب الدین بقریہ کیموہ در روز نفیس یوم الخمیس ہشتم ماہ جمادی الاوّل سنہ ہجری ہفت صد و ہفتاد و نہ بود۔"

تاریخ کبیر کے مصنف ابوالفقراء بابا نصیب الدین کے رشی نامہ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "تولد یافتہ در موضع کیموہ در سن ہفتصد و ہفتاد و نہ در ایام نجریہ روز عید کلاں"؟

ابوالفقراء بابا نصیب الدین غازی (وفات ۱۰۴۶ھ) کا نورنامہ رشیان کشمیر کا اوّلین تذکرہ ہونے کے ناطے ریشیت کی تاریخ میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اُن کی ولادت کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

"چناں آوردند کہ از ہجرتِ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سنہ ہفت صد و ہفتاد و نہ بود کہ حضرت شیخ نورالدین تولد شد: نظم: ~

ز ہجرت سیدِ عالم از بس دار کہ بُد ہفتاد و ہفت صد نہ پدیدار

زہی شیخی کہ نورالدین امجد تولد یافت از تاریخ سرمد

اس کے ہم جلیس وخلیفہ بابا داؤد مشکواتی "اسرار الابرار" (مؤلفہ ۱۰۶۳ھ) میں حضرت شیخؒ کا سنِ تولد ۷۵۷ھ اور وصال ۸۲۰ھ ہجری قرار دیتے ہوئے یہ بھی لکھتے ہیں کہ "وبقول اصح ہشت صد وچہل ودو" تحقیق سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ ان دو مؤرخین کے بعد آنے والے تذکرہ نویسوں اور مورخوں نے انہی کی ضبطِ تحریر میں لائی ہوئی روایات میں سے کسی ایک کو صحیح مان کر معاملے کو اُلجھا دیا ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ بابا نصیب الدین غازیؒ سے اکثر مؤرخین نے اتفاق کرلیا ہے۔ کیونکہ حضرت شیخ نورالدین ولیؒ اور ریشیانِ کشمیر کے اولین تذکرہ نویس کی حیثیت سے ان کی رائے زیادہ معتبر ہے انہوں نے نہ صرف روایات کو محفوظ رکھا بلکہ تحقیق وتفتیش سے انہیں وزن دار بھی بنایا۔ بابا نصیب الدین غازیؒ رقمطراز ہیں کہ انہوں نے زیارت حضرت شیخؒ کے دروازے پر ان کا سنِ وصال ۸۴۲ھ کندہ تھا جو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔[1]

خوارق السالکین (تاریخ ہادی) کے مصنف احمد ابن الصبورؒ (۱۱۰۹ھ) نے حضرت شیخؒ کی ولادت ۷۷۹ھ میں اور ۸۴۲ھ کو صحیح سنِ وصال قرار دیا ہے جس کے مطابق حضرتِ شیخؒ کی عمر شریف ۶۳ سال بنتی ہے جبکہ کبھی مورخ ۶۳ سال کے سن پر یک رائے ہیں۔ احمد ابن الصبور نے مادۂ تاریخِ وصال یوں باندھا ہے۔

زدنیا نورالدین چوں رفت بیروں کہ بودہ پیشوائے اہلِ تجرید
پئے سالِ وصالش ہاتفِ غیب بگفتا بود شاہِ اہلِ توحید

بود شاہِ ملکِ توحید سے ۸۴۲ھ کا عدد نکلتا ہے۔

بابا خلیل کے رشی نامے کے مطابق حضرت شیخؒ کا سنِ پیدائش ۱۲ جمیدالاول ۷۷۹ھ ہے بابا کمال بھی ۷۷۹ھ کو صحیح سالِ ولادت مانتے ہیں لیکن ۶ جمیدالاول کے بجائے ۱۲

---

[1] فتحاتِ کبرویہ۔ عبدالوہاب نوری۔

جمیدالاول ویر وار کو صحیح گرمانتے ہیں۔

بہاؤالدین متو اپنے رشی نامہ میں حضرت شیخ کا سنِ تولد ۷۷۹ھ بتاتے ہیں یہ دو اشعار ملاحظہ ہوں

شُدہ نیکو است درہمہ گیتی   اَز زبانِ خوشِ سمکریتی

چوں تولد شد آں خجستہ نہاد   بودٗ یک کم زہفت صد و ہشتاد

حسن کھوئیہامی اپنی تاریخ میں دعویٰ کرتا ہے کہ اُس نے مُلّا احمد کی تاریخِ وقائعِ کشمیر کا ایک نسخہ دیکھا ہے جس میں لکھا ہے کہ حضرت شیخ ۷۵۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۸۲۰ھ میں واصل بحق ہوئے حسن کھوئیہامی نے ہجری سموت کے ساتھ کشمیری سموت ۹۱ لکھا ہے اور حضرت شیخ کی عمر شریف ۶۳ سال بتائی۔ کشمیری سموت۔ شاہ کی تخت نشینی ۷۳۰ھ سے شروع ہوتا ہے جبکہ حسن نے رنیچن کی تخت نشینی کا سن ۷۲۵ھ لکھا ہے، اُس کے حساب کے اگر ۷۲۵ھ میں ۹۱ سال جمع کر دیئے جائیں تو حضرتِ شیخ کا سنِ وصال ۸۱۶ھ بنتا ہے۔ آرا کا تضاد ہی اُس کی شہادت کو غیر معتبر بنا دیتا ہے۔

واقعاتِ کشمیر میں خواجہ اعظم دیدہ مری لکھتے ہیں کہ بعض تواریخ حضرتِ شیخ کا سنِ ولادت ۷۵۷ھ اور سنِ وصال ۸۲۰ھ لکھتے ہیں مگر مشہور یہی ہے کہ انہوں نے ۸۴۲ھ میں وفات پائی۔

"صاحبِ "اسرار الابرار" تولد آں قدوہ کبار را در سال ہفت صد و ہفتاد و نُہ را در سال ہفت صد و پنجاہ ہفت و وصال در ہشت صد و بیستم نوشتہ است۔ آما مشہور این است کہ در سال ہشت و صد چہل دُو در رحلت فرمودٗ۔ میگویند سن شریف شصت و سہ بودٗ"۔

پنڈت نرائن کول عاجز اپنی منتخب التواریخ اور بیربل کاچرو اپنے مجموعہ التواریخ میں حضرت شیخ کی ولادت و انتقال کے اوپر بیان کئے گئے سموتوں (۸۴۲ - ۷۷۹ھ) کی تائید کرتے ہیں۔ بیربل کاچرو کا کہنا ہے کہ "تاریخِ مولودٗ سعادت نمودِش ہفت صد و ہفتاد و نہ ہجری و سنِ رحلت و انتقال ہشت صد و چہل و دو، موّرخان در قیدِ قلم آوردہ آند۔ روایتِ صحیح این است"۔

محولہ بالا تاریخی شواہد سے یہی بات پایۂ ثبوت کو پہنچ پائی ہے کہ حضرت شیخ نورالدین ولی علیہ الرحمتہ کے عدم سے وجود میں آنے کا سال ۷۷۹ھ ہے۔

اب آیئے تاریخی بھول بھلیوں سے دامن چھڑا کر دیکھیں کہ انوارِ حق کا ایک ذرہ جو شیخ سالاردین اور سدرہ موج کے حصے میں آیا کیسے مہرِ درخشاں بنا۔

فصل پنجم

روایت ہے کہ مقبولِ ازل شیخ نورالدین نے اپنی والدہ ماجدہ سدرہ موج کی چھاتیوں کو چھوا بھی نہیں۔ اتفاقاً للہ عارفہ بھی وہیں آن پہنچی۔ ننھے شیخ نورالدینؒ کو گود میں لیا۔ اس کے بعد اس سے مخاطب ہوئی۔ "ییہ مَنز چھوکہ نہ، تہ چیہ چھکہ مَنز چھان" للہ عارفہ کی آواز کانوں میں پہنچنے کی دیر تھی کہ بچے نے للہ عارفہ کی چھاتیوں سے دودھ پینا شروع کیا۔ عبدالوہاب شائق نے یہ پر اسرار و پر انوار واقعہ یوں باندھا ہے۔

ز پستانِ مادر نہ نوشید شیر — بہ طفلی ز شیخ آمدہ کارِ پیر
للہ عارفہ در کنارش گرفت — بہ انگشت شیرش بدادا ے شگفت
دو انگشتِ بی بی دو پستان شدہ — لبن در گلویش ازاں آمدہ

ترجمہ: اُس نے اپنی ماں کی چھاتی سے دودھ نہیں پیا۔ شیخ العالم سے بچپنے ہی سے بزرگانہ صفات کا اظہار ہوتا تھا۔ للہ عارفہ نے اُسے اپنی گود میں لیا۔ اور اپنی چھاتی اُس کے منہ میں دی۔ انگلی، دو انگلیاں دو چھاتیاں (پستان) بن گئیں اور اُس کے حلق میں دودھ ٹپکنے لگا۔

حضرت شیخ چار ماہ کے ہوئے، تو والدہ ماجدہ نے انہیں ایک آخوند کے پاس تعلیم و تربیت کے لئے چھوڑا۔ جب اُس نے حروفِ ابجد حضرت شیخ کے سامنے لکھ کے رکھ دیے اور "یا فتاح" سے پڑھانا شروع کیا لیکن وہ "الف" (ا) کی خواندگی سے آگے نہ بڑھے۔ اُستاد نے اُس کی پر اسرار خاموشی توڑنے کی پوری کوشش کی، پھر بھی حضرت شیخ ... لب کشانہ ہوئے۔ بالآخر یوں گویا ہوئے۔" اے غرۂ قیل و قال بے خبر از وجد و حال، چوں الف گفتی خواندم الف را احد دیدم، حرفِ یاد دوئی درمیان

آورد، اباکردم تو ازاں بے خبری" وہ اِس لئے الف سے آگے نہ بڑھے کہ ایسا کرنے سے دوئی پیدا ہونے کا خدشہ تھا لیکن وجد و حال سے بے خبر ملاّ کو کون سمجھا دے۔ اِس لئے وہ متحیر ہوا، اُن کی والدہ ماجدہ بھی متعجب ہوئیں۔ اور شیخ سے کہا۔ بیٹے ایسی باتیں چھوڑ، علم حاصل کر، علم ابدی دولت ہے اِس سے محروم نہ رہ۔ حضرت شیخ نے اُن کی طرف نظریں اُٹھا کر اپنی ایک اُنگلی سے دیوار پر نشان لگایا کہ خطِ ریحان میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، رقم ہوا۔ اُنگشتے بر دیوار زد بخطِ ریحان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، رقم ہوا "اُنگشتے بر دیوار زد بخطِ ریحان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نمودار شد"۔ اُستاد اُنگشت بدنداں رہا اور حضرت کی والدہ سے کہا کہ بچے کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ کیونکہ اِسے علمِ لدنی عطا کیا گیا ہے۔ مشیت ایزدی کچھ اور ہو تو کیسے کوئی دُنیاوی جاہ و حشم کی تلاش میں سرگرداں پھرے۔ ایک دن وہ یادِ حق میں محو تھے کہ چار نورانی صورتیں ظاہر ہوئیں۔ حضرت شیخ نے سلام مسنون عرض کر کے اُن سے مؤدبانہ دریافت کیا کہ وہ کون ہیں تو اُنہوں نے جواب دیا کہ ہم نے تمہارا روحانی مرتبہ دیکھ لیا ہے، اِس لئے تم پر لازم ہے کہ ہمارے طریقوں میں سے جو بھی طریق تمکو مرغوبِ خاطر ہو اختیار کرو۔

"اے پسر نیک سیر ما ہمہ کدام بنام نامی معین و بسلسلہ گرامی مزین ہشیم بذاتِ تو استعداد حصولِ دولتِ جاودانی در لوحِ محفوظ مثبت دیدیم اکنوں بر تو لازم است کہ دستِ ہمت بہر طریقے کہ از اطوارِ ما پسندِ خاطر افتد دراں اجازت بخشیم"۔

حضرت شیخ نے نہایت ہی ادب سے التجا کی کہ اِس بارے میں کوئی قدم جب ہی اُٹھایا جا سکتا ہے جب آپ اپنے اسمائے گرامی نام اور کام سے آگاہ فرمائیں گے۔

"ایں احقر را چہ طاقت است اما چوں رافت نمودید اُمید آنست کہ از نامہا، از کام خود آگاہی دہید، ہر کار یکہ از دستِ ایں حقیر آید، دراں کوشش نماید"

یہ چار بزرگ حضرات حضرت بہاؤ الدین ذکریا، حضرت شیخ فرید الدین شکر گنج، حضرت شاہ عل باز قلندر، اور حضرت سید جلال الدین بخاری تھے۔ پہلے اُنہیں حضرت بہاؤ الدین ذکریا

اپنے نام اور باطنی کمالات سے یوں واقف کرتے ہیں کہ میں نے ترکِ علایق کر کے چراغِ وحدت کو روشن کیا ہے

اے پسرِ خوش سیر قطعِ علایق اَز خلایق برائے رضائے خالق کردم و مجتنب اَزاں فرزند

شُدہ چراغِ تحقیق در کاشانۂ وحدت افروختم۔"

فریدالدین شکر گنج اُن کے عارفانہ مرتبے کی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے اُنہیں بتاتے ہیں کہ

اُنہوں نے کس طرح دنیوی لذات و تنعم کو ترک کر کے ہمیشہ کے لیے اپنا رشتہ جوڑ دیا تا کہ عرفان

الٰہی کی لذت سے فیضیاب ہو سکوں۔

"اے قرۃ العین سعید دارین دست اَز خوردن و نوشیدن برکشیدم مہر ہیچ

خورش بر دہاں نہادم تا اَز خوانِ نعمت چاشنی گیر گشتم۔"

حضرت شاہ لعل باز قلندر نے فرمایا کہ میں نے کسی کی عیب جوئی نہ کرنا اپنا شعار بنالیا ہے اور

ساری عمر ایک ہی پرانا کپڑا پہنتا آیا ہوں تا کہ میں قربتِ الٰہی کے جام سے سرشار ہو پاؤں۔

"اے نورالابصار نیک اَطوار در عیب کس و ناکس نہ کوشیدم

و در عمر یک کرتۂ کہنہ پوشیدم تا جامِ قربت نوشیدم"

حضرت سید جلال الدین بخاری نے انہیں فرمایا کہ میں نے سیر فی الارض پر عمل کر کے خدا ترس لوگوں

کی صحبت سے فیضیاب ہوا۔

"اے ثمرۃ الفوادِ نیک بنیاد سیر فی الارض و باعر فقرا الی اللہ تمام عالم گشتم

تا اَز صاحب دلاں تمتع برداشتم و در میدانِ وحدت علم اَفراشتم"

ان ارشادات عالیہ کو اگر رشیت کے عناصر اربعہ قرار دیا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں ہو گا کیونکہ ترکِ

لذات و عیش و تنعم ترکِ علایق، جاہ و حشم، سے بے نیازی، عیب جوئی و دیگر انسانی کوتاہیوں سے

اجتناب اور ملکِ خدا کی سیاحت خدا ترسی ہی عارفانہ زندگی کے بنیادی عناصر ہیں نہ اپنے وجود

کو سمیٹنے کے لیے "خود ارتکازی لازمی ہے ورنہ "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" کا مقصد ہاتھ

سے جاتا رہے گا۔

بنی نوع انسان سکونِ قلب و نظر حاصل کرنے کے لئے مافوق الفطرت کردار تخلیق کرتا آیا ہے حقائق کو تمثیلی و افسانوی رنگ میں پیش کر کے اُس نے اپنی خلاقی کا ثبوت دیا ہے یہی جذباتی وجہ ہے کہ اپنی نظر کی وسعت و رفعت کے خاطر روحانی شخصیات کی حیاتِ بابرکات کو بھی عقائد کی رنگ آمیزیوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ یقین کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ ایسا ہی رویہ حضرتِ شیخؒ کی حیات متبرکہ کے ساتھ روا رکھا گیا ہے اِن باتوں کی طرف عبدالاحد آزاد نے صریح اشارے کئے ہیں "شیخؒ کے حالات اِس طرح لکھے گئے ہیں کہ ہر واقعہ ایک معجزہ یا کرامات معلوم ہوتا ہے واقعہ کی اصلی شکل مشکل سے ہاتھ آتی ہے بعض کہانیوں میں" داستانِ امیر حمزہؒ" کا لطف آتا ہے فرق اتنا ہے کہ وہاں جادو کام کر رہا ہے یہاں کرامات اور خرقِ عادات کے چمن زار کھل رہے ہیں باوجود اس کے (یہ کام) مجموعی حیثیت سے دلچسپ بھی ہے اور تاریخی ضروریات بھی ایک خاص حد تک مہیا کر سکتا ہے اِن کے (ریشی ناموں) کے مطالعہ سے مختلف تاریخی معلومات کی ایک فہرست ملتی ہے اور وقتی ماحول اور ذہنیت کا مکمل نقشہ نظر آتا ہے البتہ داستان بہت طویل ہے جن واقعات کو داستان کا پیٹ بھرنے کے لئے لکھا گیا ہے اور جو جذبات کی محض منہ بولتی تصویریں ہیں اِن کو نظر انداز کرنے کے بعد جو واقعات رہ جاتے ہیں وہ بھی متعدد اور طویل ہیں۔ اِن مرقعوں کے جذباتی رُخ سے قطع نظر کرنے کی کوشش تو کی جاسکتی ہے لیکن اِس میں بڑی مشکل پیش آتی ہے جس کا حل کرنا آسان نہیں۔ وہ یہ ہے کہ حضرت شیخؒ کی عارفانہ حیثیت نہایت بلند ہے اُن کے سوانح نگاروں کا رتبہ بھی کافی عالی شان ہے۔ جس واقعہ کی روایت بابا نصیب الدین غازیؒ جیسے بزرگ فرمائیں۔ اور جس سانحہ کے لکھنے پر بابا داؤد خاکیؒ جیسا عالم دہر اور زبردست صوفی قلم اٹھائے اس اعتراض کون کرسکے۔

اہل دل حضرات کی مقدس ممدانہ روایات کو سائنسی درایت کی زبان میں لکھنا اور اس کی کسوٹی پر پرکھنا "فی سبیل اللہ فساد" کے مترادف ہے۔[1]

اللہ کا شکر ہے کہ عبدالاحد آزاد کے بعد اِس بارے میں تحقیق سے حیات شیخؒ اور اُن کی

---

[1] کشمیری زبان اور شاعری۔ عبدالاحد آزاد۔ جلد۔۲۔ صفحہ ۱۲۵۔ ۱۲۶

زندگی سے متعلق کئی اہم گوشے سامنے آتے ہیں جس سے اُن کی تاریخی، عارفانہ، شاعرانہ اور مجاہدانہ شخصیت اور زیادہ آب وتاب کے اُجاگر ہونے میں مدد مل سکتی ہے تحقیقی ذرائع بھی بڑھ گئے ہیں جس سے ایسے اِمکانات روشن تر ہوئے ہیں۔

شادی خانہ آبادی

شیخ سالار دین کا خاندان قناعت و زہد کا نمونہ تھا۔ انہیں اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ دُنیا چند روزہ ہے، بادشاہی امارت و شان شکوہ نقش برآب ہے۔ یہی وہ خاندانی لاشعور ہے جو حضرت شیخ کے وجود میں نمودار ہوا اور وہ "علمدارِ کشمیر" ہوئے۔ عمر کی تیرہ منزلیں طے کی تھیں کہ اُن کے سر سے والدِ بزرگوار کا سایہ اُٹھ گیا۔ حضرت شیخ بچپن ہی سے یادِ خدا میں محو تھے وہ دُنیوی عیش و تنعم کو ہیچ گردانتے تھے۔ اِس لئے اُن سے یہ توقع رکھنا کہ وہ گھر بسائیں عبث تھا۔ حضرت شیخ کی مرضی شاملِ حال تھی یا نہیں، اُن کی شادی زے دید نام کی خاتون سے رچائی گئی، جو ڈاڈہ سر (ترال) کی رہنے والی تھی اور جس کے والد کا نام اکبر دین تھا۔ جمال دین و کمال دین اُسکے دو بھائی تھے جس کا اظہار "زے دید" نے خود ہی اس شلوک میں کیا ہے ؎

زے بہ دزالیس مُنز ڈاڈہ سرے　　اکبر دین چھُم مالِس ناد
جمال دین کمال دین پننے گرے　　شیخہ بہ مرُے تہ روزی کتھ

"میں زے ڈاڈہ سر کی، میرے باپ کا نام اکبر دین ہے (میرے دو بھائی) جمال دین اور کمال دین اپنے گھر میں ہیں۔ اے شیخ میں مروں گی اور بات رہ جائے گی۔"

زے دید کے والد اکبر دین کا مقبرہ آج بھی ڈاڈہ سر میں عقیدت مندوں کے لئے وجہ سکون ہے اُن کے دونوں بھائی جمال دین اور کمال دین اِنہی کے (اکبر دین کے) پہلو میں دفن ہیں کہا جاتا ہے کہ حضرت شیخ شادی سے پہلے اُنہی کے گھر نوکر تھے گھر کا کام کاج کرنے کے علاوہ بھیڑوں کے ریوڑ بھی پالتے تھے۔ رشی ناموں میں درج ہے کہ حضرت شیخ کی اہلیہ محترمہ پرگنہ برنگ ساگام کی رہنے والی تھی۔ لیکن تحقیق سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی زے دید سے منسوب اوپر دیا ہوا شلوک

ایک داخلی شہادت فراہم کرتا ہے، جسے نظرانداز کرنا محال ہے۔

زے دیدہ کے بطن سے دختر نیک اختر زون دیدہ اور فرزند ارجمند بابا حیدر رپیدا ہوئے۔ یہ دونوں جگر گوشے شادی کے بعد چھ سال کے اندر اندر عدم سے وجود میں آئے۔ اِس طرح وہ بھی صاحبِ عیال ہوئے۔ یہ ایک قدرتی امر ہے کہ زندہ رہنے کے لئے حصولِ روزگار بھی ضروری ہے اِس لئے والدۂ محترمہ کی ہدایت پر وہ اپنے رضاعی[1] بھائیوں کے ساتھ رات کو نگہبانی کا کام انجام دینے لگے۔ ایک دن وہ ششُ اور گندُر کے ساتھ بادلِ ناخواستہ ہو لئے، چوری کرنے کی گھڑی آن پہنچی تو اُسے ہلکے ہلکے چیز اُوپر سے نیچے پھینکنے کے لئے کہا گیا چونکہ وہ عمر میں چھوٹے تھے اور جسم کے تپلے بھی تھے اِس لئے اُنہیں کو پہلے نقب مکان کھیلئے اندر داخل کر دیا گیا۔ حضرت شیخ نے "شوپ" چھلنی جیسی ہلکی ہلکی چیزیں پھینکیں۔ بھاری بھاری پھینکے کہنے پر اُنہوں نے اوکھلی جیسی وزنی چیزیں نیچے پھینک دیں۔ رضاعی بھائیوں کو بڑا غصہ آیا اور اُسے نقب سے باہر آنے کو کہا گیا۔

ایک دن ششُ اور گندر نے کہیں سے گائے اور چادر چرالائی تو اُسے دونوں چیزیں گھر پہنچانے کو کہا گیا۔ جب وہ گھر کے رستے جا رہے تھے تو کتّوں نے بھونکنا شروع کر دیا۔ حضرت شیخؒ نے چادر گائے کی پیٹھ پر رکھ دی اور خود خالی ہاتھ گھر چلے گئے۔ گھر پہنچنے پر اُس سے چادر اور گائے کے بارے میں دریافت کیا گیا جس پر وہ بولے سے

آنگنہ نادلایان چھ ہُوٗ نو | بایوکن دِتھ شُرٛنی تو
ییمی ییمہ وٚوِتے تمی تیتھ لُونو | ہون چھے دِپان وَو باوَو

"آنگن میں کتّا آواز دے رہا ہے، بھائیوں کان لگا کر سنو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، وہ کہتا ہے کہ جو جیسا بوئے گا وہ ویسا ہی پائے گا۔" ششُ اور گندُر جواباً بول اُٹھے کہ "بھائی یہ کیسی باتیں کرتے ہو؟" کتنے شب بیداروں سے سنتے ہیں کہ "آنکھ اور شب بیداری کا بدلہ ہے لو۔ بیائید، مُردِش ... بیدانکی ببرید، خفتگانِ غفلت ہیچ مشمارید"۔

---

[1] کہا جاتا ہے کہ ششُ اور گندرہ اُن کے سوتیلے بھائی تھے۔

ایک اور وقت پر ششش اور گندر نے کھڈونی میں کسی کے گھر نقب زنی کر کے حضرت شیخ کو اندر ٹھونس دیا۔ اُس نے وہاں سبھی اہلِ خانہ کو ننگا سوتے، سردی میں ٹھٹھرتے دیکھا تو اپنی چادر اُن کے اوپر ڈال دی۔ باہر آئے تو برادرانِ رضاعی کے دریافت کرنے پر ارشاد فرمایا ؎

کھوڈونی ڈِیٹھم جسا تھا ننی   وُرنی ترآو مکہ پنی کھنی

حضرت شیخ کے برادران رضاعی تنگ آئے اور انہوں نے حضرت شیخ کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ والدہ ماجدہ سدرہ موج نے اُسے ایک جولاہے کے پاس کام سیکھنے کو کہا۔ ہونا یہ تھا کہ وہ وہاں کام کرتے کچھ جولاہے سے سیکھ لیتے۔ ہوا یہ کہ حضرت شیخ نے آلاتِ بافندگی دیکھ کر جولاہے سے بحث شروع کی اور عارفانہ انداز سے اُسے کہنے لگے ؎

ادت چھے دپان دُکانداری   مُوک چھے دپان موبر پڑھ

کھڑاو چھے دپان ژھوقبر ــــ   ماآلماجہ دوپہم ہو نر ــــے گژھ

"ادت" کہتا ہے دُکانداری، "موک" سے یہ سبق ملتا ہے کہ اِس دُنیا کے چند روزہ پر تکیہ نہ کر، "کھڑاؤں" کہتی ہے کہ قبر میں سمایا۔ ماں باپ نے مجھے ہُنر سیکھنے جانے کو کہا۔"

اِس کے بعد اپنے اُستاد سے پوچھا کہ پاؤں کی اوپر نیچے حرکت کے کیا معنی ہیں؟ جولاہے نے جواب دیا کہ اِس سے چادر وغیرہ کا تانا بانا درست۔ حضرت شیخ بولے نہیں اِس میں اور بھی کوئی اشارہ ہے۔

"یمیں گو ید مبدم زمین دیسار گو ید جایم ہمیں"

حضرت شیخ نے پھر فرمایا کہ اے اُستاد یہ جو ماکو ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آجا رہتا ہے اِس کے کیا معنی ہیں۔ اُستاد نے جواب دیا ماکو بانے کے تار ادھر اُدھر لے جاتا ہے اور کوفت کی ضرب سے یہ تار درست ہو جاتے ہیں۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدم کو

ل میں نے "ژھینکہ" کی بجائے "تراو مکہ" لکھ دیا جو زیادہ صحیح بھی ہے۔

ل کشمیری زبان اور شاعری - جلد ۲

کی طرح رزق کا رشتہ گویا مُنہ میں لے کر اِدھر اُدھر دوڑ دھوپ کرتا ہے یہ تار ختم ہوا تو تاکو کی طرح اُس کی تگ و دَو بھی ختم ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ مر جاتا ہے جولاہا اِن باتوں سے پریشان ہوا سوچا کہ یہ لڑکا بہکی بہکی باتیں کرتا ہے اِسے بافندگی سے کیا سروکار۔ وہ پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ حضرت شیخؒ ایک طرف مراقبہ میں بیٹھے۔ والدہ ماجدہ پھر دیکھنے آئیں۔ حضرت شیخؒ کو اِس حالت میں دیکھ کر اُن سے پوچھنے لگیں کہ تم کو کس نے اِس کام سے روکا۔ وہ بولے کہ اماں یہ دو چھوٹی لکڑیاں دیکھ رہی ہے جو الگ الگ ڈور سے لٹک رہی ہیں، اور اوپر نیچے آتی رہتی ہیں، اِشارہ کرتی ہیں یہاں سے اُٹھ کر چلے جانے کا، ہماری طرح مصیبت میں مُبتلا مت ہو جاؤ۔ دُنیا آرام کی جگہ نہیں۔ اِتنا کچھ کہنے کے بعد وہاں سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور صحرائے عرفان کی طرف چل دیئے۔

جب جذبہ عشق کام کر جائے اور نورِ الٰہی رہنما ہو تو ماں کی ممتا، باپ کی شفقت، زن و شوہر کے تعلقات اور جگر پاروں کی بے لوث محبت کبھی رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ چنانچہ بادیہ پیمائی کے ہوئے اور پھر کبھی واپس نہ لوٹے۔ صحرا نشینی کے دوران ایک دفعہ والدہ ماجدہ اُن کے پاس گئیں اور کہا کہ "بیٹے بیابانوں میں پھرنے سے تجھے کیا ملے گا؟ گزارے کی کوئی صورت نکال۔ حضرت شیخ نے جواب دیا کہ "اے والدہ دِل تنگ نہ ہو۔ آج میں تمہیں بہت سا سونا چاندی لا کر دوں گا ساری عمر آرام سے گزرے گی۔ یہ کہہ کر ایک کمہار کے پاس گئے اور اُس سے کجاوہ یہ کہتے ہوئے کہ ٹھیکریوں کی ضرورت ہے کجاوہ پھر واپس کر دوں گا ٹھیکریوں کا کجاوہ بھر کر گھر لے گئے۔ والدہ سے کہا کہ اِسے خالی کر دو۔ والدہ کیا دیکھتی ہیں کہ کجاوہ سونے چاندی سے بھرا ہے۔ دیکھ کر گھبرا گئیں اور اپنے بیٹے سے کہا "بیٹے جہاں سے یہ چیزیں اُٹھائی ہیں پھر وہیں چھوڑ آؤ، اس کے بعد میں تجھ سے کوئی چیز نہیں مانگوں گی"

نفس کشی کا یہ حال تھا کہ کئی دنوں تک فاقہ رہتے۔ افطار خالی پانی سے کرتے۔ والدہ اُن کے پاس آئیں۔ دیکھا کہ شیخ نورالدین مٹی میں لت پت خس و خاشاک کے ڈھیر پہ سر رکھے سو رہے ہیں۔ ممتا جوش میں آئی اُن کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور بھرائی آواز میں کہا۔

تُنڈہ کا ماہ دَپے نت ــــــ تُنڈہ انڈ جھم گیلان کرڈ ــــــ نے
تُنڈہ دَ پھوکٹ گوئے کینہ ــــــ تُنڈہ کوئیں ترڈ دُتھ میو ــــــ نے

"تُنڈہ میں تجھے کوئی بھی کام کرنے کو نہیں کہوں گی۔ اقربا و احباب خندہ زن ہیں۔ تُنڈہ یہ تو بتا کہ کون سی بات تیرے دِل کو لگی کہ تو نے میرے گھر آنا چھوڑ دیا۔

حضرت شیخ جواباً عرض کرتے ہیں ؎

موج بہ نے گرجون ــــــ یے ــــــ مئے بز خو ڈ آ یےپی تھوڈ لونے
موج بہ نے تھا جبتہ ــــــ کھنے ــــــ مئے بز نہ کھنہ مَن صاف ہونے

"ہاں! میں تیرے یہاں نہیں آؤں گا۔ میرے مقدر میں یہی لکھا ہے، میں رکابی میں پڑا ہوا کھانا نہیں کھاؤں گا۔ کھانا نہ کھانے سے میرا باطن منوّر ہو چکا ہے۔"

والدہ کی محبت پھر موجزن ہوتی ہے۔ وہ حضرت شیخؒ کو ایسے پھٹے پرانے کپڑے پہننے سے باز رکھنا چاہتی اور کہتی ہے کہ کم سے کم خاندان کے ننگ و ناموس کا پاس تو کر۔ جواباً حضرت شیخؒ فرماتے ہیں ــــــ

خرقہ دکانگڑی پر داری جاؤں، جس نے مجھے کڑاکے کی سردی سے سرما میں بچایا میں ڈالیہ کیا رغبت رکھوں، میرے لئے کاسنی و ساگ عسلِ سفید ہے۔ ؎

بہ پاڑی کانگر تہ جبنڈ من ــــــ یمی ونڈس تیر کرم رآ جھی
بہ کیا شنگے قلاتن ڈ س ــــــ ہند تہ ملکہ جھم چھو آ جھی

صاف ظاہر ہے کہ یہ حضرت شیخؒ کی زندگی کا فیصلہ کُن مرحلہ تھا۔ ایک ایسی آزمائش تھی جس میں وہ پورے اترے۔ قدرتی امر ہے کہ احبابِ خانہ سے اُن کی رنجش بھی رہی ہو گی، جس کے دوران وہ والدہ کے ہمراہ کھی جوگی پورہ بھی تشریف لے گئے۔ یہ اُن کی صحرانوردی کے آغاز کے دِن تھے اور فطرت ایں مشیت حنائی کی تکمیل کا سامان کر رہی تھی، غار نشینی قریب تر آتی جا رہی تھی ؏

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

غار نشینی کیموہ دریائے ویشو کے مغربی کنارے پہ واقع ہے جو پرانے زمانے میں ایک جنگل تھا یہیں قریب "شہار ٹینگ" نام کی ایک جگہ تھی جہاں حضرت شیخؒ نے ایک زمین دوز گپھا کھدوائی اور اُسی میں گوشہ نشینی اختیار کر کے عرفان و آگہی کے جام لنڈھائے۔ گاؤں کے گوالے نے اس کی اطلاع آپ کی والدہ کو پہنچائی جو سنتے ہی حضرت شیخؒ کے پاس وہاں غار پر پہنچ کر پکار اٹھی ؎

"میرے بیٹے نُندہ، گپھا چوہوں اور کیڑوں کا مسکن ہے، یہاں شیر و شغال تمہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔ میرے بیٹے آج تو میرے پہلو سے بھاگ چلا۔ خرقے کی جوئیں تیرے وجود پر تو نہیں پلیں گی ؎

نُندہ گوپہ چھی گگر تہ پچھی　　نُندہ سہہ تے شال موسینے
نُندہ دراہم از تل و پچھے　　نُندہ زہ وِتے زچہ مو کھینے

حضرت شیخ جواباً عرض کرتے ہیں کہ میرے اور دیگر مخلوق کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے میں گپھا کو عالی شان محل تصور کروں گا اور خرقہ کو پشمینہ ملبوس، میں چوہوں سے طوطے سمجھ کر کھیلوں گا ساری عمر دو گھڑیاں خیال کروں گا۔" ؎

ماج گوپہ بہ وبندے لرے　　جندہ بہ وبندے پاٹی کاے
گگر ن بہ رازہ شوگن گِندے　　سارے عمر بہ وبندے گرڈاے

والدہ پھر بھی مُصر رہتی ہے کہ بیٹے اپنے گھر آ لیکن حضرت شیخؒ اُسے ان الفاظ میں اپنی طرف سے تسلی دیتے ہیں کہ مجھے یہاں پر بہت آرام ہے، تو بے فکر ہو کر گھر جا، میں کوئی بھی طعام و تناول نہیں کر سکتا" اب تو اپنے گھر چلا جا اور مجھے اپنے حال پر چھوڑ۔

ممتا ایک ایسا سمندر ہے جس کا کہیں کنارہ نہیں، وہ اُسے منواتی رہی اور دل گداز انداز سے کہتی رہی کہ تو دور مجھ سے اپنا مکھ چھپائے رہا۔ اپنے وجودِ منورہ کے درشن تو دے۔ گھر سے گوپہ بل چلا آیا، تو کیوں مجھ سے روٹھے رہا ؎

نُندہ بکرِ دورِ روُد ہَم وُٹھتھ　　نو رِ وُلِتھ ہاو تم پان
گرِ گوپہ بل آہم تُرلِتھ　　وُچھتہ روُشتھ روُد ہم کو

اِس کے جواب میں شیخ نورُالدین ولیؒ عرض کرتے ہیں، کہ تو مجھے زیادہ اصرار نہ کر تو یہ جان لے کہ دنیا فانی ہے اور نُند اِس عالمِ فانی سے چل بسا، مجھے بارگاہِ ایزدی سے صدا آئی ہے، میں اُسی میں محو ہوں، اب تو میری اُمید سے دامن چھوٹا، میں اِسی لیئے (تلاش حق کے خاطر) یک سو بیٹھا ہوں ؎

ماجے سُتے دِنم آزار نُنْد ہیے اَنْد مزار گو

مانہ دُنِیا تاوُنْ بازار بہتن گُنْیتھ رودُس تو

ماجے درگاہو دِیُتھم نِدا سَہ نِدا مُبے بِنْہ دد تو

ماجی ژہ مے بر میون مُدا بہتن گُنْیتھ رودُس تو

نفس امارہ کو اپنے بس میں کرنے کا مرحلہ حضرت نُند ریشیؒ نے طے کر لیا تھا اس لیئے وہ کسی طور دنیوی زندگی گزارنے کے لیئے راضی نہ ہوئے۔ وہ اپنی والدہ کو اس حقیقت سے آگاہ کرتے رہے کہ "میں دور بن جا کر تپسیا کرتا، اوپل ہاک اور کاسنی پر گزارہ کرتا، میں آئے غصے کو اگر ٹھنڈا کر سکتا تو جاودانی ہوتا، رہو اپنے بیگانے میں کوئی تمیز و تفاوت روا نہیں رکھے گا۔ وہی منزل کو جالیا، اُسی کا بیڑا پار ہے ؎

اَندوَن نیہہ تہ شپ ترِٛ ہا اَہْر کرِ ہا وُدپل ہاکس تہ ہنْدے

آمپر ژھ یوِد ژہتھ کرِ ہا نی یوِد کرِ ہا مرہا کنْدے

پرتہ پان تیس ہوِے دِینْدے سے بوِ سینْدے ترِ تہ آد

ترکِ لذات و نفس کُشی کی ایک اور مثال پیش کرنا بھی برمحل ہی ہوگا، جس میں حضرت شیخ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ اوپل ہاک و کاسنی کی لذت سے روحانی تازگی و سرمستی عطا ہوتی ہے، جو دودھ کے بدلے پانی متھے، اُس نے جنم ہی کیوں لیا؟ ؎

تیس ساد وُدپل ہاکس تہ ہنْدے سَہ زن سبزس گژھنْدے ژاد

دود تراوتھ آب ژھنْدے سَہ سمارس کنْدے زاد

والدۂ ماجدہ سدرہ موزح ایک دن بولی کہ جب تیرے نزدیک کھانا پینا مضر ہے تو مجھے وہ دودھ لوٹا دے جو تم نے مدتِ رضاعت کے دوران میری چھاتیوں سے پیا ہے حضرت شیخ ایک پتھر پر عصائے شریف رکھ دیتے ہیں جس سے دودھ جاری ہونے ہے والدہ اس واقعہ سے انگشت بدنداں رہتی ہے وہ پھر کہتی ہے کہ اس دودھ سے تیرا گوشت پوست بھی بنا ہے۔ حضرت شیخؒ کی پاک روح جسدِ خاکی کو چھوڑ کر اُس بڑن پر جا بیٹھی جو حضرت شیخؒ نے اپنے ہی مبارک ہاتھوں سے لگایا ہے اور جو آج چھ سو سال گزرنے کے بعد بھی شجرِ عرفان کی صورت ایستادہ ہے جب جان ڈھانچہ سدرہ موزح کے سامنے رہا۔ والدہ نے اُسے (روحِ حضرت شیخؒ کو) جسدِ خاکی میں آنے کے لئے اِس شرط پر اصرار کیا کہ اِس کے بعد اُس کی عارفانہ طریق میں کوئی مداخلت نہیں ہو گی۔

جب یہ سبھی حربے کارگر نہیں ہوئے تو سدرۂ موزح نے اپنی مامتا کے پیشِ نظر حضرت شیخؒ کے دو جگر پارے زون دید اور بابا حیدر کو اُٹھا کے وہاں غار پر رکھ چھوڑا۔ تاکہ حضرت شیخؒ کی شفقتِ پدری جوش میں آئے اور وہ دُنیوی زندگی کو اپنائے۔ جب وہ خود واپس ہوئیں تو حضرت شیخؒ اپنے نورِ چشم بابا حیدر سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ "اے بابا حیدر کچھ تو مانگ جس سے تو راضی ہو جائے، جس سے تمہارا دِل خوش ہو جائے" آج میری حالت (حالتِ روحانی و جدانی) شگفتہ تھی مشیتِ ایزدی نے دیکھئے کیسے گُل کھلائے ہے

بابہ حیدرہ کینژھا منگتو   تہٕ دِل چون گژھم راضی
اَز ادسُم پھولہٕ دِن رنگ تو   وُچھتہٕ حقہٕ سنز کیا کارسازی

معصوم بابا حیدر دیکھیے کس بات کی تمنا کرتا ہے صرف اپنے والد حضرت شیخؒ کے پہلو میں خوابِ شیرین کے چند لمحے۔ اللہ تبارک اللہ کسی پر اُس کی بساط سے باہر بوجھ نہیں ڈالتا اور بندوں کو بھی ایسا نہ کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر حضرت شیخؒ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے اُس کی بارگاہ میں دستِ سوال دراز کرتے ہیں کہ "اے اللہ مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ میں

اِن ننھے بچوں کو پال سکوں یہ تہی دست ہم تہی دستوں کی کوکھ سے کیوں پھوٹے، میرے یہ دو پھول دو جگر گوشے بھی لے لے اور انہیں جنت الفردوس عطا فرما" اتنا کہہ کر اُن کے اوپر اپنا خرقۂ مبارک ڈال دیا۔

بابہ کینژھا لوُتے کھیٚاو تو — یُتھنہ بنیہ کینہہ آسیہ میہ مٹھو
نِشہ پانس زوٗ لا یاد تو — اَز منے خودا صاب لوٗ ٹھو
دَ سیٚد پھا تتھ لو بم ننتہ — یم چھنہ کو چھنبن زاپے
یم کُٹری مٹیا نزگل ننکھہ — تُتھو سورگس کرتکھ جاے

دُعائے حضرت شیخؒ مستجاب ہوئی اور صبح تک اُن کے دونوں جگر گوشے بابا حیدر اور زوٗن دید اُن کے خرقۂ عرفان تلے واصلِ بحق ہوئے تھے حضرت شیخؒ کی والدہ ماجدہ اور اُن کی اہلیہ محترمہ یہ دیکھ کر زار و قطار رونے لگیں۔ حضرت شیخ نے خود ہی اُن کو غسل دیا اور تجہیز و تکفین کے فرائض انجام دیئے۔ وہ تختہ جس پر انہوں نے بابا حیدر اور زوٗن دید کو غسل آخیر دیا آج بھی کُرالہ ناگ کیموہ میں موجود ہے یہ دونوں شیخ سالار دین اور صدرہ موج کے پہلو میں دفن ہیں۔ اِس آستانِ فیض پناہ کو آج کل "صدرہ ماجہ ہنز" کے نام سے پکارتے ہیں۔

ازدواجی زندگی کسی بھی فرد کی شخصی زندگی کی بہت حد تک آئینہ دار ہوتی ہے صدرہ موج کی ممتا بالآخر مشیئتِ ایزدی کے آگے سرخم ہوتی۔ خوش بخت زَے دید بھی لاکھ جتن کرتی ہے کہ حضرت شیخ کسی طرح گرہستی زندگی اپنائیں کیونکہ وہ آخرت کے ساتھ ساتھ دنیوی زندگی گزارنے کی متمنی بھی تھی۔ لیکن وہ بھی آخرکار سب کچھ چھوڑ کر ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

عرفان و آگہی کا رستہ اختیار کر کے اُسی ایک اللہ کا دامن تھام لیتی ہے حضرت شیخؒ اور محترمہ زَے دید کا کلام (منظوم مکالمہ) خود ہی کئی باتوں کی نقاب کشائی کرے گا بہتر ہے کہ میں خود چپ ہی سادھ لوں

زَے دید:۔

ولسہ میانہ چھیٚے کھوان چوان — دارِ کرو وچھان گرو آلی آے
بہ چھس فکرس نہ ٹھارتن بیوان — دِ کھیٹہ رِ ز شیٚتہ رؤد ہم کو

"میری سکھیاں کھاتی پیتی ہیں، اور اپنے خاوندوں کی راہیں تکتی ہیں میں رنج و غم سے دل ہی دل میں گلی پگھلتی جا رہی ہوں تو مجھ سے کیوں روٹھا ہے"

ولسہ ہا ہنہ چھے واندرن پیٹھ رے   دلسہ چانہ لبس منز رے چھے

حضرت شیخ: ژ مہ شوبنے قیامتژ ہ نز رے   تن ہو ہتھ رو دس تو

"تمہاری سہیلیاں بندر، بندریا کا سنجوگ ہے، جو راہِ حق میں رکاوٹ بنا ہے، وہ قیامت کی کنیزیں ہوں تو بھلا! میں نے اسی لئے اپنے جسدِ خاکی کو نڈھال کر کے مٹا ڈالا۔"

زنہ دید: شیخہ ژ میانی بوز تو زآ ری   ترژاو تھ سآری اَ سنگے

کو ہمسطے آو نِکھ یآ ری   دیہتہ کھینہ بتہ بہ کس منگے

"اے شیخ میری فریاد تو سن، تم نے کیوں سبھی احباب و اقرباء سے رشتہ توڑا، تو بیوی کی محبت کیوں بھول بیٹھا میں نان و نفقہ کس سے مانگوں۔"

زے دید رود ہم گو پھر کیا میون لسن   آسمانس کھسن مٹے پیو

گرِ شوب رنگہ پین اسن   دیہتہ رو شہتہ رو دہم کو

"اے شیخ! تو غار نشین ہوا، میری زندگی کا مطلب جاتا رہا، گویا مجھے فضائے بسیط پھاندنا پڑا گھر کی رونق اپنے رنگ میں (زن و شوہر کے) خوش و خرم ہونے میں ہے۔"

زے سئے کر ژ آخرتس   پرمستس کیاہ منگہ سنے

حضرت شیخ نے حتمی: جاے کر بہہ نس بتس   تن ہو ہتھ رو دس تو

"زے! تو اپنے آخرت کو سنوار، اِدھر اُدھر بھٹکنے سے کیا حاصل دہیں اپنے نان و نفقہ کے خیال سے دامن چھڑا، میں نے اسی لئے اپنے جسدِ خاکی کو نڈھال کر کے مٹا ڈالا۔"

ابو الفقراء بابا نصیب الدین غازی حضرت شیخ نور الدین اور زے دید کے مکالمہ کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ زے دید حضرت شیخ کی فدوی کے رنگ میں اُبھرتی ہے جس

میں نسائیت و ایثار و خود سپردگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ لیکن وہ حیاتِ چند روزہ سے دنیوی طور بھی کما حقہ استفادہ کرنا چاہتی ہے۔ مگر حضرت شیخ اس امر کے قائل تھے کہ

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیاتِ دوام سوختن ناتمام

"زے دید" کے کہنے پر کہ تیری روزگار کی کوئی سبیل نہیں، ان بچوں کو کون پالے گا، حضرت شیخؒ نے اُسے کہا کہ تو کسی متمول شخص سے اپنا ازدواجی رشتہ جوڑ اور دُنیوی عیش و تنعم سے فیضیاب ہو جا لیکن "زے دید" حضرت شیخ کے قدموں میں رہ کر ہی جان دینا چاہتی ہے۔

بابا نصیب الدین غازیؒ کی عبارت من و عن پیش کرنا، دلچسپی سے خالی نہیں رہے گا۔

"اے رفیقِ رنج و راحت، و اے مونسِ گنجِ نعمت، تا حال از من ہیچ راحت نیافتی و آسائش نکردی۔ اکنوں بہتر آنست کہ مرا بگذاری و کنارہ گیری و خود را در عقدِ مردِ دُنیا داری و مالی دارے در آری، تا از نعمتِ دُنیا منفعت یابی راحت کنی و شادی کردی۔"

"زن (زے دید) گفت، اینچہ سخن است، کہ من ترا گزارم و دیگرے اختیار کنم و راحت دہم و نعمت خورم: نظم:

با تو مرا سوختن اندر عذاب
بہ کہ شدن با دگری در بہشت
اگر تو زخم زنی بہ کہ دیگرے مرہم
دگر تو زہر دہی بہ کہ دیگرے تریاق

حضرت شیخ پھر اصرار کرتے ہیں کہ مجھ سے اپنا دامن چھڑا، لیکن زے دید ایک روشن ضمیر و وفا شعار خاتون کی طرح اپنے کہے پر ڈٹی رہی کہ ایک ذرہ آفتاب سے دوری برداشت کرے تو کیسے

آفتابی از تو دوری چوں کنم
ذرہ ام بے تو صبوری چوں کنم
روئے بر خاکِ درت جاں میدہم
جان بر رنج اندراں میدہم
چند نالم بر درت دربازکن
یکدمم با خویشتن دمساز کن[1]

---

[1] نور نامہ، بابا نصیب الدین غازی۔ فوائد۔ ام

اِس کے باوجود بھی روایت ہے کہ زرے دید نے اسلام آباد میں حاکمِ وقت کے پاس نان و نفقہ کا مقدمہ دائر کیا تھا اور جب ۔ ۔ ۔

تازی پیادہ

جو بادشاہِ وقت کا کوتوال تھا اور بڑا دریدہ ذہن تھا استغاثہ کے نتیجہ میں حضرت شیخ کی گرفتاری کے لئے بھیج دیا گیا۔ وہ اُن سے ترشروئی سے پیش آیا اور چاہا کہ "از ضرب طمانچہ رخسار پاکش رنجہ سازد"۔ حضرت شیخؒ نے اُن پر نگاہِ قہر ڈالی جس سے اُس کا بازو رہ گیا اور اُس کے باقی اعضاء بھی شل ہو گئے۔ وہ حضرت شیخؒ سے عاجزی کرنے لگا اور اپنے کئے پر پشیمان ہوا۔ انہوں نے اُس کو نظرِ کرم کی اور وہ پھر سے ٹھیک ہو گیا۔ وہ انہیں کے ہاتھوں بابا تاج الدین کے نام سے ملقب ہو کر دائرۂ اسلام میں آیا اور بقیہ زندگی حضرت شیخؒ کی خدمت میں گزاری۔ تازی پیادہ کا حال دیکھ کر حضرت شیخؒ کے سسرال والے تھرا گئے۔ حضرت شیخؒ کے پائے مبارک کے چھونے سے راکھ کا ڈھیر طلائے احمر میں بدل گیا جس پر اُنکے سسرال والے بھی بڑے نادم ہوئے اور اُن سے معافی مانگی۔ بابا تاج الدینؒ کی زیارت ورتھیل میں ہے۔ حضرت شیخ گو پھپل کیٹوہ میں بارہ سال گوشہ نشین رہے، جس کے بعد وہ سارے کشمیر کو نورِ وحدت سے منور کرنے کو نکلے۔ اُن کی عارفانہ ذات کی تکمیل میں کن روحانی شخصیات کا دخل تھا۔ اِس کا اجمالی جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔

حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ

یہ وہی ذاتِ اقدس ہے کہ جن کے حُسنِ عمل اور حُسنِ تدبر سے حضرت شرف الدین بلبل شاہؒ کے تبلیغ و اشاعت اسلام کے مشن کو یہاں وہ مضبوط بنیاد فراہم ہوئی جس پر آگے چل کر نئے امتزاجی معاشرے کی عالی شان عمارت تعمیر ہوئی۔ جیسا کہ پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ پہلی بار اُس وقت واردِ کشمیر ہوئے جب حضرت شیخؒ بطنِ مادر ہی میں تھے اور آخری بار جب وہ یہاں سے واپسی پر ۷۸۶ھ میں پکھلی کے راستے سے جاتے ہوئے وفات پا گئے تو حضرت شیخؒ کا سن شریف

اُس وقت سات سال کا تھا۔ اِس لئے حضرتِ میر سیّد علی ہمدانیؒ سے اُن کی جسدی طور ملاقات قرینِ قیاس نہیں لگتی۔ بابا نصیب کے اوّلین رشی نامہ کے سہو کاتب نے یہ سبھی گُل کھلائے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرتِ میر سیّد علی ہمدانی جب دوسری بار کشمیر تشریف لائے تو وہ اِدھر اُدھر تبلیغی کام کے سِلسلے میں کیموہ بھی حضرت شیخؒ سے مِلنے پہنچے۔ حضرت امیر کے ساتھ غلام الدین موذّن بھی تھے اُن کے دِل میں حضرت شیخؒ سے اس طرح ملاقات کی خاطر آنے پر گوناگون خدشات اُبھرے اور پیچھے ہی رُکے۔ حضرت امیر آگئے اور غلام الدّین موذّن سے کہا کہ باطل اوہام کو دِل میں جگہ نہ دے حضرت شیخ کے وجود میں ایک ایسا سورج ہے جو مائل بہ رفعت ہے۔ ایک دِن ایسا آئیگا کہ تو اُس کا مرید بننے کی خواہش کرے گا۔ رشی نامہ بابا خلیل کی عبارت یوں ہے۔

"اے غلام الدّین ایں اوہام باطل را در دِل راہ مدہ، حقائق شناساں را بچشمِ حقارت نگریستن خود را در چاہ ضلالت انداختن است و ایں معصوم کہ نظرت حقیر نموُد خورشید اوج پذیر است، روزے خواہد بوُد کہ تمنائے مریدی وے خواہی کرد"۔

تُحفاتِ کُبرویہ کے مصنّف شیخ عبدالوہاب نوری لکھتے ہیں کہ بابا داود مشکواتی نے فرمایا کہ کاتب نے غلطی سے حضرتِ شیخ سے ملاقاتوں میں میر محمّد ہمدانی کی بجائے میر سیّد ہمدانی لکھا ہے"

"بابا داوُد مشکواتی قدس سرہ نیز گفتہ کہ مکالمۂ شیخ با میر مشہور است مُراد میر سیّد محمّد ہمدانی کہ تواریخ بداں متفق شدہ است و ابوالفقراء بابا نصیب الدّین غازی قدس سرہ در نور نامہ ہر جا کہ مجلسِ ایشاں نامزد کرد مُراد میر سیّد محمّد ہمدانیؒ است، مگر کہ کاتب سہو کردہ، کہ میر سیّد علی ہمدانیؒ نوشت"۔

اِس امر کی توثیق اِس بات سے بھی ہوتی ہے کہ موذّن غلام الدّین (جس کا ذکر اُوپر آیا ہے) بھی وہی ہیں جنہیں حضرت میر محمّد ہمدانیؒ نے روحانی تربیت کے لئے حضرت شیخ نورالدّین کے حوالہ کیا اور جنہوں نے طریق ریشیت اپنا کر نشاط میں گوشۂ نشینی اختیار کی۔ اُن کا مقبرہ بھی

نشاط باغ کے بالائی طبق میں ہے۔

حضرت سید حسین سمنانیؒ

حضرت سید حسین سمنانیؒ امیر سید علی ہمدانیؒ کے ارشاد سے یہاں کے سیاسی و ملکی حالات معلوم کرنے کے لیے ۷۷۳ھ میں وارد کشمیر ہوئے تھے۔ سید حسین سمنانیؒ اور سید تاج الدین حضرت میر شہاب الدین والد ماجد حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کے برادر زادہ سید محمد کی اولاد سے تھے۔ تاریخ کبیر کے مصنف حاجی محی الدین مسکین ذکرِ سادات میں رقمطراز ہیں کہ سید حسین سمنانیؒ امیر تیمور گورگانی کے عہد میں ۷۷۳ھ میں وارد کشمیر ہوئے۔ اُس وقت یہاں کی عنانِ حکومت سلطان شہاب الدین کے ہاتھ میں تھی۔۔۔

"در آں جناب از شہر سمنان، در ایامِ امیر تیمور گورگاں از قصبۂ سادماں ہجرت نمودہ مدتے بسر رسانیدہ، از آنجا در عہدِ سلطان شہاب الدین بشہور سنہ ہفتصد و ہفتاد و سہ بفرمانِ حضرت امیر قدس سرہٗ از راہ پیر پنچال دریں صوبہ نزول اجلال فرمود۔" یہ امر مسلّمہ ہے کہ سید حسین سمنانیؒ حضرت شیخؒ کے والد بزرگوار شیخ سالار دین کے مرشد تھے۔ حضرت شیخ سے بھی اُن کے مراسم تھے چنانچہ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری تاریخ کشمیر میں اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "با اکابرِ آں وقت مثلِ میر سید حسین سمنانیؒ و سامان البسیار محبت داشتہ"۔ انہوں نے یہاں آکر دریائے ویشو کے کنارے سکونت اختیار کی۔ صاحب کمال صوفی تھے۔ حضرت شیخ نور الدینؒ اُن کی صحبتِ بابرکات سے فیضیاب ہوتے رہے۔ حضرت بابا داؤد خاکیؒ اُس امر کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں ۔

شیخ سمنانی حسینؒ را نیز خدمت کردہ بود   پیر خویشش خواند در نظمِ خودش بے احتمال

حضرت سید حسین سمنانیؒ حضرت شیخ کا کلام سنتے تو اُن پر وجد و رقت کی حالت طاری ہوتی تھی خواجہ اعظم دیدہ مری اُن کے کمالات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ۔۔۔ آب و آتش در تصرفِ تسخیر

آں حضرت بود و کرامات بے غایات ظہور می نمود۔" ۱۱ ماہ شعبان ۸۲۵ھ کو واصل بحق ہوئے۔

سالِ وصلش ز روئے حُبِ طلبی　　زبدۂ خاندانِ آلِ نبیؐ

حضرت سید حسین سمنانیؒ کی زیارت فیض پناہ کولگام میں ہے اور اُن کے دیگر لواحقین کولگام کے متصل موضع آمنو میں عوام و خواص کے لئے باعث سکون و راحت قلب ہیں۔

حضرت شیخ نورالدین ولیؒ

ابتداء سلسلہ اویسی تھے

حضرت اویس قرنیؓ ایک صحابی کا نام ہے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نادیدہ فدوی اور تربیت یافتہ تھے، وہ یمن کے باشندے تھے۔ اویسی اُن بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام کو کہتے ہیں جن کے باطنی مرشد حضرت رسول اکرمؐ ہوں اور جو کسی اور مرشد سے کسب فیض حاصل نہ کریں۔ جب ہم حضرت شیخ نورالدین ولیؒ کے عارفانہ کمالات و باطنی مشاہدات کا مطالعہ کرتے ہیں تو اُن کے اویسی ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ اُن کے باطنی کمالات و روحانی مرتبہ کے پیشِ نظر وہ میر سید علی ہمدانیؒ، میر سید حسین سمنانیؒ، میر محمد ہمدانیؒ اور سید حالی بکھر پوری کی نظروں میں اعلیٰ و ارفع قدر و منزلت کے مالک تھے جس کی وجہ سے میر محمد ہمدانیؒ کے تربیت یافتہ باکمال خلیفہ بابا علام الدین طریق رشیت میں آئے۔ سید حالی بکھر پوری بھی اُن کے مریدوں میں شامل تھے بابا نصیب الدین غازیؒ اُن کے ہمہ جہت کمالات کا ذکر کرنے سے پہلے اُنہیں اویس ثانی بھی قرار دیتے:۔ "در صفت اویس ثانیؒ، در تفکر چوں بایزید بسطامیؒ در تربیت چوں جنید بغدادیؒ، در استقامت ابدال داوتاد"۔ حضرت بابا داؤد خاکیؒ (وفات ۹۹۴ھ) اپنے منظوم رشی نامے میں حضرت شیخ نورالدین ولیؒ کی رشیت کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں:

ریشیان ایں دیار اکثر اویسی بودہ اند　　چشمِ عبرت بیں آں را بودہ از غیب الکمال

۱۔ نور نامہ۔ بابا نصیب الدین غازی۔ ذیو۔۲۔

شیخ نورالدین ریشی پیرِ جمعِ ریشیاں　　زاہدِ خوش بود با حق داشت بسیار اشتغال

بود با تجرید و تفرید اہل صوم و دہر نیز　　تارکِ لحم و عسل سیر و بصل بسیار سال

صاحبِ کشف و کرامت بود نطقی خوب داشت　　ہم اویسی بود گفت ایں راوئی صاحب مقال

شیخ بام الدین و زین الدین ریشی میشدند　　ہند از و بگرفتہ عزلت گیر در بیجنے خیال

مقامات نور کی طالبانہ و عاجزانہ سیاحت سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بابا نصیب الدین غازی کے اِس شعر کو رہنما تصور کیا جائے ؎

شیخ نورالدین کہ نور از خاکِ او آید بروں

فیض گوناگوں زِ روحِ پاکِ او آید بروں

سیر و سیاحت :-

عمر ہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ ناز یک دانائے راز آید بروں

حضرت شیخ نورالدین نورانیؒ تیس سال کی عمر میں ترک لذات و ترکِ علائق کر کے شہمارِ منگ
دگو پھل کیمنگ غارِ عرفان میں بارہ سال گوشہ نشین رہے، جس کے دوران اُن پر بقول مولانا رومؒ خشوع
و خضوع کی یہ حالت طاری رہی کہ ؎

بخدا خبر ندارم چو نماز می گزارم
کہ تمام شد رکوعے کہ امام شد فلانے

یہی وہ مقام ہے جب خالق و مخلوق کے درمیان سبھی پردے اٹھ جاتے ہیں اور بُعدِ زمانی و بُعدِ
مکانی کے جملہ مراحل طے ہونے کے بعد حقیقتِ مطلق کا عرفان حاصل ہوتا ہے حضرت شیخ کی خلوت
نشینی فراریت، رہبانیت یا زندگی سے گریز نہیں تھی، اُن کی گوشہ نشینی و خلوت گزینی گریز برائے
زندگی کی ایک اعلیٰ ترین علامت ثابت ہوئی، جس سے ہماری زبان کے عارفانہ نغمے پھوٹے
اور ہمیں ایک امتزاجی تہذیب کے نمائندہ قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کی ضمانت حاصل ہوئی۔
خارجی و باطنی کشمکش سے حضرت شیخ ممبوہ، گوپھل ہی میں آزاد ہوئے اور وہ ایک عارفِ حقیقی
کی طرح ہر آزمائش میں پورے اترے۔ انہوں نے جملہ علائق ترک کر کے عرفانِ ذات و مالکِ
کائنات سے لو لگائی۔ انہوں نے ازدواجی تعلقات سے رشتہ توڑا، ماں کی ممتا یا پدرانہ شفقت
اُن کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں بنی۔ اُن کی دعاؤں میں اثر تھا، مشیت ایزدی تھی جس سے انہیں

دو جگر پاروں فرزندِ ارجمند بابا حیدر اور دخترِ نیک اختر، نِذان دید سے بھی مفارقت ملی۔ اُن کی والدہ ماجدہ سدرہ موزح اور اہلیہ محترمہ زرے دید کو اُن کے آہنی عزم و روحانی کمالات کو دیکھ کر مزاحمت ترک کر کے آہنیں کے راستے پہ گامزن ہونا پڑا۔ حضرت شیخؒ اور اُن کے والدِ بزرگوار کے درمیان اِس ضمن میں کوئی مکالمہ یا مباحثہ نہیں۔ اِس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں اوّل یہ کہ وہ خود بھی راہِ عرفانِ حقیقی کے رہرو تھے اور زہد و اتقا کی زندگی گزارتے تھے، جس کی وجہ سے اُن کی شفقتِ پدری بھی حضرت شیخؒ کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں بنی۔ دوم یہ کہ وہ شیخ نورالدین ولیؒ کی بادیہ پیمائی و گوشہ نشینی سے بہت پہلے انتقال فرما گئے ہوں، جس کی بناء پر ابتدائی ایّام کے بعد حیاتِ شیخ میں اُن کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر ہے۔

حسنِ فطرت کی فراوانی سے خطۂ کشمیر اگلے وقتوں سے شعراء کی خیال آفرینی کا مرکز رہا ہے۔ سنت صوفی اور رشی اِسے گوشۂ عافیت تصوّر کرتے رہے اور وہ وجدان و عرفانِ الٰہی کے لئے دامنِ کوہ و دشت و جبل کی آغوش میں خلوت گاہوں اور گپھاؤں کو گوشہ نشینی کے لیے منتخب کرتے آئے ہیں، یہ بات صرف کشمیر ہی کے لئے مخصوص نہیں، گپھاؤں اور غاروں کا چلن انسانی تہذیب کے مختلف مدارج میں نہایت ہی اہم رہا ہے۔ ختم المرسلین حضرت محمدؐ پر غارِ حرا میں ہی قرآن نازل ہوا۔ اور ہجرت کے وقت انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کی رفاقت میں غارِ ثور میں پناہ لی۔ اصحاب کہف کا حال کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اِس کے علاوہ گپھائیں ہماری قدیم تہذیب و تمدن کی نمائندہ علامتیں ہیں۔ اِس سلسلے اجنتا اور ایلورا کی گپھاؤں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ دور کیوں جائیے یہاں کشمیر میں بیروہ، تمہ زو یا امرناتھ کی گپھائیں اس امر کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں، حسنِ اتفاق دیکھئے کہ جملہ رشیوں اور منیوں نے بلند و ارفع مقامات کو گوشۂ خلوت و عافیت کی سربلندی بخشی۔ کیموہ کی گپھا اِس کے برعکس ویشو کے کنارے بائیں علاقے میں واقع ہے یہ سارا علاقہ آج بھی سیلاب کی زد میں آتا رہتا ہے جس کے دوران غارِ علمدار

کیموہ کی چھت سے پانی رِستا رہتا ہے جیسا کہ پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے۔ حضرت شیخ نورالدین نورانی ۷۷۹ھ (م: ۱۳۷۸ء) میں پیدا ہوئے۔ تیرہ سال کی عمر یعنی ۷۹۱ھ میں انہوں نے ترکِ علائق و ترکِ لذات کر کے شہمار ٹینگ گوپہ پل میں غار کھدوا کے گوشہ نشینی اختیار کی۔ اس طرح اِس غار عرفان ہونیکا بلند مقام حاصل ہے جو سیاحت تہذیب لین دین میں کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ حضرتِ شیخ مقاماتِ سلوک طے کرنے کے بعد بقیہ کشمیر کو عرفانِ نورِ حق کی ضیا باریوں سے فیضیاب کرنے کے لئے بارہ سال خلوت گزین رہنے کے بعد ۸۰۳ھ میں ابرِ رحمت بن کر وادیٔ نارہ واد (موجودہ نور آباد) پر برسنے کے لئے رختِ سفر باندھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرتِ شیخ کے جملہ احباب خانہ اُسی وقت اللہ کو پیارے ہوئے تھے جب وہ نورِ وحدت و نورِ حق کو عام کرنے کی خاطر کیموہ سے چل دیئے۔ اِس سے پہلے کہ ہم مقام نورِ اوّل سے مقامِ نورِ دوم کے لئے رختِ سفر باندھیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ سے وابستہ کیموہ کے مختلف مقامات کا اجمالاً ذکر کیا جائے تاکہ اُن کے یہ نقوش ہمیشہ زمانے کی دست بُرد سے محفوظ رہ سکیں۔

زیارت کیموہ

یہاں حضرت کے والدِ بزرگوار شیخ سالار الدین، اُنکی والدہ محترمہ سدرہ موج اہلیہ محترمہ زرے دید اور اُن کے دو جگر گوشے فرزندار جمند بابا حیدر اور دختر نیک اختر زون دید آسودہ ہیں۔ یہاں ہر سال ۲۶ شوال کو میلہ لگتا ہے۔ یہ زیارت پگوڈہ فنِ تعمیر کا نمونہ ہے اور کیموہ کی جامع مسجد کے سامنے واقع ہے جسے مقامی روایت کے مطابق بابا داؤد خاکی نے تعمیر کرایا ہے۔

چھپل سدرہ موج

اِس چھپل سے ندرُو برآمد ہوتے تھے، جو بڑے لذیز ہوتے ہوتے تھے اور جن پر ہلدی کا رنگ نہیں جمتا تھا۔ امتدادِ زمانہ سے یہ اب بہت تنگ ہو گئی ہے لیکن اِس کے آثار اب بھی موجود ہیں۔

فکرِ ٹینگ

چنار کے سایے تلے چبوترے کی شکل کا قطعہ ارضی جہاں حضرتِ شیخ گوشہ نشین ہونے سے پہلے عبادتِ الٰہی میں محو تھے۔

پُش پتُل روایت ہے کہ یہاں بابا بام الدینؒ (بُمہ ساد) کے والد اُتن پنڈت کا مسکن تھا وہ بُت بھی تراشتے تھے اور بُت تراشی میں کمال رکھتے تھے۔ یہاں سے کچھ سال پہلے مورتیاں برآمد ہوئی ہیں جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہاں پہلے ہندو آباد تھے جو بعد میں دائرہ اسلام میں آئے۔ اُتن پنڈت کیموہ سے بُمہ زُو چلا آیا جہاں بُت تراشی کے لئے وافر مقدار میں پتھر مہیا ہو سکتے تھے۔ بابا بام الدینؒ (بُمہ سلد) کی زیارت بھی یہیں یعنی بُمہ زو میں ہے۔

جُلاہے کا کھیت (وووُر کُنار) یہ جگہ گوہ پل کے قریب واقع ہے یہی وہ جگہ ہے جہاں حضرت شیخؒ کو جُلاہے کا کام سیکھنے کے لئے جُلاہے کے گھر چھوڑ دیا گیا تھا۔ وہ یہ کام اِس لئے نہ سیکھ سکے تھے کہ وہ رہبرِ عالمِ بالا تھے دُنیا کو مقدم کیسے سمجھتے۔

چشمۂ غسل (مانجہ ناگ) یہ چشمہ صحنِ زیارت میں ہے اِس کی لمبائی بارہ فٹ اور چوڑائی ۹ فٹ ہے اِسی چشمے میں وہ تختہ چوبیں بھی ہے جس پر حضرت شیخؒ نے بابا حیدرؒ اور زُون دید کو غسل دیا تھا۔

تبرکات ایک پھرن جو حضرت سیّد حسین سمنانیؒ نے حضرت شیخؒ کو عطا فرمایا تھا دودھ پینے کا چوبیں پیالہ، کاسنی کوٹنے کی اوکھلی اور موسل اور عصائے حضرت شیخؒ۔

مقام نور، دوم زُمر یہی وہ اوّلین مقام ہے جہاں حضرت شیخ نورالدینؒ ولیؒ کیموہ میں غار نشینی کے بارہ سال اور عمر کے تیس سال گزار کر خلوت گاہِ رُوپوں میں ایک سال ٹھہرے۔ یہاں بھی اُن کی زیارت گاہ ہے، نور آباد کا یہ قطعہ زمین اتنا پُر سکون اور پُر سکوت ہے کہ علامہ اقبال کا یہ شعر بے ساختہ زبان پر آتا ہے ؎

شورش سے بھاگتا ہوں دِل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقدیر بھی فدا ہو

اور حضرت شیخ کے سکوت وسکون آگہی سے خود نگری وخدا شناسی کے وہ سوتے چھوٹے جو تا ابد اُبلتے رہیں گے۔ حضرت شیخ نے کہیں اپنا ٹھکانا نہ بنایا۔ وہ مراز کے انتہائی بالائی گوشے سے کمراز کی سیاحی کو چلے۔ جہاں جہاں وہ گئے ہیں رشی ناموں کے مطابق ان میں پرگنہ کرہن، پٹن، پندر ہردم شامل ہیں۔ کمراز کی سیاحت عرفان کا زمانہ ۱۳۱۲ء کے لگ بھگ ہے

موکھتہ تل

کمراز سے لوٹنے کے بعد حضرت شیخ موکھتہ تل (موکھتہ پوکھری) سرینگر پہنچے۔ یہاں انہوں نے خلوت گزینی کا ایک سال کاٹا۔ یہاں حضرت شیخ کی زیارت گاہ بھی موجود ہے یہی وہ مقام ہے جہاں رقاصۂ ایاں وزد لولی عرف یاون متر ان کے خلفاء میں شامل ہوئی اور دائرہ اسلام میں آئی۔

لولی عرف یاون متر کون تھی؟

اشہ بر میں ایک خدا رسیدہ سادھو رہتا تھا، جس کی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی۔ شہزادۂ وقت اس سے ملنے کے لئے اشہ بر اس کی چوکھٹ پر حاضر ہو جاتا ہے سادھو نے بڑی بے اعتنائی برتی۔ شہزادے کو بے نیل و مرام واپس لوٹنا پڑا۔ اس کے دل میں سادھو کے انتقام کا جذبہ موجزن ہوا۔ اس لئے اس نے رقاصہ وقت شنگھ بی بی (لولی) عرف یاون متر (مستِ شباب) کو زر کثیر دے، کر سادھو کا گیان غارت کرنے کے لئے آمادہ کیا۔ وزد ایان دتو بہ تمکن رقاصہ بن ٹھن کے سادھو کے یہاں پہنچی۔ مستِ شباب رقصاں شنگھ بی بی کی ہمجولیوں نے نغمہائے عشق شباب چھیڑے اور سازندوں نے سُر دے کر ایک قیامت بپا کی۔ ساری فضا پر جادو چھا گیا۔ سادھو کی کُٹیا کا در زہد کھلتا گیا۔ اب اس کے سامنے اولی ہمہ عشق وہ پائے گوناگوں ہوتا تھا لہریں اٹھتی تھیں، گیان جی ڈر لی ہوتا انکھیں۔ رقاصۂ مستِ شباب کی آنکھوں سے نظروں کے جام انڈھاتی رہیں یہاں تک زہد کے سبھی پردے اٹھ گئے اور وہ حسن زیبا دزد کی باہوں میں پہنچا۔ حضرت شیخ ان دنوں موکھتہ تل (رتنوار ناگ) میں خلوت

گزین تھے۔ شہزادہ وقت حضرت شیخؒ کا بڑا مداح تھا بما دھو کے چیلوں نے منصوبہ بنایا کہ انتقامی جذبہ کا نشانہ انہیں کو بنایا جائے۔ انہوں نے رقاصۂ مست شباب شنگھ بی بی کو بڑی رقم دے کر حضرت شیخؒ کی خدمت میں جا کر ان کو ابتلائے ہوس کا نشانہ بنانے کے لئے آمادہ کیا۔ ابھی وہ سولہ سنگار کر کے آمادۂ رقص ہو رہی تھی کہ اس کی ہمجولیاں سازندروں کے معیت میں سراسیمگی کی حالت میں رفو چکر ہو گئیں۔ مست شباب رقاصہ سہم گئی کہ یہ کیا عالم ہے۔ کسی نے اس کے آئینہ لا کے دیا۔ وہ کیا دیکھتی ہے کہ اس کے سبھی بال سفید ہو گئے ہیں اور اس کے سندر مکھڑے پر جھریوں کا جال پھیلا ہے۔ عنفوان شباب خزاں دیدہ شیب کا پیکر بنا تھا۔ اس نے آہ و فغاں شروع کی۔ اپنے کئے پر نادم ہو کر حضرت شیخؒ کے پاؤں پڑی۔ ان کا ابر کرم جوش پہ آیا خزاں دیدہ حسن فصل گل کی طرح کھل اٹھا۔ اب اس کا حسن خداداد غارت گر ایماں نہیں زہد و تقویٰ کا پیکر تھا۔ اس واقعہ کے بعد شنگھ بی بی دائرۂ اسلام میں آئی اور حضرت شیخ العالمؒ کی خادماؤں میں شامل ہوئی۔ ازاں بعد شنگھ بی بی تادم حیات شیخؒ کے حلقۂ خدمت میں رہی۔ شنگھ بی بی کا مدفن چرار شریف میں مرقد حضرت شیخؒ کے قدموں میں ہے۔ حضرت شیخؒ نے واقعہ شنگھ بی بی کے دوران اس مست شباب سے ایک نظم مخاطب ہو کے کہی تھی۔ یہ نظم طویل ہے اور اس کا عنوان ہے۔ "پیکھ پائس یاد ن مُرِ کا" اے مست شباب! تو باز آئے گی ضرور۔"

حضرت میر محمد ہمدانیؒ

سلطان سکندر کے عہد کا اہم ترین واقعہ میر سید علی ہمدانیؒ کے فرزند ارجمند میر محمد ہمدانیؒ کا ورود مسعود ہے وہ بائیس سال کی عمر پا چکے تھے کہ ۱۳۹۳ء میں کشمیر پہنچے۔ ان کے ہمراہ ان کے رفقاء و احباب بھی تھے۔ اس وقت وہ علوم ظاہری و باطنی میں کمال حاصل کر چکے تھے۔ سلطان سکندر نے ان کا پرتپاک استقبال کیا۔ اپنے والد بزرگوار کی وصیت کے مطابق انہیں حضرت شیخ نورالدین ولیؒ سے ملنا ضروری تھا۔ یہ وصیت نامہ سن بلوغ کو پہنچنے پر سید

قوام الدین نے اُنہیں دکھایا۔ جب حضرت شیخ نورالدین ولیؒ کو حضرتِ میر محمد ہمدانیؒ کے آمد کا پتہ چلا تو اُنہوں نے تاریخ کہی کاشرن ییراہ آو" (۷۹۶ھ) مورخ حسن نے حضرتِ میر محمد ہمدانیؒ کے سنِ وردِ کشمیر کو یوں باندھا ہے ؎

حسن گفت تاریخ تشریفِ او مبارک امیر کبیر آمدہ (۷۹۶ھ)

واقعات کشمیر کے مصنف خواجہ اعظم دیدہ مری لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ میر محمد ہمدانیؒ سے دوبار ملے اور اُن جملہ باطنی کمالات کے قائل ہوئے "ملاقاتِ مقربِ سبحانی حضرتِ میر محمد ہمدانیؒ مکرر کردہ و حضرتِ میر قائل بہ کمالاتش شدند و تحسین نمودند"۔

حضرت شیخ نورالدین ولیؒ کی حضرت میر محمد ہمدانیؒ سے ملاقات کے وقت اُنکے چار خلفائے باکمال بابا بام الدینؒ، بابا زین الدینؒ، بابا عبدالطیفؒ اور بابا نصرالدینؒ کے علاوہ دہستا بی بی اور بہت بی بی بھی حاضر تھیں۔ یہ ملاقات کئی مراحل سے گزری جس میں سوال و جواب، امتحان و کشف و کرامات شامل ہیں۔ مورخ سید علی نے تفصیل سے بابا داؤد مشکوتی کے حوالہ سے لکھا ہے "حاجی بابا ادھمی آوردہ در تصنیف خود کہ حضرتِ میر شیخ را امتحان کردہ کہ دربابِ حلقہ کوزۂ شیر گاو عنایت فرمودہ اند۔ اما بدانیم کہ شیخ بمقامِ انکسار راطی کردہ۔ آخر معلوم شد کہ بہ کمال رسیدہ بود حضرت شیخ را فرمودہ تا این عنایت از شما ہیچ یکی فیضی بر داشتہ۔ حضرتِ شیخ بعرض رسانیدہ یا حضرت چہار کس در عبادتِ حق و در طریقِ اسلام در آمدہ حتی المقدور ریاضت می کنند اول بابا بام الدینؒ دوم بابا زین الدینؒ، سوم بابا عبدالطیفؒ، چہارم بابا نصرالدینؒ حضرت آں ہر چہار کس را دیدہ ہمہ مرتاض و صاحب کرامات بودہ اند۔"

وہ مزید لکھتے ہیں میر محمد ہمدانیؒ سلطان سکندر کے دورِ حکومت کے دوران ۷۹۶ھ میں قدم رنجِ کشمیر ہوئے۔ وہ شاہی مہمان رہے اور اُنہی کے ایماء پر خانقاہِ معلیٰ کی تعمیر شروع ہوئی جو ۷۹۸ھ میں تکمیل کو پہنچی۔ اُنہوں نے سلطان سکندر کے وقف نامے

اور مولانا محمد سعید کے نام تولیت نامے کا ذکر بھی کیا ہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت شیخؒ حضرت میر محمد ہمدانیؒ سے ملے اور اُن کے مرید ہو کر کبیروی سلسلے میں شامل ہوئے۔ حضرت شیخؒ سے ملاقات کی خاطر جانا اُن کے رفقا کو گراں گزرا وہ بادل ناخواستہ اُن کے ہمراہ جا رہے تھے۔ انہوں نے دل ہی دل میں سوچا کہ اگر وہ گوشہ نشین باکمال صوفی ہوگا تو وہ ہمارا استقبال کرے گا۔ حضرت شیخؒ کو باطنی طور اُن کی آمد کا پتہ چلا اور اُن کے سواگت کرنے کو آئے۔ سلامِ مسنون عرض کر کے فرمایا ؎

چاؤ کس کرمانا چھکھ پیرن مینہ دلما   ژے پیٹھ کرژ زِ کلہ قربان چھکھ ہن امیر ہمدانا

"تیرا مرتبہ سب سے اعلیٰ۔ اے مرشدوں کے مرشد، یہ جان، یہ سر قربان ہو تم پر، اے امیر ہمدانؒ کے فرزند"۔ حضرت میر محمد ہمدانیؒ کے رفقاء یہ دو کرامتیں دیکھ کر مبہوت ہو کر بیٹھے۔ اس کے بعد حضرت شیخؒ اُن کے خلفاء اور حضرت میر محمد ہمدانیؒ کے درمیان ایک طویل مکالمہ بھی ہوتا ہے جس سے وہ کافی متاثر ہوئے اور حاضرین مجلس سے یوں گویا ہوئے کہ حضرت شیخ ولی ہیں اور اِن کی ریاضت بے مثال ہے"۔ حضرت سید کا حاضرانِ مجلس فرمود کہ مرتبۂ شیخ است بہ مرتبہ اولیاءِ اکمل در ریاضتی کہ شیخ کشیدہ ہیچ کسے نمی تواند کشید"۔

حضرت میر محمد ہمدانیؒ کشمیر میں بائیس سال رہنے کے بعد ۱۴۱۵ء میں زیارت بیت اللہ کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ اُنہوں نے ۱۵ ، رجب ۸۱۴ھ (م: ۱۴۱۱ء) کو حضرت شیخ نور الدین ولیؒ کو خط ارشاد عطا کر کے اُن کے ولی اکمل ہونے پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ یہ پہلی تاریخی دستاویز ہے جس پر حضرت شیخ نور الدین ولیؒ اور میر محمد ہمدانیؒ کے دستخط ہونے کے علاوہ سلطان سکندر کی مہر بھی ثبت ہے۔ آج تک یہ غلط فہمی پیدا کی گئی تھی کہ یہ خطِ نستعلیق

۱؎ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ میر محمد ہمدانیؒ کشمیر میں صرف بارہ سال رہے جو صحیح نہیں کیونکہ اُن کی واپسی کا سن پھر ۱۴۱۵ء بنتا ہے۔ خط الارشاد کی تاریخی حیثیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اس لئے بائیس سال قیام ہی بالکل صحیح ثابت ہوتا ہے۔

میں ہے، لیکن علماء و فضلاء کی ایک میٹنگ میں (جو کلچرل اکیڈمی کے دفتر پر ہوئی) اس کی نشاندہی ہوئی، جس سے یہ ثابت ہوا کہ خطِ نسخ میں ہے جسے تاریخی دستاویز اور بھی باطل شکن ثابت ہوئی کیونکہ خط نسخ کا رواج شاہمیری دور ہی سے ہوتا ہے۔

خطِ ارشاد سے کئی اہم نکات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اوّل یہ کہ حضرت شیخؒ نے خود ہی حضرت میر محمد ہمدانیؒ سے اس کے مرحمت فرمانے کے لئے التجا کی ہے۔ دوم یہ کہ حضرت شیخ نورالدین چھبیس سال کی عمر میں کبروی سلسلے میں داخل ہوئے ہیں۔ سوئم یہ کہ سادات ہمدانیہ ہر کس و ناکس کو سلسلۂ کبرویہ میں شمولیت اجازت نہیں دیتے تھے۔ چہارم یہ کہ زہد و اتقا کا مقامی طریق ہی برقرار رہا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خطِ ارشاد کو من و عن اردو ترجمہ کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کیا جائے تاکہ عقیدتمندانِ شیخ و سادات کو طمانیتِ قلب نصیب ہو۔

لہ گلریز - جلد - ۱ - نمبر - ۲ - دسمبر ۱۹۷۲ء -

میں الحاج مرزا غلام حسن بیگ کا نہایت ہی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے خطِ ارشاد نقل کرنے کیلئے رسالۂ "گلریز" کا فائل مرحمت فرمایا۔

رسول پومپر

خطِ ارشاد

وَاعلَم اَنّ البیعۃَ مِن سُنَنِ الاَنبیاءِ علیہم السَّلام ومن الخُلفاءِ الرَّاشدِینَ المہدیّینَ وہی باقٍ الی یومِ القیٰمۃِ بلا نکیرٍ فلا یجوزُ لِاحدٍ مِن الاولیاءِ والعُلماءِ اِدّعاءُ الخلافۃِ بلا الرّخصۃِ والبیعۃِ باختیارِہٖ اِلّا اَن یکونَ لہُ الرُّخصۃُ مِن الشَّیخِ الذی یکونُ ماذونًا ومرخّصًا بالتّحقیقِ مِن الشّیخ العاملِ الکاملِ الی نبیّنا صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم

بسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحیم

الحمدُ للّٰہِ الّذی وفّقنا وسائرَ العبادِ بِاتّباعِ طریقِ الہُدیٰ وحفِظنا وجمیعَ الاخیارِ الابرارِ مِن اقتداءِ اہلِ البدعِ والہویٰ وبلّغنا وطوائفَ المخلصینَ المحبّینَ الیٰ اقصی المراتبِ ہی المعرفۃُ الکبریٰ والصّلوٰۃُ والسّلامُ

على رسوله ونبيه وصفيه محمد المصطفى وعلى آله الذين
محبتهم وسيلة للسعادة العظمى والدولة الاعلى واصحابه
الذين كالنجوم بأيهم اقتدينا اهتدينا فيقول العبد
الضعيف النحيف الجاني كثير التقصير والتواني محمد بن
علي ابن شهاب الدين الهمداني عفى الله عنه بالفيض الصمداني
اعلم ان المقصود من خلقة الانسان معرفة الله تعالى سبحانه
كما يشهد بعض الآيات الكريمة والاحاديث القدسية
والاخبار الشريفة والآثار اللطيفة فالواجب على كل
فرد من افراد الانسان ان يسعى لما خلق له والطرق
الى الله تعالى مما لا تعد ولا تحصى لقوله عليه
افضل الصلوات واكمل التحيات الطرق الى الله تعالى
بعدد انفاس الخلائق ومن اقربها طريق العلية العالية
الشريفة الكبروية الهمدانية الحسينية الذهبية
الذي حل علي والدي علي الهمداني قدس الله سره
السبحاني كما دل وهدى عليه المشائخ الذين اجازوه

بالارشاد وهم ثلثة وثلثون كلهم من اكابرهم
وبعد فان الاخ الصالح العارف الكاشف المجاهد
المشاهد المسمّى بنور الدين ريشي الكشميري
الزاهد العابد اصلحه الله كما اصلح الصالحين
العارفين واحسنه الله كما احسن الواصلين
الكاملين فلما جاوز عن حدّ الالحاح وعجز كثيرا
بلسانه ان يدخل في السلسلة العاشقين الكاملين
المكمّلين كما ادخل اسوة جماهير المبتدعين
والمنتهيين فاجزته بنوبة المريدين وبيعتهم
وترغيب الطالبين السالكين وتربيتهم وتعليم
الاذكار كاربع الضروب لتصقيل القلب عن كدورات
المكائد والكروب واخذ النذورات والفتوحات
وجلوس الخلوات الدائم كالاربعينات القائم
وسائر ما يجب ويستحب في هذا الطريق العالية
السادات وسيله ان لا ينساني في الاوقات الشريفة

اَلمَرْجُوَّةِ بِالدَّعَوَاتِ بَعْدَ الاَقْوَالِ وَالاَشْغَالِ قَدْ حُرِّرَتْ
هٰذَا فِي لَيْلَةِ الجُمُعَةِ خَامِسَ عَشَرَ مِنْ شَهْرِ رَجَبِ المُرَجَّبِ
سَنَةَ اَرْبَعَ عَشَرَ وَثَمَانَ مِأَةٍ فِي بَلْدَةِ الْكَشْمِيْرِ
صَانَهَا اللهُ تَعَالىٰ مَعَ سُكَّانِهَا عَنِ الآفَاتِ وَالتَّدْمِيْرِ

مُهْرِ مُحَمَّد هَمَدَانِي

تو جان لے کہ بیشک بیعت انبیا علیہم السلام و خلفا الراشدین المہدیین کی سنت سے ہے اور یہ سنت قیامت کے دن تک بلا تغیر باقی رہے گی۔ پس اولیا اور علما میں سے کسی کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے اختیار سے بلا اجازت و بیعت خلافت (آلہیہ) کا دعویٰ کرے جب تک کہ اس کو ایسے ایک پیر کامل سے اجازت نہ ہو جو کہ حقیقی معنوں میں ایک ایسے مرشد سے اذن پا چکا ہو اور اجازت یافتہ ہو جس کا سلسلہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک مسلسل رہا ہو۔

۹۰۹ھ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور بخشنے والا ہے۔

سارے ثنا و شکر اس ذات باری کے لئے ہیں جس نے ہمیں اور سارے (نیک) بندوں کو راہ ہدایت کی پیروی کی توفیق عطا فرمائی۔ اور ہم کو نیز تمام نیک اور برگزیدہ بندوں کو اہل بدعت اور اہل ہوا کی اقتدا سے بچایا اور ہمیں نیز مخلصوں اور محبوں کے گروہوں کو ان بلند ترین مرتبوں پر پہنچا دیا جن مراتب کا نچوڑ معرفت کبریٰ ہے اور درود و سلام ہو اس کے رسول۔ اور اس کے نبی اور اس کے صفی حضرت محمد مصطفےٰ پر (صلعم) اور ان کی اولاد پر جن کی مودت بڑی نیک بختی اور اعلیٰ (روحانی) حکومت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور اُن کے اُن ساتھیوں پر جو کہ فلک روحانیت کے کوکب تاباں ہیں۔ اور جن کی اقتدا سے ہم ہدایت پا چکے ہیں۔ امابعد جو ضعیف نحیف خطا کار اور سراپا تقصیر ہے وہ محمد بن علی بن شہاب الدین ہمدانی ہے

خدا اس کو اپنی خاص عنایتوں سے نوازے لکھتا ہے کہ:۔ جان لے کہ انسان کی پیدائش کا مدعا و مقصد
خدائے پاک کی معرفت ہے جیسا کہ بعض آیات کریمہ احادیث قدسیہ اقوال نبویہ
اور پاکیزہ تواریخ شاہد ہیں پس بنی نوع انسان میں سے ہر ایک کے لیئے لازم ہے کہ وہ اس مقصد
کے لیئے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے جد وجہد کرے اور چونکہ خدا کی طرف چلنے والی راہیں لا تعداد
اور بے شمار ہیں جیسا کہ آنحضور علیہ افضل الصلوات واکمل التحیات نے فرمایا ہے اور اللہ کی طرف رہنمائی
کرنے والی راہیں مخلوقات کے سانسوں کی تعداد کے برابر ہیں" اور ان میں سے قریب ترین طریقہ
علیہ عالیہ شریفہ کبرویہ ہمدانیہ حسینیہ مذہبیہ ہے جس کی رہبری مجھے میرے والد علی ہمدانی قدس اللہ
سرہ الصمدانی نے کی جیسا کہ اس راہ پر ان مشائخ نے ان کی رہنمائی کی جنہوں نے ان کو ارشاد کی اجازت
بخشی اور جن کے اکابر کی تعداد ۳۳ ہے بعد ازاں یہ کہ میرے بھائی المسمی نور الدین رشی کشمیری نے جو کہ صالح
عارف، صاحب کشف و مجاہدہ و مشاہدہ ہیں اور جو زاہد بھی ہیں اور عابد بھی (خدا ان کو صالحین اور
عارفین کی طرح اصلاح کرے اور واصلین اور کاملین کی طرح ان کو ممنون احسان رکھے) اصرار
کی حدود سے آگے بڑھ کر زبان حال سے عاجزی کی کہ وہ سلسلۂ عشاق الکاملین المکملین میں
داخل ہو جائیں جیسا کہ تمام (علم معرفت کی) بلندی اور اس علم کے انتہا پر پہنچنے والے داخل ہو چکے
ہیں پس میں نے ان کو اجازت دی کہ وہ ارادتمندوں کو توبہ کرائیں ان سے بیعت لیں اور راہ
ہدایت کے طالبوں اور اس راہ پر چلنے والوں کو ترغیب دیں اور تربیت بہم پہونچائیں اور ان
(اذکار مثلاً ذکر چار ضرب) کی تعلیم کریں جو کہ ان کے دلوں کو مکاریوں اور (دیگر) دشواریوں کے
گدلے پن سے صاف کریں (مزید) ان کو نذر و ہدایا قبول کرنے اور چلہ کشی کے لیئے ہمیشہ خلوت
نشین رہنے اور ان تمام طریقہ عالیہ سادات میں واجب پسندیدہ ہیں اور اس (مسلک) کی سبیل
ہے کہ وہ مجھے ان نیک اوقات پر بھول نہ جائیں جن کے اقوال و اشغال کے نتیجہ میں دعائیں شرف
قبولیت پاتی ہیں۔ میں نے لکھا اس کو شب جمعہ مورخہ ۱۵ ماہ رجب المرجب ۷۷۴ھ دار الخلافہ کشمیر میں خدا
اس کو اور اس کے باشندوں کو آفات اور تباہی سے بچالے۔ (میر محمد ہمدانی)

بمجی پورہ (۱۴۱۵ء - ۱۴۲۱ء) یہاں حضرت شیخ العالمؒ سات سال ٹھہرے۔ ضیام ووڈ بہیں پر اُن کے خلفاء میں شامل ہوئی۔

یہاں حضرت شیخ العالمؒ کی زیارت گاہ بھی ہے جہاں ہر سال چرار شریف کے میلہ کے ساتھ ہی عرس شیخ نورالدین منایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت شیخؒ یہاں سے کھاگ جانے پر آمادہ نہیں ہوئے وہ کہتے تھے کہ اگر وہ کھاگ چلے گئے تو جنت سے محروم ہوں گے کیونکہ کھاگ بھی گوشۂ جنت ہی ہے۔

ستہ ہارن (۱۴۲۲ء) حضرت شیخؒ بمجی پورہ سے یہاں پہنچے۔ انہوں نے یہاں پر بھی یادِ خدا میں چھ مہینے کاٹے۔ ستہ ہارن اور بمجی پورہ پرگنۂ بیروہ کے دو خوش نصیب گوشۂ بہشت ہیں۔

دڑے گام (۱۴۲۳ء - ۱۴۳۴ء) بمجی پورہ سے رخصت ہو کر حضرت شیخؒ ستہ ہارن سے ہوتے ہوئے دڑے گام پہنچے۔

یہاں پورے بارہ سال ٹھہرے۔ عبادتِ خدا کے علاوہ انہوں نے لوگوں کو دعوتِ اسلام بھی دی۔ یہاں کی درگاہِ عالیہ بھی نگوڑا فنِ تعمیر کا نمونہ ہے آستانِ شریف میں وہ ہموار پتھر بھی موجود ہے جس پر حضرت شیخؒ عبادتِ خدا کرتے تھے۔ دڑے گام میں سنگی گنائی حضرت شیخؒ کے خادم تھے اُن کے خاندان میں سے آج کوئی باقی نہیں ہے یہاں بیگ خاندان کے لوگ آستانِ شریف کا انتظام چلاتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ابھی یہ متبرک مقام ذریعہ معاش بن نہیں پایا ہے اس کی نئی تعمیر کا کام ہاتھ میں لیا گیا ہے۔ یہاں سے جب حضرت شیخؒ رخصت ہوئے تو خادم سنگی گنائی بھی بادلِ ناخواستہ انہیں الوداع کہہ رہے تھے۔ کہ حضرت شیخؒ نے ندی پار کرتے ہوئے فرمایا کہ جسے مُراد مانگنے آنا ہو وہ دیروار کو دڑے گام پہنچے، میں اُس روز ہر ہفتہ باطنی طور حاضر رہا کروں گا۔ سنگرام گنائی (عرف سنگی گنائی) کا مدفن دڑے گام میں برن کے سایے میں ہے، حضرت شیخؒ کامل دڑے گام ہی سے رویہ کون تشریف لائے۔

روپہ وَن

یہی وہ خوش بخت قطعۂ ارضی ہے جو بادشاہِ وقت نے حضرت شیخ کے آباد اجداد کو جاگیر کے طور عطا کیا تھا۔ نامساعد حالات کی وجہ سے انہوں نے یہاں رہنا ترک کیا تھا۔ حضرت شیخؒ نے اپنی زندگی کے آخری سات سال (۱۴۳۸ء-۱۴۴۵ء) یہیں گزارے۔ روپہ وَن چرارِ شریف کے شمال مغرب میں ایک کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ یہاں حضرتِ شیخؒ کی مختصر سی زیارت ہے جہاں پر وہ پتھر محفوظ ہے جس پر حضرت شیخؒ تشریف رکھا کرتے اور معبودِ برحق کو یاد کیا کرتے تھے۔ یہ زیارت بھی ذریعہ معاش بننے سے محفوظ ہے اِسے کئی بار تعمیر کیا گیا ہے۔ آستانِ شریف کے قدموں میں ایک چشمہ ابھی جاری ہے۔ جہاں حضرتِ شیخؒ طہارتِ جسدی کیا کرتے تھے۔

باغیچہ سنگرام ڈار

ایک دِن روپہ وَن میں بیٹھے بیٹھے حضرتِ شیخ کو چرار کی جانب روانہ ہوتے کا الہام ہوا۔ یہاں سے اپنے رفقاء و خلفاء کے ساتھ چرارِ شریف تشریف لائے۔ اور سنگرام ڈار کے باغیچہ میں وارد ہوئے اِس جگہ کا نام "دَچھہ ہار" تھا۔ اتفاقاً یہاں سے ایک خاتون کا گزر ہوا جس کا سنگی گنائی دڑے گام سے بھی کوئی رشتہ تھا۔ اِس نے حضرت شیخؒ کو دڑے گام میں دیکھا تھا۔ وہ دوڑتے دوڑتے سنگرام ڈار کے پاس آئی اور کہا "ہمائے دریں باغ سایہ آفگندہ" سنگرام ڈار حضرت شیخؒ کی خدمت میں فوراً حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا حضرت اگر آپ اِس باغیچہ میں قیام فرمائیں گے تو میں رات دِن آپ کی خدمت میں فوراً حاضر رہوں گا۔ حضرتِ شیخؒ نے فرمایا کہ سیدِ مختار کے فرمان کے مطابق یہی جگہ تاقیامت میری قیام گاہ ہے لیکن تاحیات روپہ وَن میں رہوں گا۔ اور ہفتہ میں ایک دفعہ یہاں آتا رہوں گا۔ سنگرام ڈار حضرت شیخؒ کے پیروؤں میں شامل ہوا۔ اُن کا مقبرہ حضرتِ شیخ کے روضۂ پاک کے متصل بازار کے کنارے واقع ہے حضرتِ شیخؒ نے "دَچھہ ہار" (باغیچہ سنگرام ڈار) میں ایک مسجد تعمیر کرائی جو ملک یعقوب

چک کے دور تک موجود تھی۔ یعقوب چک کے وزیر نے اس جگہ خانقاہ تعمیر کرائی۔

بقیہ حالات وکرامات

اِس سے پہلے کہ ہم حضرتِ شیخ کی وفات پر کچھ لکھیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے حالات و کرامات کا بھی اجمالاً ذکر کیا جائے جو اُن سے وابستہ ہیں کیونکہ روایات ہی کے آئینے میں حضرت شیخ رح جیسے عہد ساز ولیٔ اکمل کی شخصیت کے خدوخال نمایاں ہو سکتے ہیں۔

سُلطان سکندر اور حضرت شیخ رح

سرینگر میں تولی رینہ نام کا ایک زبردست برہمن رہتا تھا۔ بھمہ ساد (بابا بام الدّین رح) کے دائرۂ اسلام میں آنے کی خبر سُن کر اُسے حضرت شیخ رح سے مناظرہ کرنے کا خیال ہوا۔ وہ اپنے بارہ سو چیلے لے کر حضرتِ شیخ رح کو مائل کرنے کے لئے غارِ کھیوہ پہنچا۔ حضرت شیخ رح نے گپھا سے باہر نکل کر اُن پر پُر جلال نظر ڈالی۔ وہ سب نقشِ دیوار کی طرح مبہوت ہو گئے۔ حضرتِ شیخ رح سربہ زانو ہوئے تھوڑی دیر کے بعد سر اُٹھا کر تولی رینہ پر نظرِ کرم کی اور پوچھا کہ "تو کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟" اُس نے ادب سے عرض کیا کہ میں سرینگر سے آپ کی صحبت سے کسبِ فیض کرنے آیا ہوں اور آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں حضرتِ شیخ رح نے اجازت دی۔

برہمن نے حضرت شیخ رح سے کئی سوالات پوچھے اور وہ ہر سوال کا جواب دیتے گئے اس نے حضرتِ شیخ کے کمالاتِ باطنی کو دیکھ کر اپنے سبھی ساتھیوں سمیت اسلام قبول کیا۔ اس گروہ کے متعلق "بابا خلیل" اپنے رشی نامہ میں لکھتے ہیں۔

"بعضے بہ کوہ، جبال، بعضے براہ کعبہ برفتند از آنہا نام نشاں نماند" بعض لوگ تولی رینہ اور بھمہ ساد کے مسلمان ہونے پر برہم بھی ہوئے اور حضرت شیخ رح سے انتقام لینے کی سوچنے لگے۔ اتفاقاً سلطانِ سکندر کسی ہولناک بیماری میں مبتلا ہوا۔ حکیموں نے اُز لۂ مرض کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ بادشاہ نے مجبور ہو کر نجومیوں

سے رجوع کیا اور انہیں سبب مرض دریافت کرنے کا حکم دیا۔ مخالفوں نے یہ موقع غنیمت جانا اور سلطان سے کہا کہ یہ کوئی جسمانی علت یا آفت نہیں ہے جہاں پناہ کی سلطنت میں عدل و آئین کے خلاف عمل ہو رہا ہے۔ یہ بیماری اس کا نتیجہ ہے، واقعہ یہ ہے کہ ایک (خاکم بدہن) بد اصل شخص اپنا آبائی پیشہ ترک کرکے کیموہ غار میں بیٹھ کر تارک الدنیا بن بیٹھا ہے اس نے اپنا نام نورالدین ولی رکھا ہے۔ اگر اسے کیموہ غار سے نکال کر (خاکم بدہن) قتل کر دیا جائے تو بادشاہ کو یقیناً شفا ہوگی۔ بادشاہ نے حضرت شیخؒ کو حاضر کرنے کے لئے ایک سپاہی بھجوا دیا۔ دربار میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ حضرت شیخ راجہ حانی کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں سپاہی سے مٹھ بھیڑ ہوئی۔ حضرت شیخ نے اس سے احوال پرسی کی اور فرمایا کہ "آں مرد گوشہ گیر ایں فقیر است" غرض حضرت شیخ سلطان سکندر کے دربار میں تشریف لائے۔ ایک ہی نظر سے بادشاہ بستر علالت سے اٹھ بیٹھا۔ مخالفوں نے سلطان سے کہا کہ اس کے (نعوذ باللہ) خاتمے سے بادشاہ کے سبھی آلام و امراض دور ہو جائیں گے۔ سلطان یہ سن کر آگ بگولا ہو گیا اور بدکیشوں کو دربار سے نکلوا دیا اور خود تخت سے اتر کر شیخؒ کے قدموں پر سر رکھا۔

محمد دین فوق نے غلطی سے تاریخ بڈشاہی میں "معارف الحقانی" کا حوالہ دے کر لفظ بہ لفظ یہی قصہ سلطان زین العابدین اور حضرت شیخ کے تعارف میں لکھا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب! حضرت شیخ کی کیموہ کی غار نشینی کے وقت سلطان سکندر ہی کا راج تھا۔

ایک دفعہ حضرت شیخ نورالدین پرگنہ کھاگ میں کسی ٹیلے پر بیٹھے فطرت کے نظاروں میں مستغرق تھے۔ اتفاق سے اسکندر پورہ کی پانچ کنواریاں جن میں تین مسلمان تھیں اور دو ہندو (جو لکڑی لانے کے لئے جنگل چلی گئی تھیں) واپس آتے ہوئے وہاں سے گزریں انہوں نے دیکھا کہ ایک نورانی بزرگ محو خواب ہے۔ اور سورج کی تمازت سے

پسینے میں شرابور ہے ان پر رقت طاری ہوئی، لکڑیوں کی گٹھڑیوں سے حضرت شیخؒ کے اردگرد سایہ سا تیار کیا۔ جب حضرت شیخؒ خواب ناز سے جاگے تو اُن کی نظر سے پانچوں گٹھڑیاں صنوبر کے پانچ لہلہاتے ہوئے درختوں میں تبدیل ہوئیں۔ یہ جگہ "پنج یارن" کے نام سے مشہور ہے۔ دو ہندو لڑکیاں اسلام لائیں۔ حضرت شیخؒ بھی پورہ آگئے۔ اس واقعہ کی خبر لڑکیوں کے باپ کو ہوئی۔ جو گاؤں کا سردار تھا۔ وہ بہت سے لوگوں کی معیت میں حضرت شیخؒ پر وار کرنے چلے۔ نصف شب کو حضرت شیخؒ کے قریب پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ سارا احاطہ سانپوں سے گھرا ہوا ہے۔ "پائے ماندن، نہ جائے رفتن" والا معاملہ ان کو پیش آیا۔ صدق دل سے توبہ کرکے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ یہ دو لڑکیاں دہت بی بی اور بہت بی بی ہیں جن کا مدفن زاہد کورین (ژدٹن) چرار شریف کے قریب ہے یہ بھی مشہور ہے کہ ان لڑکیوں نے حضرت سے کہا "عاصا ہیتہ چھکہ سا سا کتران" عصا ٹیکائے ہزاروں کیڑوں مکوڑوں کو قتل کیئے جا رہا ہے۔

بندر ہامہ کراز سے گزر رہے تھے۔ ایک برہمن سے جو کہیں بیٹھا تھا پوچھا کہ کیا کر رہے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ میں روز سات بار نہان کرتا ہوں اور خورد و نوش بھی نہیں کرتا۔ حضرت شیخؒ نے جواباً فرمایا:

سته شرانس پھل یوڈ پوشیے — گاڈ تہ کرمس آس آکے ذلت
وو کیں دِنے دے یود لوشہ ہے — ذرالد لیلہ ڈے ژھنہ ہن تہ ذات

اگر روز نہانا سود مند ثابت ہوتا، تو مگرمچھ اور مچھلی ایک ہی ذلت کے تھے۔ اگر فاقہ رہنے سے خدا تعالیٰ راضی ہوتا تو پھر نادار بلا خورد و نوش زندہ رہتا۔"

پٹن پہنچتے ہوئے لوگوں کو مچھلیوں کا شکار کرتے دیکھا تو کہہ اٹھے "کیوں مچھلیوں کا شکار کرتے ہو، خدا خوف تو کرو، ڈرو تو بھی۔ جو جیو مار کر زندہ رہتے ہیں وہی دنیا کو

مُبتلائے فریب کرتے ہیں ؎

کندیو ارد ین   ہنا زوشبین
یم زدِ مارِتھ نُزوٗسس دِین   تِمے دٗزِ یہس بٔرِ ہین

مختلف مقامات سے متعلق حضرت شیخؒ سے منسوب اقوال بھی اُن کی رہ نوردیٔ عشق کی گواہی دیتے ہیں۔ اُن کی تفصیل دینا باعثِ طوالت ہوگا، میرے خیال میں اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ اُن کی حیثیت ضرب المثل کی ہوگئی ہے۔ باستثنائے چند ایک اقوال کے جو حضرت شیخؒ کی اعلیٰ و ارفع ذات سے میل نہیں کھاتے۔ یہ اور ایسے دوسرے شواہد اس بات کے غماز ہیں کہ حضرت شیخ العالمؒ علمدارِ کشمیر ہر دلعزیز مقبولِ عام دیو پیکر عوامی قوت تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے پنڈت لوگ اُسے "نُند رِشی" کے پیارے نام سے یاد کرتے ہیں۔

حضرت شیخ نورالدین ولی کی وفات

نشانِ مردِ مومن با تو گویم

چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست!

جیسا کہ پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت شیخ العالمؒ رہ بہ دَن میں سات سال خلوت گزیں رہے۔ اکثرتِ رائے یہی ہے کہ وہ ۶۳ سال کی عمر پا کر ۸۴۲ھ (مطابق ۱۴۴۱ء) میں داصلِ بحق ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ حضرت شیخؒ کو دنیائے بے ثبات سے کوچ کرنے کا باطنی طور پہلے ہی علم ہوا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْتِ۔ اِس لئے انہوں نے فرمایا کہ "اے نفس! موت کو کیوں فراموش کر بیٹھی۔ موت کو کیوں بھلا دیا۔" اے نفس! اپنا گھر ڈھونڈ! اپنا ٹھکانہ تلاش کر!" آہ ہم! ہنستے کھیلتے اپنے اصلی گھر (عاقبت) کو سدھاریں۔"

سہ
ہاز و مرن موٗ ٹھُستہ کو ... ڈیچھتہ مُرن مۆ ٹھُستہ کو
سو دتہ زُ و گرِ پینڈن ... سو دتہ زُ و گرِ بنون
وُ دِتھو گَنڈ دِتھ گرِ گژھو دو ... وُ دِتھو گَنڈ دِتھ گرِ گژھو دو

ایک اور جگہ موت کو ایسا شربت قرار دیا ہے جس کے پیئے بغیر حقیقتِ ابدی سے واصل نہیں ہوا جا سکتا۔ حضرتِ شیخؒ کے دمِ واپسیں کی کیفیت یوں بیان کی گئی ہے کہ انہوں نے اپنے خلیفہ و خادم بابا نصر الدینؒ سے فرمایا۔ "برخیز از بروں خبرے بیار۔" وہ حجرے سے باہر نکلے۔ دیکھتے ہیں کہ دشت و بیاباں سرخ پوش سپاہیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ گھبرا کر اندر آئے اور حضرت شیخؒ سے کیفیت عرض کی تو انہوں نے دوبارہ باہر جانے کو کہا۔ بابا نصر دوبارہ باہر آئے۔ دیکھا کہ ایک سبز پوش سوار سرخ پوش سپاہیوں پر حملہ کر رہا ہے اور وہ میدان سے بھاگ رہے ہیں چنانچہ ایک بھی سپاہی میدان میں نہ رہا۔ بابا نصر الدینؒ یہ ساری کیفیت حضرت شیخؒ سے عرض

کر رہے تھے کہ وہ سبز پوش شہسوار بھی اندر آگیا اور حضرت شیخ نے بڑی تعظیم سے اُس سے معانقہ کیا۔ آپسمیں راز و نیاز کی باتیں ہوئیں اس کے بعد سبز پوش شہسوار نے چرار کی طرف پندرہ تیر پھینکے اور حضرت شیخ سے رخصت ہوئے بابا نصر کے پوچھے جانے پر حضرت شیخ نے فرمایا کہ آنحضورؐ نے حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کو شیطان کی سرکوبی کے لئے بھیجا تھا۔ انہوں نے چرارِ شریف کی طرف جو پندرہ تیر پھینکے اُس کا مطلب یہ ہے کہ چرار میں جہاں میرا مقبرہ بنے گا اُس کے چاروں کونوں میں چار تیر گاڑ دیے جائیں۔ ایک تیر سے دوسرے تیر تک گیارہ گز کا فاصلہ ہو۔ گیارہ تیر اِس احاطے کے درمیان برابر فاصلے پر گاڑے جائیں تاکہ وہاں گیارہ خلفاء کے مقبروں کی گنجائش ہو۔ دَم واپسیں کی گھڑی قریب تر آگئی۔ بابا نصر نے عرض کیا کہ حضرت اِس وقت کس چیز کی آرزو ہے۔ انہوں نے جواباً فرمایا "واصل بحق ہونے کی"۔ اِسی کے ساتھ روحِ پاک قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔ سارے کشمیر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ اطراف اکناف سے لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر آہ و بکا کی صورت موجزن ہوا۔ اُن کی خاتون خلیفہ شیام بی بی نے ایک دردناک مرثیہ لکھا

نندہ! سنز گوسو رگس ماتو   اسہ سُنز گو سو رگس ماتو

"نندہ! ہمارا محبوب! راہیٔ ملکِ عدم ہوا۔"

بابا نصر نے مادۂ تاریخ وصال کہی :- "نوند زوٚت گو بای سرگ"

اِس کا حوالہ پہلی بار بابا نصیب الدین غازیؒ کے نور نامہ میں ملتا ہے۔ سید علی ولد سید محمد کی تاریخ میں درج ہے کہ حضرت شیخ العالمؒ سلطان زین العابدین بڈشاہ کے عہد میں فوت ہوئے۔ سلطان زین العابدین: "پنجاہ و دو سال حکومت بہ استقلال کردہ، در ایام او شیخ نورالدین فوت کردہ و قطب الاقطاب شیخ بہاؤالدین شہادت یافتہ"۔ اس بیان سے صاف عیاں ہے کہ حضرت شیخ نے زین العابدین کا کچھ زمانہ بھی دیکھا ہے۔

سلطان زین العابدین بڈشاہ نے کشمیر پر (۸۲۳ھ (م: ۱۴۲۰ء) سے ۸۷۴ھ م ۱۴۷۰ء تک حکومت کی ہے حضرت بابا نصیب الدین غازیؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت شیخ العالمؒ کے روضہ پاک پر اُن کا سنِ وصال ۸۴۲ھ کندہ تھا جو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

بہارستانِ شاہی (مصنف نامعلوم) حضرت شیخؒ کے بارے میں رقمطراز ہے "در سلطنت آن بادشاہ جماعتِ بسیار از درویشاں صاحبِ حال و معروف و مشہور بودند چوں شیخ بہاؤ الدین کشمیری و شیخ سلطان و شیخ نور الدین ریشیؒ و مولانا عثمان مجذوب و مولانا نور الدین و میر سید محمد مدنی۔ ۔ ۔ و سید حسن بہادر دم و غیرہ ہم کہ بعضے از ایشاں از عہد سلطان سکندر تا بعہدِ سلطان زین العابدین در حیات بودند ظاہر ہے کہ سلطان زین العابدین نے اُن کے جنازے میں شرکت کی ہو گی۔

بابا خلیل نے اپنے ریشی نامے میں حضرت شیخؒ کا سنِ وصال یوں بتایا ہے ۲۶ جمید الثانی ۸۴۲ھ (پوہ ۱۵ وس)۔

پیر غلام حسن کھویہامی نے حضرت شیخؒ کا سنِ وصال ۸۲۰ھ مانا ہے اور تاریخ تولدِ ۷۵۷ھ علاؤ الدین کے عہدِ حکومت میں صحیح قرار دیا ہے اگر وہ ۸۲۱ھ میں واصلِ بحق ہوئے ہوتے تو وہ بڈشاہ کا زمانہ کیسے دیکھتے۔ چنانچہ مورخ حسن خود لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ نور الدین ریشی عہدِ بڈشاہی میں انتقال فرما گئے ہیں اور سلطان زین العابدین اُن سے کسبِ فیض کیا ہے تاریخ مولودِ سعادت نمودش ہفت صد و ہفتاد و نہ ہجری و سنہ رحلت و انتقال ہشت صد و چہل و دو مورخان در قیدِ قلم آوردہ اند۔ روایتِ صحیح ایں است۔

حضرت شیخ کے روضہ مبارک پر ۸۴۲ھ مادۂ تاریخ کندہ ہے سہ بہر تاریخ ز وصالش گفتم رحمۃ اللہ علیہ ابدا۔ یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ حضرت شیخؒ کی زیارت زین العابدینؒ بڈشاہ نے تعمیر کرائی ہے۔ جو بعد میں آتشِ ناگہانی میں شہید ہوئی۔ اِس کی تعمیرِ نو پٹھان گورنر

عطا محمد خان نے کی ہے یہ امر قرینِ قیاس ہے کہ اُس وقت حضرت شیخ کا سنِ وصال لکھنے میں غلطی ہوگئی ہو۔ حالانکہ آستان شریف کے اندورنی پائے (ثہ لوٹن) پر ۸۴۲ھ نمایاں طور کندہ ہے۔ حضرتِ شیخؒ کے سنِ وصال سے متعلق جو مادہ ہائے تاریخ کہے گئے ہیں ان میں اکثر ۸۴۲ھ کے حق میں ہیں چند ایک مادہ ہائے تاریخ یہاں درج کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا

الحق خاصۂ اَبد	عاشقِ محیط سرمدؔ	عارفِ اسرار ہائے احد
مُرشد راہِ محمدؐ	نورِ آفتاب محمدؐی	شمس العارفین
طرازِ گلستانِ دین	بازِ عرش برزمینؔ	شہنشہِ آفاق
شہہ ملک ولایت	ولیٔ اکمل اولیا شاہ نورالدین	ہدایت یا ہدایت
مخبرِ[۱]		

---

[۱] خوارق السالکین کے مصنف احمد بن ابن الصبور نے حضرت شیخؒ کا سنِ وصال سنہ ۸۳۸ھ یوں باندھا ہے۔ ؎

زدنیا نور دین چوں رفت بیروں | کہ بودہ پیشوائے اہلِ تجرید
پئے سالِ وصالش ہاتفِ غیب | بگفتا بود شاہِ اہلِ توحید

۸۳۸ھ

زیارت گاہِ اہل علم و عرفاں

چرارِ شریف علمدارِ کشمیر، شمس العارفین، شیخ نورالدین ولیؒ چرارِ شریف میں کسی خاص مدّت کے لئے نہیں ٹھہرے۔ البتہ وہ یہاں باغیچہ سنگرام ڈار میں آیا کرتے تھے۔ پیغمبر آخر الزماں خاتم النبیّین حضرت محمدؐ جب مکہ شریف سے ہجرت کر رہے تھے تو اُنہوں نے اللہ سے یہ دُعا مانگی تھی کہ "اے اللہ میں وہ جگہ چھوڑ رہا ہوں جو مجھے محبوب ہے تو مجھے اُس جگہ پہنچا دے جو تجھے عزیز ہو۔" اور دیکھئے کہ محسنِ انسانیت کی امین خاکِ پاک مدینہ منورہ ہے۔ مشیّتِ ایزدی میں کسے دخل ہو سکتا ہے۔ کسے معلوم تھا کہ پیکرِ رُشد و ہدایت حضرتِ شیخ نورالدینؒ شہنشاہیت کو ترک کر ریشت کے امام کا اعلیٰ و ارفع مقام حاصل کریں گے۔ ورنہ کشتواڑ سے کیموہ و چرار کہاں۔ سورج جب طلوع ہوتا تو رقصِ سفر میں حسبِ توفیق ذرّے ذرّے کو روشنی عطا کرتا ہے اسی لیے ہر کوہ طورِ سینا نہیں اور ہر ایک ہاتھ یدِ بیضا نہیں۔ اِس لئے کوئی عجب نہیں کہ اگر پیکرِ عرفان آگہی حضرتِ شیخ نورالدین ولیؒ یہاں آرامیدہ ہیں مہر درخشاں کی ضو پاشیاں ہر طرف نورِ عرفان کے انبار کر رہی ہیں۔ ؎

چمک سورج میں کیا باقی رہے گی اگر بیزار ہو اپنی کرن سے

حضرت شیخ نورالدینؒ کا جسدی سفر ردیہ دن میں انجام کو پہنچا۔ بادشاہ اور رعایا دونوں اپنی اپنی عقیدت کے جوش میں جسدِ پاک کو کاندھا دے کر من پسند گوشۂ ارضی کو امین بنانا چاہتے تھے۔ لیکن مشیتِ الٰہی کے آگے شکوہِ سلطنت و انبوہِ مخلوق ہر دو سر خم ہوئے۔ بابا زین الدینؒ اور بابا نصر الدینؒ درماندگی کی حالت میں مُرشد سے رجوع کرنے

پر مجبور ہوئے۔ اُنہوں نے حضرت شیخؒ سے عرض کی کہ حضرت آپ کی حیات ظاہری میں کسی جاندار کو گزند نہیں پہنچی۔ اِس وقت ایسی بگڑی حالت ہے کہ لوگوں کے مارے جانے کا خطرہ ہے۔ حضرتِ شیخؒ نے باطنی طور بابا نصرؒ کو ہدایت دی کہ وہ لوگوں سے کہہ دیں کہ پہلے میری تجہیز و تکفین شیت واری میں انجام دیں۔ نمازِ جنازہ اوگجہ منڈ وہیں ادا کریں۔ پھر مشیتِ ایزدی پر مقبرے کا انتخاب چھوڑ دیجئے۔ بابا زین الدینؒ اور بابا نصر الدینؒ نے لوگوں کو حضرت شیخؒ کی باطنی ہدایات سے آگاہ کیا۔ شیخ کے جسدِ خاکی کو ایک تختے پر رکھا گیا۔ تختہ پرواز کر کے شیت واری کے مقام پر جا اُترا۔ تجہیز و تکفین کے بعد تابوت ہوا میں اُڑا اوگجہ منڈو (نفل ٹینگ) آیا۔ بابا نصر الدینؒ نمازِ جنازہ کے پیشوا ہوئے۔ ازاں بعد تابوت بفضا میں اُڑنے لگا۔ ہر جگہ کے لوگوں کو گمان گزرا کہ تابوت اُنہی کے مسکن کو جائے گا۔ وہ اپنے اپنے گھروں کو ہو لئے تابوت تین روز تک محوِ پرواز رہا۔ حضرتِ شیخؒ سوموار کو انتقال فرما گئے۔ تابوت جمعرات کو وہاں اُترا جہاں آج مرقدِ حضرت شیخؒ واقع ہے ؎

آسمان گوید زمین را مرحبا
با توام چون آہن و آہن ربا

(مولانا رومؒ)

دائرہ ریشیت کے مرکز

رشید نثار کی

ریشی لفظ کی مختلف تعبیریں اور تاویلیں ہیں

سنسکرت زبان میں اس لفظ کے لغوی معنی صاحب بصیرت اور رسیدہ عابد کے ہیں جس کی وجدانی عظمتوں نے اُسے کشف اور الہام کے درجے تک پہنچا دیا ہو، اس کے ایک معنی بھجن گانے والے کے بھی ہیں یعنی وہ عاشق جو خدا کی محبت اور عظمت کے گیت گاتا ہو۔ اس لفظ کے معنی سنسکرت نے عظیم خدا رسیدہ اور صاحب بصیرت لوگوں کے لئے استعمال کیا ہے جنہوں نے ویدوں کو ترتیب دیا۔ چونکہ وید ہندوں کی الہامی کتابیں ہیں، اس لئے ریشی کے لئے یہ بھی لازمی قرار پایا کہ وہ صاحب کشف اور صاحب الہام ہو، اور اُس کی نظر حال مستقبل اور ماضی پر یکساں ہو یعنی وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو اور دورانِ محض کے ساتھ متصل ہو۔

ریشی سلسلے کی ابتدا آریائی قوموں کے ہندوستان میں داخل ہونے سے پہلے ہو چکی تھی اس امر کی تصدیق ژند اوستا سے بھی ہوتی ہے جو کہ پارسیوں کی قدیم اور تنہا مذہبی کتاب ہے۔ اس مقدس کتاب میں کوی اوشان کا ذکر ملتا ہے جس نے سب سے پہلے عبادت کے لئے مقدس آگ سلگادی تھی، اسی شخص کو رگ وید میں ریشی اوشان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جہاں یہ اندر کا خصوصی دوست گردانا گیا ہے۔ اوستا کا یہی اوشان، شاہ نامہ فردوسی میں کیکاؤس کے نام سے ابد حاصل کر چکا ہے۔ وسطِ ایشیا سے آریوں کے قافلے ہندوستان کی طرف کیوں آئے یہ بذاتِ خود ایک الگ مضمون ہے ہاں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اس ہجرت کی ایک وجہ ریشیوں کا اختلاف نظر بھی تھا۔ ویڈل کے بیان کے مطابق اُس نے وادی سندھ سے برآمد شدہ دو مہروں پر دو ویدک ریشیوں کاک شوتھ اور کمار ریشی کے نام پڑھنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے کشمیر میں طلوعِ اسلام کے بعد اس لفظ نے وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے لئے

اپنے کئی معانی بدل دیئے، مثلاً اِس موضوع پر شاعرانہ رمز و کنایہ کے ساتھ ریشیت کی تعریف کرنے والوں میں سب سے پہلی معتبر شہادت حضرتِ بابا داؤد خاکی کی ہے وہ خود بہت بڑے شاعر اور صوفی تھے۔ لیکن حضرتِ شیخ نورالدین نورانی کی تعریف اِن الفاظ میں کی ہے

اور آخر میں تمام ریشیوں کے متعلق فرماتے ہیں۔

حضرتِ بابا داؤد خاکی نے تو شاعرانہ اختصار کے ساتھ اس ملک کی طرف بلیغ اشارے کئے ہیں، لیکن اِن کے مرید باصفا حضرت بابا نصیب الدین غازی کے فدوی مرید حضرتِ بابا داؤد مشکواتی نے ریشیوں کے متعلق کھُل کر تعریف کی ہے، جو بذاتِ خود ریشیت کی تعریف بھی بن جاتی ہے۔ اُن کی عبارت عربی میں ہے جو شاید اُن کی کتاب منہاج الریشیہ، کا ایک اقتباس ہے، وہ فرماتے ہیں۔

"جان لو کہ ریشی وہ ہے جو زاہدوں اور عابدوں میں ریاضت پیشہ ہو، بیوی بچوں سے فارغ ہو، خانگی اثاثہ اور اراضی سے بے نیاز ہو، اور زمین کے اطراف و اکناف میں سے پہاڑوں کو اپنے قیام کے لئے اختیار کرے۔ جو کچھ شام کو حاصل ہو جائے اُس کو کل کے لئے بچا کر نہ رکھے جو غذا اُس کو میسر ہو، اُس سے کسی بھی مانگنے والے کو مایوس نہ کرے اور خود اُس چیز میں ایثار و انفاق کا راستہ اختیار کرے جس کی طرف دوسرے کو مائل اور راغب دیکھے اس سے کیڑے مکوڑوں اور پرندوں کو بھی اذیت نہیں پہنچتی، آدمیوں، وحوش و طیور اور چوپائیوں کی تو بات ہی نہیں، وہ اپنی ہمت اور ارادے سے خدا کی طرف رجوع کرتا ہے اور اُس کا قرب تواتر

خلوت نشینی، خاموشی، بیداریٔ قلب و چشم اور فاقہ مستی سے حاصل کرتا ہے، توبہ، صدقہ، ذکر دایم اور انکساری کو ہمیشہ حضورِ حق کا وسیلہ بناتا ہے یہاں تک کہ اس کی زبان اس کے اختیار سے نکل کر عین ذکر بن جاتی ہے اور ایک دائمی کیفیت طاری ہو جاتی ہے یہاں تک کہ تمام ظاہری اور باطنی اشیاء حتیٰ کہ اپنے نفس اور اس کے صفات سے بھی کٹ جائے اور توحید خالص میں ڈوب جائے جو مشاہدہ سے حاصل ہو جاتا ہے اِس طرح ہر نور اللہ جل شانہ کے نورِ حق میں جذب ہو جاتا ہے جس طرح ستاروں کا نور سورج کے نور میں، اسی پر حضرتِ جنید کا قول مبنی ہے کہ "توحید ایک ایسی حقیقت ہے جس میں رسوم مٹ جاتے ہیں اور علوم سمٹ جاتے ہیں اور فقط لازوال اللہ کی ذات باقی رہتی ہے" ریشی حلال مطلق کے سوا کچھ نہیں کھاتا ہے اسی لئے بعض نے ہاتھ کی کمائی کھانے کو ترجیح دی جب اس میں بھی حلال نظر نہ آئے تو خالص پانی اور جنگلی جڑیوں مثلاً کاسنی اور اوپل ہاکھ کو اختیار کرے جیسا کہ ذکر ہوا ہے

لفظ ریشی ریشۂ طیر یعنی پرندوں کے پر سے لیا گیا ہے کیونکہ پر جب پرندے سے الگ ہو جاتے ہیں تو ہوا کے مقابلے میں اِس کا بس نہیں چلتا، یہاں تک کہ ہوا وادیوں اور جنگلوں میں اِسے جہاں چاہے لے جاتی ہے جیسا کہ حضور صلعم سے مروی ہے کہ دل کی مثال اس پر کی ہے جو چٹیل میدان میں ہو، اور ہوا اس کو اوپر تلے پٹکتی ہے"، یہی مثال اللہ کے ہاں ریشی کی ہے، کیونکہ وہ تنہائی اور تجرد کی وجہ سے ہلکا ہوتا ہے، ابو الفقراء نے فرمایا کہ یہ لفظ وریشا و لباس التقویٰ" (کھردرا اور کپڑا التقویٰ کا لباس ہے) سے لیا گیا ہے کیونکہ جو کچھ یہ لوگ پہنتے ہیں وہ کھردار سیاہ یا دھاری دار سیاہ ہوتا ہے، کبھی اس کے فارسی معنی ریش کی طرف اِسے منسوب کیا جاتا ہے ریش فارسی میں زخم کو کہتے ہیں، کیونکہ ان کا اکثر وقت جس حال میں بھی ہوں زخمیوں کی طرح آنسو بہاتا گزر جاتا ہے۔ حدیث مبارک میں بھی وارد ہے کہ کوئی بندۂ مومن جب آنکھوں سے آنسو ٹپکائے اگر وہ قطرہ مکھی کی کلغی کے برابر بھی ہو، پھر اس میں اس کے چہرے کی گرمی سرایت کر جائے

اللہ اس پر جہنم کی آگ حرام کر دیتا ہے۔

بابا داؤد مشکواتی کے بیان کے مطابق انہوں نے ریشیت پر ایک پوری کتاب منہاج الریشہ کے نام سے لکھی ہے لیکن افسوس یہ اہم کتاب فی الحال ناپید ہے بہر حال ریشیت کے متعلق ان مختلف تعریفوں تفسیروں اور تاویلوں سے کچھ اہم نتائج کا استخراج ہوتا ہے اوّل یہ کہ

۱۔ ریشیوں میں عشقِ الٰہی کا شعلہ جوالہ ہر وقت بھڑکتا رہتا ہے اور یہ آگ انہیں فریاد و فغان پر مجبور کرتی ہے جو اگر شعر یا فلسفے کی صورت میں موجزن ہو جاتی ہے تو ثبات و دوام بھی حاصل کرتی ہے

۲۔ عشقِ الٰہی کی آگ ماسواء اللہ کے بغیر ہر چیز کو خاکستر کر دیتی ہے اس لئے وہ قرآن کی زبان میں زینت الحیواۃ الدنیا یعنی دنیا وی تعلقات حتیٰ کہ زن و فرزند سے بھی بے نیاز ہوتے ہیں۔

۳۔ وہ اختلاطِ سوء سے بچنے کی خاطر اعتکاف میں رہتے ہیں اور اسی لئے پہاڑوں اور بیابانوں یا لبشر ڈ ملکی و ریگستانوں میں اپنا مسکن ڈھونڈھ لیتے ہیں۔

۴۔ وہ کسی بھی جاندار کو تکلیف پہنچانا گناہ سمجھتے ہیں اور اسی خوف سے خالص پانی یا سبزی کے سوکھے پتوں پر گزارہ کرتے ہیں۔

۵۔ ایثار، اخلاص، ایقان، اور انفاق فی سبیل اللہ اُن کی فطرت ثانیہ ہوتی ہے۔

۶۔ وہ اذکار و افکار میں اس قدر ڈوب جاتے ہیں کہ اپنے نفس کے صفاتی پہلوؤں تک سے ہو گزرتے ہیں۔ اور اس طرح عین ذات میں اُدغم ہو جاتے ہیں۔

۷۔ وہ ایک دائمی سرمستی کے عالم میں رہتے ہیں۔

یہاں تک تو ریشیت کے صفاتی اور کرداری پہلو کا تذکرہ تھا۔ اب آیئے ذرا اس لفظ کی کنہ اور اس کے لغوی معنی پر غور کریں، عبدالاحد آزاد کا قول ہے "ریشی اصلاً ایک سنسکرت لفظ ہے، جس کے معنی تارک دنیا عابد کے ہیں۔ (کشمیری زبان اور شاعری صفحہ ۱۸۱)

اور مؤرخ حسن ریشی کی تعریف میں یوں رقمطراز ہیں،

"ریشی اصل میں سنسکرت لفظ ہے جس کے معنی ہیں۔ اپنی ہستی مٹا کر حقیقی اصلی ہستی میں واصل آدمی، جس کو دنیا سے نفرت ہوتی ہے، کردد، کام، لوبھ، موہ، اہنکار سے وہ پاک ہوتا ہے۔ اُس کو نہ نفسیاتی لذت کی اور نہ روحانی رغبت کی لذت ہوتی ہے۔" حسن اسی باب میں کشمیر کے قدیم ریشیوں کے متعلق لکھتا ہے۔ (تذکرۃ اولیاء صفحہ ۱۰۲)

پرانے زمانے کی باتوں کو جاننے والے لوگ واقف ہیں۔ کہ کشمیر کی آبادی کی ابتدا میں بہشت جیسے اطراف والے ملک میں کلیتہً بُت پرست بود و باش رکھتے تھے، اُن میں ایک خدا پرست جماعت بھی تھی جس کے افراد غاروں گپھوں جنگلوں اور درختوں کے کھوہوں میں اکیلے اور تنہا اپنے پیدا کرنے والے کی عبادت کرتے تھے اور تمام مزے دار، خوش ذائقہ چیزوں نفسانی، جسمانی اور روحانی شہوتوں سے پرہیز کر کے جنگلی کاسنی، جنگلی ساگ کڑوے میوے اور نہ کھائے جانے والے اناج اور وہ چیزیں جو انسانی جسم کے لئے مفید نہیں، کھا کر جان توڑ تپسیا میں مشغول ہوتے تھے، سخت تپسیا، ریاضت اور نفس کُشی سے جو روحانی طاقت ان میں پیدا ہوتی تھی، وہ اس درجہ کی ہوتی کہ جو کچھ ان کی زبان سے اچھا یا بُرا کسی کے حق میں نکلتا اُسی وقت وہی عمل میں آجاتا۔ تذکرۃ الاولیاء صفحہ ۱۰۱

کشمیری زبان و ادب کے ایک اور رمز شناس پروفیسر محی الدین حاجنی اس کی توضیح یوں فرماتے ہیں۔

لفظ ریشی سنسکرت زبان کا لفظ ہے جو عارفوں کی عارفانہ اور متصوفانہ زندگی کے ساتھ براہ راست میل کھاتا ہے اس سے مراد وہ شخص ہے جو بھجن گاتا ہو یعنی وہ انسان جو خدائے لم یزل سے اپنی نجات اور مکتی کے لئے کلام موزوں میں دُعا مانگ لے، جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اس لفظ نے اصطلاحی لحاظ سے مختلف شکلیں اختیار کر لیں، اب دُنیائے روحانیت میں ریشی اُس شخص کو کہا جانے لگا جو عرفانِ حق تلاش کرتے

کرتے لذاتِ دُنیا سے کُلیتاً کنارہ کش ہو جائے، یا وہ شخص جو تلاش حق کے مسلک پر چل کر مادی چیزوں سے انحراف کرے، اور اپنا دامن بچالے یا وہ جو معرفت کا مقام حاصل کر کے عوام الناس کی نجات اور رہبری کو اپنا شعار بنالے' کشمیری زبان میں ریشی لفظ نے اپنا صحیح مقام تلاش کرتے کرتے معنی کا وہی لباس پہن لیا' جو بقول ولیم مینز عبرانی زبان کے لفظِ ارسان نے پہن رکھا ہے مطلب وہ شخص جو اپنی فطانت و ذہانت کے کارن لوگوں میں بزرگ اور صوفی منش مان لیا جائے ریشی کہلاتا ہے۔ (علمدار، صفحہ نمبر ایک)

محولہ بالا اقتباسات کے پیش نظر یہ ماننا پڑتا ہے کہ حضرت بابا داود مشکواتی نے ریشی لفظ کے لغت پر جو طبع آزمائی فرمائی ہے' وہ زیادہ قرین قیاس نہیں' تاریخی حقایق اور واقعات بھی انکے نظریے کی تائید نہیں کرتے۔ اس لئے کہ ریشی لفظ تاریخ کشمیر کے اساطیری دور ہی سے مُروّج رہا ہے اور ہمیشہ صوفی منش اور تلاش حق کی راہوں پر چلنے والے سالکوں کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے۔ اس کا تعلق ریشۂ طیر' یا دل ریش سے جوڑنا نکتہ سنجی کی اچھی مثال ہو سکتا ہے لیکن اس دلیل کے پیچھے تاریخی واقعات کا ایک الٹا دھارا بہہ رہا ہے کشف ریشی سے پہلے بھی اگر تاریخ کشمیر کے اوندھے منہ پڑے ہوئے واقعات کو تاریخی نبض شناسی کے ہاتھوں چھیڑا جائے تو بہت سارے ریشیوں کا پتہ چل جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ طلوع اسلام کے بعد بھی ریشی انہی معنوں میں استعمال ہوتا رہا۔ جن کے لئے یہ لفظ کشمیر کے تمدنی ماضی کی گہرائیوں سے استعمال ہوتا رہا ہے' ہاں یہ واقعہ ہے کہ اسلام نے اس لفظ کی معنویت کی تہذیب اپنی اخلاقی اور مذہبی روایات کے سانچے میں کی' اور اس پر ہمارے ریشیوں کا کردار بھی گواہ ہے' اور تاریخ کی جلوہ فروشیاں بھی شاہد ہیں۔

اصل معاملہ یہ ہے کہ تمدنی دائرے میں ہمارے یہ سالکانِ باصفا کشمیری تہذیب کے نمائندے رہے، حتیٰ کہ قبول اسلام یا اسلامی دور میں بھی اُن کے نام تک کشمیری ہی رہ پائے

مثلاً نوروز، قستہ، ہَرْدِ، سُمبہ لالہٗ، دِتی زنکالسہ‌من، بلاسمن، خلاص من، یاسمن، سنگرام وغیرہ ریشیت کی مختلف المعانی تفسیر وتعبیر کچھ اِسی لفظ کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ اکثر اوقات ایسے لفظوں کی تقدیر بن گئی ہے اور تاریخ شناسوں کو ظاہری معانی کے بجائے لفظ کے ست اور جوہری سے اس کے اصل معانی مستعین کرنا پڑے ہیں خود لفظ صوفی کے ساتھ بھی جو اسلامی تصوف کی بنیادی اصطلاح ہے کچھ یہی حال ہوا ہے چنانچہ فلاسفۃ الاسلام کے فاضل مصنف محمد لطفی جمعہ کو اس لفظ کے معانی کے بارے میں کہنا پڑے گا۔

لفظ تصوّف یا لفظِ صوفیا کی اصلیت میں علماء اسلام کو اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ یہ صفا یا صُفّہ سے مشتق ہے اور دوسروں کا خیال کچھ اور ہے اِبن خاردن کہتا ہے کہ اس لفظ کا صوف سے اشتقاق اہل تصوّف کے صوف پہننے سے قرین قیاس معلوم ہوتا ہے لیکن ہم اِس کی اِس توجیہہ کو غلط سمجھتے ہیں ہمارا خیال ہے کہ یہ یونانی کلمہ سیو صوفیائے مشتق ہے جس کے معنی حکمتِ الٰہی کے ہیں صوفی وہ حکیم ہے جو حکمت الٰہی کا طالب ہوتا ہے اور اس لئے کوشاں رہتا ہے، صوفی یا متصوّف غایتِ حقیقتِ الٰہی تک پہنچایا ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جو کچھ حقیقتِ اعلیٰ کے متعلق کہتے یا لکھتے ہیں اِس پر وہ فلسفیانہ بحث کرتے ہیں۔

ہماری رائے کی تائید اِس سے ہوتی ہے کہ صوفیائے نے اس علم کا اظہار اس وقت تک نہیں کیا اور نہ خود کو اس صفت سے متصّف کیا جب تک کہ یونانی کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں ہو کر فلسفے کا لفظ اِس میں داخل نہیں ہوا۔ (فلاسفۃ الاسلام صفحہ ۲۶۹-۲۷۰)

بالکل اِسی طرح اگر لفظ ریشی پر غور کیا جائے تو ثابت ہوگا۔ کہ یہ لفظ کشمیری زبان میں نیم تاریکی دھندلکا یا قرین ظلمہ سے معروف رہا ہے اور اپنے معنی کے دایئروں میں حق شناس اور صوفی منش لوگوں کی نشاندہی کرتا رہا ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس لفظ کے معانی کو کشمیری زبان کی لغت سے نکال کر سمجھنے کی کوشش کریں اور دور از کار السنا

کے پس منظر میں اِس کا ناطہ فارسی اور عربی مصادر سے جوڑ کر اُلٹے بانس بریلی کو لے جائیں، رنشیت کی اپنی ایک تاریخ ہے جس کا تذکرہ اگلے صفحات میں آئے گا، جس کے مطالعے کے بعد شاید اِس لفظ کے کشمیری الاصل ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ پائے گی۔ اور شاید یہ بھی ثابت ہوگا کہ یہ لفظ کشمیری قومیت کے آر کی ٹائپ میں ایک خاص معنی لے کر داخل ہوا ہے۔

کشمیر میں ریشیت کی تاریخ

کشمیر میں ریشیت کی تاریخ بہت پرانی ہے تاریخ کے ابتدائی نقوش میں بھی ایسے لوگوں کا پتہ چلتا ہے جو بے نفس، ایثار پیشہ، خداپرست اور خلوت نشین تھے تاریخ کشمیر کے اکثر عجیب و غریب اور دل چسپ پہلو ابھی تک معرض عدم میں ہیں۔ لیکن تمدن آگاہ اور تاریخ شناس لوگوں نے خود کشمیر کے تمدنی آثار سے یہاں کی تاریخ کے ایسے ادوار کو دریافت کیا ہے جن کا موجودہ تاریخی تذکروں میں کوئی پتہ نہیں چلتا، مشہور جرمن خاور شناس Pockak نے اپنی کتاب India in greece میں یہ ثابت کیا ہے کہ سکندر اعظم اپنے ہندوستان پر حملے کے دوران اس وقت کی ریاست کشمیر میں بھی وارد ہوا ہے اور اس طرح یہاں یونانی حکومت کی بنیاد پڑی ہے جو حضرت عیسیٰؑ سے ایک سو سال قبل تک یہاں مروّج رہی ہے اس کا گہرا تمدنی اثر ہمارے فنِ تعمیر، فنِ سنگ تراشی اور دوسرے تمدنی پہلوؤں پر پڑا ہے کچھ اور لوگ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر تاریخ اور اساطیری رموز و کنایات سے یہ بھی ثابت کر رہے ہیں کہ دراصل یہ کشمیری ہی تھے، جنہوں نے وسط ایشیاء کی راہوں سے سفر کر کے یونان کی بستیوں کو آباد کیا تھا۔ اور وہاں ایک عظیم تمدن کی نیو ڈالی تھی اور پھر یہی تہذیب اپنے فن فلسفے، اور خود شناسی کی عظیم روایات کے ساتھ تمام دنیا پر محیط ہوگئی تھی اور سکندر کا حملہ اور کشمیر سے اس کی دلچسپی دراصل ایک آوارہ بازیبین تھی جو بالواسطہ طور پر نور قہر کی طرح کشمیر پر عکس افگن ہوگئی تھی بہر حال معاملہ کچھ بھی ہو، یہ بات اب تاریخی طور پر طے شدہ ہے کہ خالص یونانیوں نے کشمیر پر سو سے ڈیڑھ سو سال تک (ایک سو سال قبل مسیح تک) کشمیر پر حکومت کی ہے اس زمانے میں بھی کشمیر میں نہ فقط یہ کہ ریشیت کا رواج تھا۔ بلکہ ریشیوں کی سماجی پوزیشن اور ان کا مذہبی نفوذ

اس قدر مستند اور معتبر تھا کہ ایک یونانی نائب سلطنت سپل ہور نے جب کشمیر میں اپنا سکہ چلایا تو سکے پر اپنے پورے نام سپل ہور کے بجائے سپل ریشی لکھ دیا یہ سکے ہمارے میوزیم میں اب تک موجود ہیں جن میں خروشتی اور یونانی زبان دونوں میں سپل ریشی دھرم کاسہ کے الفاظ لکھے ہوئے ہیں میں نے یہ سکہ کشمیر کے مشہور تاریخ شناس مرحوم محمد امین ابن مہجور کے پاس دیکھا ہے۔ اس سے کشمیر میں ریشیوں کی تاریخ خود کشمیر کی Dark ages یعنی قرونِ مظلمہ تک پہنچ جاتی ہے کیونکہ کشمیر کی اولین تاریخ نیل مت پران بھی اس عہد کے نو سو سال بعد یعنی ۸۰۰ سنہ ب۔م میں لکھی گئی ہے۔

نیل مت پران وہ اولین نیم اساطیری نیم تاریخی تذکرہ ہے جس میں کشمیر کی تاریخ کے مختلف گوشوں سے پردے سرکتے ہیں۔ حالانکہ اساطیری انداز بیان نے اس کی تاریخی سند کو درجہ اعتبار سے نیچے اتار دیا ہے لیکن اساطیر نے اس تاریخ کو رنگ و آب بخش دیا ہے اور اسے خشک تاریخی تذکروں کے دائروں سے نکال کر طلسماتی وادیوں تک پہنچا دیا ہے لیکن تاریخی حقائق کے ستارے اساطیر کی دھند میں بھی بخوبی پہچانے جاتے ہیں۔

اس نیم تاریخی تذکرے کی ابتداء دسو کی دعا سے ہوتی ہے جو ایک نیک دل اور پارسا خاتون نظر آتی ہے وجہ دعا یہ ہے کہ پرپل گرڈا ایک راکشش کی ناگاؤں سے دشمنی تھی اور وہ ان کا قافیۂ حیات تنگ کر رہا تھا۔ دعا قبول ہوئی۔

"پرداس داہنہ عظیم دیوتا نے خوف سے ہلکان دسو کی سے کہا۔ تم جو لاثانی قوت کی حامل ہو۔ تم مقدس ناگاؤں کے ساتھ ستی کی سرزمین میں رہوگی تم ستی کے آسمانی جھیل کی باشندہ ہوگی"

اسطور کا یہ پہلا ہی تعارفی جملہ اس بات کا غماز ہے کہ یہاں ایک قوم رہتی تھی اور ان کا مقابلہ ایک زبردست دشمن سے تھا۔ اس قوم کی ایک زاہد خاتون جو دیوی کے درجے پر فائز تھی، نے دعا کی، اور آسمانی دیوتا پرداس واہنہ نے اسے یقین دلایا، کہ وہ اور اس کی قوم کشمیر کے سرزمین کی وارث ہوگی۔ استخراجاً دو اہم باتوں کا انکشاف ہوتا ہے اول یہ

کہ وسو کی بذاتِ خود کوئی عابدہ تھی جس کی روحانی قوت کی وجہ سے لوگ اُسے دیوی کا اوتار سمجھتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ مقدس ناگ انگریزی میں وہ Pioma کا لفظ لکھا ہوا ہے جس کے لغوی اور اصطلاحی دونوں معانی کشمیری یا سنسکرت کے ریشی کے نزدیکی مترادف ہو سکتے ہیں، گویا اس دیش کے اولین ساکن یہی ریشی تھے آگے جا کر اسطور میں اس لفظ (ریشی) کی اور بھی وضاحت ہوتی ہے اور یہ لفظ بلا واسطہ اپنے معنی میں اور ہوتا ہے۔

وسو کی کی یہ دُعا بھی قبول ہوتی ہے کہ یہاں کا راجہ شیو کا اوتار ہونا چاہئے۔ یعنی ایک عظیم ریشی جو دین و دنیا پدست ہو، چنانچہ راجہ نیل اسطور میں شامل ہو کر نیم تاریخی انداز میں ناگوں کا کشمیر میں پہلا راجہ ہوتا ہے اور پھر جب راجہ نیل کا جل ادبھو دیو سے مقابلہ ہوتا ہے۔ اس وقت ہمیں ایک اور عظیم ریشی کشپ جی سے تعارف ہوتا ہے کشپ جی یا کشپ ریشی جس کے نام پر کچھ لوگوں کا خیال ہے کشمیر کا نام پڑا ہے پہلے وہ ریشی ہیں جو باہر سے تشریف فرماتے ہیں وہ جب اس جنت نظیر وادی کو مکینوں سے خالی پاتے ہیں تو راجہ نیل سے پوچھ لیتے ہیں کہ یہاں کے رہنے والے کیا ہوئے۔ راجہ نیل اس کے جواب میں نیاز مندانہ پکار اُٹھتے ہیں ریشی آپ کو معلوم ہے کہ جل ادبھو میرے ہاتھوں پلا بڑا لیکن جوان ہو گیا تو یہاں کے لوگوں پر پل پڑا۔ اسی خونخوار کے خوف سے اس ملک کے اہالی آبادیاں چھوڑ کر پہاڑوں اور جنگلوں میں بھاگ گئے ہیں چونکہ برہا نے اسے وعدہ کیا ہے کہ جب تک وہ پانی میں ہو نہ اسے موت آئے نہ کوئی قابو کر پائے۔ اس لئے ہم سخت تنگ آئے ہیں۔ لیجنڈ اس طرح آگے بڑھتا ہے کہ راجہ نیل اور ریشی برما کے حضور میں فریاد کناں حاضر ہوئے۔ انہوں نے تمام دیوتاؤں کو ستی سر پر نازل ہونے کا حکم دیا۔ جل ادبھو اور دیوتاؤں کے درمیان ایک خونین جنگ ہوئی۔ آخر کھا دنیار کے نزدیک دیوتاؤں نے پہاڑ میں شگاف کر دیا۔ اور سر کا سارا پانی بہہ چلا اور اس طرح جل ادبھو دیوتاؤں کے ہاتھوں مارا گیا اور لوگ آزاد ہو گئے۔ اور پھر

Afterwards other gods erected their hermitages in the lake or on the water-less friaces. The sayes whose wealea is penance erected hermitages N.M.P. P.51.

گویا یہاں ہماری ملاقات پھر ریشیوں سے ہوتی ہے۔ اور وہ بھی ستی کی سرزمین میں دیوتاؤں کے سلسلے میں جہاں وہ بے سکون اور تنہا جگہوں پر اپنی جھونپڑیاں بناتے ہیں اس لئے کہ تنہائی ان کا بڑا انعام ہے۔ شاید اب کوئی غلط فہمی باقی نہیں رہتی اس لئے کہ یہاں جس طرح ریشیوں کا ایک طرف صاف تذکرہ ہے اور دوسری طرف اُن کی خلوت نشینی کے ایسے کھلے اشارے ہیں کہ وہ ان بے نام ریشیوں کو تاریخ کے نہاں خانوں سے نکال کر حضرت شیخؒ بلکہ اُن کے بعد کے ریشیوں کے قافلے میں پہنچا دیتے ہیں۔

کشیپ مہاراج کی تشریف آوری کے ساتھ ساتھ شاید یہاں برہمن مت کا چرچا ہونے لگا ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ ناگوں نے اِس کے خلاف مقاومت کا اظہار کیا ہے۔ اور وہ اپنے قدیم مذہب ناگ مت پر ہی قائم رہے۔

قدیم لٹریچر میں کشمیر کو گاندھارا تہذیب کے اہم مرکز کے طور پیش کیا گیا ہے یہ تہذیب موجودہ ضلع اننت ناگ، سے پشاور تک پھیلی ہوئی تھی ٹیکسیلا اس کا مرکز تھا اور اس طرح کشمیر شمالی مغربی سرحدی صوبہ موجودہ ضلع گلگت ایک تمدنی اور سیاسی اکائی میں منسلک تھے پرانی روایات اور نیم تاریخی واقعات سے بھی اس دور کے ریشیوں کے بڑے سارے تذکرے ملتے ہیں جن کے بیان کا یہاں موقع نہیں لیکن پھر بھی تاریخ کے سٹیج تک پہنچنے والے کچھ ایسے نام اپنا جلوہ دکھائے بغیر نہیں رہتے جنہوں نے گاندھارا تہذیب میں نام پیدا کیا۔ اور اپنے ساتھ کشمیر کی شہرت کو بھی چار چاند لگائے۔ عرف عام کے اعتبار سے یہ

سب لوگ ریشی تھے، اِن میں کپل، دھرمی فلسفے یا سانکھیہ درشن کے بانی، ناگو ترے، پتنجلی، مصنف برمار سار تھا، بھی ریشی تھے اور ناگ قوم ہی کے فرد بھی تھے اِسی طرح ناگ ارجن اور ناگا بدھی جو بدھ مت کے عظیم ریشی تھے انہیں ناگاؤں کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ کشپ مہاراج پہلے غیر ملکی ریشی ہے جو یہاں تشریف لے آئے ہیں اُن کے آنے کے ساتھ ساتھ ہی ناگ مت کے متوازی یہاں ایک اور مذہب کا رواج پیدا ہوا، یہ برہمنیت کا شیو بھکتی دور تھا، کلہن کے کہنے کے مطابق اشوک کی حکمرانی سے بھی قبل کشمیر میں شیو مندر موجود تھے اشوک نے خود بھی دو شیو مندر تعمیر کئے تھے اور وہ خود بھی شیو بھگت تھے۔ (کشمیر شیوازم صفحہ ۷)

برہمنیت کا چلن یہاں پہلی صدی قبل مسیح تک رہا لیکن اِس دور میں شیو مت اور وشنو مت میں رسم پرستی اور ذات پسندی کے اظہار نے اِس مذہب کی اصل روح یعنی توحید اور انسانی برادری کے اصولوں کو افسردہ بنا دیا اور اِس کے نتیجے میں یہ مذہب سمٹتا سمٹتا عوام سے دور ہوتا گیا۔ یکم صدی قبل مسیح سے وادی میں بدھ دھرم داخل ہوا، اس دھرم نے اہسا اور انسان نوازی کے اصولوں کو پیش کیا۔ اور وادی کی اکثریت فوراً اس دھرم کے سائے میں آگئی کچھ اِس لئے بھی کہ اِس میں ذات پات کے بندھن کے خلاف زبردست بغاوت کے عناصر موجود تھے اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ یہاں کی ناگ آبادی نے ہمیشہ برہمنیت کی رسوم پرستی اور ظاہر پسندی کے خلاف اپنے ردعمل کا اظہار کیا تھا اور اِس وقت انہیں کھل کر سامنے آنے کا موقعہ ملا تھا۔

یکم صدی ق م سے بدھ مت نے کشمیر میں اپنی جڑیں مضبوط کیں اور عرفانِ نفس اور اہسا کے ابدی نغمے گاتا ہوا وادی میں پھیلنے لگا۔ اِس کے دینیاتی نظام میں اگرچہ ریشیت کی کوئی مخصوص ہیئت نظر نہیں آتی، لیکن تصورِ ریشیت کا آرکی ٹائپ کشمیری ذہن میں دور سے جھلکتا نظر آ رہا ہے وہ بدھ مذہب کے سِدھ یا ارہٹ یعنی ادلیا کو بھی ریشی ہی

سمجھتے ہیں اور بدھ دور کے یہ عظیم روحانی انسان بھی اپنے نفوذ کو مستحکم بنانے کی خاطر اسی آرکی ٹائپ سے فایدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں، مثلاً بدھ دھرم کا مشہور پرچارک اور فلسفی ناگ ارجن شدار دھ ون موجودہ ہاروَن کا رہنے والا تھا۔ ہاروَن اُس وقت ایک شاداب جنگل تھا جو چھ ریشیوں کے جنگل کے نام سے مشہور تھا دراصل ہاروَن سے لے کر کھر یو تک ایک طرف اور صفاپورہ تک دوسری طرف کے سارے جنگل میں ریشی رہا کرتے تھے چنانچہ اب تک بھی صفاپورہ کے عقبی پہاڑ کو ریشی دریز کے نام سے پکارتے ہیں بدھ مت کے عروج کے زمانے میں کشمیر نے کئی بدھ ارہت اور سدھ پیدا کرے جو عرف عام میں ریشی لقب ہی سے یاد کیے جاتے تھے اِن میں ناگ ارجن سب سے زیادہ معروف اور گرامی قدر ہے اِس مشہور ریشی کے علاوہ اِس شجرے میں کٹیا نا پتر، شو گھوش، واسو بندھو، دھرماترا، سنگھ بدر اور سوریادیو شامل ہیں جنہوں نے بدھ مذہب کے پیغام کو نہ فقط گاندھارا کے علاقے میں کام کیا بلکہ اِس کا پیغام کو لنکا، تبت اور چین تک پہنچا دیا یہی وہ وقت ہے جب نیل مت، شیومت اور بدھ مت میں تمدنی ترکیب و تحلیل کا عمل شروع ہوتا ہے چنانچہ کنشک کے عہد میں چوتھی بدھ کانفرنس کے موقعے پر جو ہیں کشمیر میں بلائی گئی تھی، بدھ مت کے دو نمایاں فرقے ہین یان اور مہایان معرضِ وجود میں آئے کشمیری اشوک کے عہد ہی میں مہایان فرقے کے ساتھ مل گئے تھے اور اشوک چونکہ خود ہین یان فرقے کا پیرو تھا اس لئے مہایانی فرقے کے لوگ اُسی عہد میں کشمیر بھاگ آئے تھے مہایان فرقے نے بدھ مذہب کو نئی بنیادوں پر قائم کیا اور پالی زبان کو چھوڑ کر ان لوگوں نے سنسکرت زبان میں نئے بدھ فلسفے کو مدوّن کیا۔ اِس نئے انقلاب کی عمارت کشمیر کے بدھ عالموں کے ہاتھوں تعمیر ہوئی۔ چنانچہ اس نئی تمدنی ترکیب و تحلیل نے شیومت، نیل مت اور ویشنومت کے [illegible] ریشی سادھو بھی اپنے شجرہ طریقت میں داخل کر لیا۔ اِس کا تصور پر یوں پر یہ اثر ہوا کہ انہوں نے دوسرے دیوی دیوتاؤں کے ساتھ بدھ کی مورتی کو بھی اپنے

معبدوں میں جگہ دی اور اُس کی پوجا شروع کی۔ اِس طرزِ عمل سے خود بدھ مذہب کو ایک زبردست نقصان یہ ہوا کہ بدھ مت اب ہندو مت کا ایک فرقہ بن کر رہا اور اُس کی اپنی الگ حیثیت مخدوش ہو گئی۔ چنانچہ آنے والی صدیوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ بدھ دھرم آہستہ آہستہ گہن میں آگیا۔

راجہ اونتی ورمن کے عہد میں بدھ مت کا جاہ و جلال ختم ہو کر یہاں پھر مورتی پوجا شیومت اور وشنومت کا دور شروع ہوتا ہے یہ وہ وقت ہوتا ہے جب ہندوستان اور کشمیر دونوں اِسلام کے طلوع سے آگاہ ہو پاتے ہیں اور اس کے پیغام توحید سے دنیا کے دوسرے مذاہب کی طرح یہاں کے مذاہب بھی وحدت پرستی کے اندازِ فکر و نظر کو سنجیدگی سے دیکھنا شروع کرتے ہیں چنانچہ ہم اس کا بدیہی اثر کشمیر میں دوبارہ عروج پائے ہوئے شیومت میں دیکھ پاتے ہیں جس کا تذکرہ اپنے موقعے پر ہوگا۔

شیومت کا احیاء کشمیر میں آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں شروع ہوتا ہے۔ اِس کے اوّلین مجدّد واسوگپت مہاراج ہیں جو ۸۲۰ء کے اِردگرد کشمیر میں پیدا ہوئے وہ خود بہت بڑے رِشی تھے اور مہادیوگیری کے نزدیک شندار دہ دن (ہاروَن) یعنی چھ رشیوں کے بن میں مصروفِ عبادت تھے کہ اُنہیں شیو سوتروں کا الہام ہوا۔ جے رُدرِ راپا اپنی کتاب کشمیر شیوازم میں رقمطراز ہیں۔

Sage Vasu gupta (825 AD) the author of Siva Sutras is stated to have been the first exponant of this system of ADVITA philosophy based on Siva Sutras. The very essence of Shivagam (Kashmir Shaivism)

P. 11

اِس الہام کے بارے میں جو لیجنڈ اب تک مشہور ہے اُس میں بھی اِس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ ریشی لفظ صاحب بصیرت عابد کے لئے یہاں پر صدیوں سے مروج تھا یعنی یہ کہ اپنی عبادت کے دوران ریشی واسوگپت کو نیل کنٹھ یعنی شو جی مہاراج ایک ریشی کے روپ میں جلوہ گر ہوئے اور اُنہیں شیو منتروں کے دوبارہ احیا کی تلقین کی کیونکہ دُنیا تیزی سے گمراہی کی طرف جاری تھی۔ اِس لیجنڈ سے یہ صاف طور مترشح ہوتا ہے کہ نہ فقط واسوگپت خود بڑے ریشی تھے بلکہ شیو مہاراج بھی اپنا جلوہ دِکھانے کے لئے ریشی ہی کا روپ دھارن کرتے ہیں بہر حال شیو مت نے اپنا اسرار اور عرفان بخشا اور فلسفہ وحدت الوجود پر دیا۔ طریقت کے اس شجرہ نسب میں بھی مختلف ریشی منتج ہیں جن کا باقاعدہ طور شش گردی یا پیری مریدی کا سِلسلہ نظر آرہا ہے اور یہ سب لوگ وقت کے ریشی تھے۔ اس سلسلہ میں کشمیر شیوازم کے مصنّف مسٹر چڑجی کا یہ بیان قابلِ ذکر ہے۔

It will be seen that the origin of the Advaita Shiva faith and Philoso-phy of Kashmir, as the teaching of Agma and Spand shastra on the one hand and the pratya-Bhijna shastra on the other may respectively be called; must be Traced out to the end of the 8th or the begining of the 9th Century. And they were then founded by men who were both regarded as holy sages.

Holy Sage کا اردو یا کشمیری ترجمہ ریشی کے بغیر اور کیا ہو سکتا ہے۔

اس معنوی شجرۂ نسب کی رو سے واسوگپت سے نیچے کچھ اس طرح کا نقشہ ابھرتا ہے

۱. واسوگپت کا گرو شیو جی مہاراج رشی کے روپ میں۔

۲. واسوگپت ۹ صدی عیسوی میں شیو سوتروں کا اولین مصنف

۳. کلٹ نویں صدی عیسوی کے آخری نصف میں

۴. پردمن بٹ کلٹ کا. دل زاد بھائی اور شش

۵. پراجنارجن پردمن بٹ کا بیٹا اور شش

۶. مہادیو بٹ برجنارجن کا شاگرد

۷. شری کنٹھ بٹ مہادیو کا شاگرد اور فرزند

۸. بھاسکر شری کنٹھ کا شاگرد اور دیوارکا کا بیٹا تقریباً گیارھویں صدی عیسوی میں گزرا ہے

۹. لکھشمن بھاسکر کا بیٹا اور شاگرد کھیمراج کا بیٹا

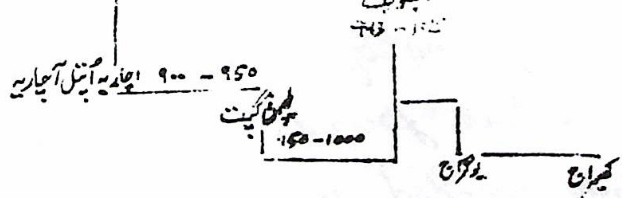
۱۰. یوگراج لکھشمن کا شاگرد اور کھیمراج کا بیٹا۔

۱۱. جے ارتھ جو بارھویں صدی عیسوی میں زندہ تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ جے ارتھ کے بعد کشمیر میں شیو ازم یا ترکا فلسفہ کا کوئی مستند رشی اور عالم پیدا نہیں ہو سکا ہے اور اس صدی میں اسلام بحیثیت ایک تحریک کے کشمیر میں متعارف ہوتا ہے

اس شجرۂ نسب کی دوسری شاخ یعنی سوم آنند سے جو واسوگپت کا شاگرد تھا۔

اس طرح کا شجرہ بنتا ہے۔



یہی ابھنو گپت ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنی آخری عمر میں سرینگر سے جنوب کی طرف موجودہ بیروہ کے پاس ایک گپھا میں داخل ہوا اور پھر کسی نے اسے یا اس کے شاگردوں کو نہیں دیکھا' خلوت پسندی کی ایسی مثالیں اسلامی دور کے بعد کے ریشیوں کی زندگی میں بھی ملتی ہیں اس سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے یہ ہے کہ قبل از اسلام کی یہ ریشی تحریک طلوع اسلام کے بعد بھی چلتی رہی گو اس کی روح میں ایک زبردست تبدیلی ہوئی یعنی اس میں مذہبی وجدان کے طور پر اسلام داخل ہوا' لیکن اپنے عادات و اطوار اور سلوک کے اعتبار سے اس کا تعلق یہاں کی پرانی ریشی تحریک سے بہت زیادہ رہا' بالکل اسی طرح جس طرح ایران میں اسلامی تصوف قبل از اسلام روحانی تحریکوں سے متاثر ہو کر ایک نئی صورت میں جلوہ گر ہوا' چنانچہ بقول علامہ اقبال'۔

> سامی مذہب کردار کے قواعد کا ایک ضابطہ ہے لیکن اس کے برخلاف ہندی ویدانت ایک خشک نظام فکر ہے تصوف ان کی ناقص نفسیات سے گریز کرتا ہے اور تجربہ کے اعلیٰ کلیے کے تحت سامی اور آریائی اصولوں کو متحد کرنے کی کوشش کرتا ہے ایک طرف تو وہ بدھ مت کے تصور نرواں (فنا) کو اپنے اندر جذب کر کے اس تصور کی روشنی میں ایک مابعد الطبیعی نظام تعمیر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور دوسری طرف وہ اسلام سے بے تعلق نہیں ہونا چاہتا اور کائنات سے متعلق اپنے نقطہ نظر کا جواز قرآن سے پیش کرتا ہے وہ اپنے مقام پیدائش کے جغرافیائی موقع و محل کی طرح خود بھی آریائی اور سامی مذاہب کے اثرات کے وسط میں واقع ہے اور دونوں طرف سے وہ تصورات کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے لیکن خود ان پر اپنی شخصیت کا رنگ چڑھا دیتا ہے اس کی نوعیت زیادہ تر آریائی ہے نہ کہ سامی لہذا یہ واضح ہو گیا کہ تصوف کی قوت کا راز اس بات میں پوشیدہ ہے کہ فطرت انسانی کے متعلق اس کا نقطہ نظر

بہت ہی جامع و مکمل ہے اور اِسی نقطہ نظر پر وہ مبنی بھی ہے یہ راسخ العقیدہ لوگوں کے ظلم و تمدنی اور سیاسی انقلابات میں بھی صحیح و سلامت نکل آیا، کیونکہ یہ فطرتِ انسانی کے تمام پہلوؤں کو متاثر کرتا ہے وہ اپنی دلچسپی کو ایسی زندگی پر مرتکز کر دیتا ہے جو انکارِ خودی پر مشتمل ہے اور ساتھ ہی ساتھ آزاد خیالی کے میلان میں بھی مزاحمت نہیں کرتا۔"

(فلسفہ عجم صفحہ ۱۴۳-۱۴۴)

(نفیس اکادمی چھاپ)

اگر اس تعریف کو کشمیر کی ریشیت پر منطبق کیا جائے تو شاید ہماری بہت ساری سمجھ جائیں اور ہمیں خود معلوم ہو جائے کہ ریشیت کن زمزموں سے نہا کر اسلام کی موجودہ شکل میں جلوہ گر ہوا ہے۔

کشمیر میں طلوعِ اسلام

ہندوستان میں محمد بن قاسم کی یلغار ۷۱۲ء - ۷۱۱ء میں ہوئی ہے اور یہیں سے ہندوستان پہلی بار بلاواسطہ طور پر اسلامی تحریک سے متصادم ہوا ہے گو اس سے قبل بھی عرب و ہند میں تجارتی تعلقات موجود تھے اور اسلام کا نیرِ اقبال اپنی درخشندگی سے سرزمینِ ہند کو نواز رہا تھا لیکن یہ فقط انفرادی جستجو اور شخصی عرفان تک محدود تھا بقول راو صاحب سی ایس سری نواس اچاری "حضرت عمر کے عہدِ خلافت میں ۶۳۶ء بمبئی کے پاس تھانہ اور بھروچ پر عربوں کے بحری حملے ہوئے تھے لیکن اس ابتداء کی انتہا محمد بن قاسم کی فتح پر ہوئی"
(ہندوستان کے عہدِ وسطی کی ایک جھلک صفحہ نمبر ۲)

محمد بن قاسم کا حملہ نہ فقط ایک سیاسی حملہ تھا بلکہ ایک دوررس سماجی انقلاب کا پیش خیمہ بھی تھا ہندو مذہب اپنی گوناگوں وسعت کے باوجود فقط مذہبی رسوم تک محدود ہو کر رہ گیا تھا ذات پات اور مذہبی استحصال نے عام انسان کی سانسیں جکڑ لی تھیں اور برہمن اور کھشتری کے بغیر ہر طبقہ مذہبی اداروں کی سرزوری کے بوجھ تلے کراہ رہا تھا اسلام اس کے مقابلے میں انسانی برادری اور مساوات کی ایک تحریک بن کر ہر سرزمین پر قدم رکھ رہا تھا اس لئے عام انسان اس مذہب میں اپنی نجات کی دریں ڈھونڈنے کے لئے سوچ رہا تھا یہی وجہ ہے کہ محمد بن قاسم کے سندھ لئے چلے جانے کے وقت اس وقت کے باسیان سندھ میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی تھی۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ اسلام نے ہر نئی سرزمین میں داخل ہو کر وہاں

کی ہر اچھی بات کو لیا۔ اور اسے اپنے تمدّن میں جذب کر لیا، اِس لیے کہ اسلام فطرتاً جدّت پسند واقع ہوا تھا۔ اور مذہب کو ایک مسلسل عمل جان کر ہر پیغمبر کی صداقت پر مہرِ تصدیق ثبت کرتا تھا۔ وہ علم کو مومن کی گم گشتہ میراث سمجھ رہا تھا اِس لیے علوم و فنون کو ہر جگہ سے حاصل کر لیتا تھا وہ ایک سماجی، تمدّنی اور تہذیبی تحریک کی صورت میں آگے بڑھ رہا تھا اور وطنیت سے زیادہ نقطۂ نظر پر یقین رکھ لیتا تھا اِس طرزِ عمل نے اسلام کو کسی خاص سرزمین میں محدود کرنے کے بجائے ساری دنیا میں ایک ذہنی رویّے کا درجہ دیا تھا اور اِسی لیے سپین سے لے کر جاوا سماٹرا تک اور عراق سے لے کر چین تک اِس کا دائرہ اثر تلوار سے زیادہ تصوّف اور تبلیغ سے بڑھتا رہا۔

اگر ہم کشمیر کی تاریخ کا جائزہ لیں، تو اِس وقت یہاں مہاراجہ للتا دتیہ (۶۹۹-۷۳۶) حکمران رہا ہے۔ وہ اپنی حکومت کی سرحدیں ایشیاء افغانستان اور مغربی ہندوستان تک بڑھا رہا تھا۔ اِس تگ و دو میں ضروری ہے کہ اس کا تعلق بھی کہیں مسلم فاتحین سے پڑا ہو کیونکہ عرب اُس وقت چین پر بھی یلغار کی فکر میں تھے اور یہ صورتِ حال چین اور کشمیر دونوں کے لیے اندیشہ ناک تھی راجہ داہر سندھ میں محمد بن قاسم کے ہاتھوں شکست کھاتا ہے تو اس کا بیٹا جیا کشمیر ہی میں پناہ گزین ہوتا ہے اور عجب یہ ہے کہ اُس کی رفاقت اور رہنمائی ایک عرب مسلمان حمیم بن الحاق کرتا ہے۔ کشمیر کی خاک دامن گیر حمیم کو اس قدر کشش کرتی ہے کہ یہ عرب مسلمان یہیں کا ہو کر رہ جاتا ہے اور اپنی انفرادی کوششوں سے مسلمانوں کی ایک قلیل جماعت بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے کشمیر کی رواداران فضا اس کی کوششوں میں آڑے نہیں آتی، قافلہ آہستہ آہستہ بڑھنا شروع ہو جاتا ہے اور ہندو حکمران کچھ اپنی رواداری اور کچھ عواقب سے بے خبر ہونے کی وجہ سے اِس نئی تحریک پر ہاتھ ڈالنا نہیں چاہتے بلکہ بقدرِ ظرف اِس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور حمیم کی جماعت پہلی بار اپنی الگ بستی

پیچھے مرا اور اپنی مسجد تعمیر کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

دسویں صدی عیسوی کے اوائل میں محمود غزنوی کے حملے شروع ہو جاتے ہیں اور بقول البیرونی بہت سارے ہندو شمالی ہندوستان سے بھاگ کر کشمیر میں پناہ گزین ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کشمیر کی سماجی زندگی میں اسلام کی تعلیمات کا تذکرہ عام ہونے لگتا ہے محمود دو بار کشمیر پر حملہ کرتا ہے اور بقول پروفیسر سیتارام کوہلی "محمود نے جب ۲۳ ربیع الثانی ۴۲۱ھ کو وفات پائی تو اس نے نہ صرف کثیر دولت چھوڑی، بلکہ اس کی سلطنت بخارا و سمرقند سے گجرات و قنوج تک پھیلی ہوئی تھی، جنہیں افغانستان، ماوراالنہر، خراسان طبرستان سیستان کشمیر اور شمال مغربی ہندوستان کے بہت سارے علاقے بھی شامل تھے محمود کے کشمیر کے قبضے کے ثبوت میں مورخ حسن رامو ریشی کے حالات میں لکھتا ہے"۔ جب محمود غزنوی نے کشمیر میں چھاونی مقرر کی تو ان کے (رامو ریشی) کمالات کا شہرہ سن کر ان کی ملاقات سے بہرہ ور ہونے کے لئے چلے گئے۔ ان دونوں اقتباسات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کشمیر پر محمود نے نہ فقط حملے کئے تھے بلکہ اس کا قبضہ بھی کشمیر پر رہا ہے ظاہر ہے کہ ایسے وقت میں نہ معلوم کتنے صوفی کشمیر میں وارد ہو گئے ہوں گے۔ اور اسلامی تحریک کی مفاہمت آگے بڑھ گئی ہو گی خود رامو ریشی کے متعلق حسن کا قول ہے کہ وہ ماوراالنہر یعنی دریائے جیحون کے اس پار کے رہنے والے تھے اور ان کے ساتھ دو اور ریشی تھے شیبان ریشی اور انگون ریشی، اس طرح نہ معلوم کتنے صوفی یہاں آگئے ہوں گے۔ اور جنہیں یہاں کے لوگوں نے اپنے مقامی نقطہ نظر کے تحت ریشیوں کا نام دیا ہو گا اس کے یہ معنی ہے کہ محمود کے قبضے کی صورت ہو یا خالی حملے دونوں صورتوں میں اسلام ایک زبردست تحریک کی صورت میں کشمیر میں آگے بڑھ رہا تھا اور یہاں کی سماجی اور سیاسی زندگی کے آبگینوں میں بال پڑنا شروع ہو گئے تھے شمالی اطراف سے یعنی داستان

میں وسط ایشیائی کے اثر کے سے اِسلام اپنی پوری شدت کے ساتھ پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ اِس طرح کشمیر عملاً اِسلامی تحریک کے نرغے میں تھا۔

داخلی طور پر کشمیر کے حکمران اسلام سے مُتصادم ہونے کے بجائے مفاہمت کو ترجیح دیتے تھے چنانچہ راجہ ہرش ۱۰۸۹ء-۱۱۰۱ء اپنی فوج میں ترک مسلمان کمانڈروں کو جگہ دیتا ہے اور عقیدتاً توحید کا تاثر اُن سے اِس قدر قبول کرتا ہے کہ کلہن اِس کا تذکرہ کرتے ہوئے اُسے ترشکا یعنی ترک مسلمان قرار دیتا ہے کلہن کی بات چشم دید گواہ کی حیثیت سے بہت زیادہ وزن رکھتی ہے اِس لئے بھی کہ اِس کا باپ کامپک راجہ ہرش کی فوج میں ایک اعلیٰ افسر بھی تھا۔

بارہویں صدی عیسوی تک اسلام بحیثیت ایک تحریک کشمیر کی پچھڑی ہوئی ذاتوں کے دل موہ لیتا ہے اور وہ بغیر کسی تیر و تفنگ یا اندرونی دباؤ کے حلقہ بگوشِ اِسلام ہو جاتے ہیں کیونکہ کشمیر میں بھی ہندوستان ہی کی طرح کی صورتِ حال کا سامنا تھا اور مذہبی رسم اور ذات پات کی غلط توجیہہ نے پچھڑی ذاتوں کو پناہ ڈھونڈنے پر مجبور کیا تھا چنانچہ مسلمانوں کا رسوخ اِس حد تک بڑھ پاتا ہے کہ لکشمن دیو ۱۲۷۳ء میں یہاں تخت نشین ہوا تو ایک ترک مسلمان ختیلا نے ۱۲۸۶ء میں اُسے تخت سے اُتار دیا لیکن عوام پر اِس انتقالِ اقتدار کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ ۱۳۰۱ء تک کشمیر میں اِسلام کی حیثیت مستحکم ہو گئی ہوتی ہے یہ راجہ سہدیو کا وقت ہے اِسی دوران رینچن ایک لداخی شہزادہ اور چترال یا دوسری روایات کے مطابق راجوری کا رہنے والا شہمیر کشمیر پہنچ جاتے ہیں راجہ سہدیو نہ فقط انہیں پناہ دیتا ہے بلکہ انہیں اپنی حکومت کا مختارِ کل بنا دیا ہے سہدیو کے ہی مختصر عہد میں رینچن نے اِس قدر رسوخ حاصل کیا ہوتا ہے کہ راجہ کی موت پر رینچن تختِ کشمیر پر ۱۳۲۰ء میں قابض ہو جاتا ہے اور پھر حضرت بلبل شاہ کے زیرِ اثر مسلمان بن جاتا ہے اور کشمیر کا

پہلا مسلمان بادشاہ کہلاتا ہے۔

اِس نئی صورت حال کے نتیجے میں کشمیر دو تہذیبوں کے تاریخی موڑ پر ایک بار پھر پہنچ جاتا ہے۔ کشمیریوں کے لئے یہ صورت حال نیا یا انجانا نہیں تھا بلکہ اس کی تہذیبی زندگی میں کئی بار ایسے موڑ آتے تھے اور اس کی شریانوں میں مختلف تہذیبوں کے امتزاج سے ایسا لہو دوڑ رہا تھا جو کئی تہذیبوں کا امانت دار تھا پچھلے صفحات میں اِس بات کی طرف تفصیلی اشارے کئے گئے ہیں کہ کشمیر میں تمدنی تہذیبی اور مذہبی در و بست اس کی تاریخ کی ابتداء ہی سے شروع ہوتی ہے یہ سلسلہ آریاؤں کے وسط اشیاء سے اُٹھ کر ہندوستان پر چھانے کی کوشش ہی سے تاریخ کے اوراق میں منتشر صورت میں نظر آتی ہے۔ زمانہ شجاعت کے کئی واقعات گواہ ہیں کہ تمدنی انقلابات اور سیاسی شطرنج بازی کے پیش نظر کشمیر کو غار نشینی سے نکل کر میدان جنگ تک آنا پڑا ہے نیل مت اور برہمنت میں تصادم ہوا تو کشمیر کی تحمل آفرین تمدنی وتستانے ایک نئی تہذیب اور ایک نئے مذہبی انداز نظر کو پیدا کیا جو یہاں کے تحمل اور فراست کے زمروں سے نتھار کر شستہ اور رفتہ انداز میں تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے برہمنیت اور بدھ مذہب کا امتزاج ہوا، تو برہمنیت نے ختم ہوتے ہوتے بھی بدھ مذہب پر اپنے اثرات مرتسم کر لیئے، بدھ مذہب کے زوال پر اس کا سابقہ شیومت سے پڑا، تو خود بدھ مذہب نے جاتے جاتے شیومت پر اپنے تاثر کی چھاپ لگادی اور ایک نئے تمدنی دھارے کو پیش کیا جس میں بدھ مت کی غار نشینی ترک لذات اور ترک دنیا سب ہی اثرات بڑے نمایاں طور پر نظر آرہے تھے اِس کے بعد ایک خاموش انقلاب کی جلو میں اسلام اور شیومت (جو اُس وقت اپنے امتزاج کے اعتبار سے نیل مت برہمنیت، بدھ مت اور شیومت کے اقدار سے مالامال تھا) ایک دوسرے سے آنکھیں ملاتے نظر آتے ہیں لیکن یہ سابقہ مخاصمانہ ہونے کے بجائے مفاہمانہ

ہے اسلام اور تر کا فلسفے کے اس خاموش تصادم سے ایک نیا امتزاج تاریخ کے جھروکوں کو سجاتا ہے، جس میں شیومت کا فلسفہ وحدت الوجود بدھ مت کی غار نشینی ترکِ دنیا اور ترکِ لذات اسلام کے توحید، مساوات اور انسانی برادری کے مشفقانہ رویئے سے مل کر ایک نئے ذہنی رویئے کو جنم دیتا ہے۔ جس میں اسلام کی بالادستی قدم قدم پر نظر آتی ہے ان سب چیزوں کے پیکر کو ایک صورت میں پیش کرنے والی اولین شخصیت لل دید کی ہے کشمیر کے لوگ اس نئی تحریک کو اپنے پرانے نام یعنی ریشیت سے پکارتے ہیں اور اس کے چلانے والوں کو ریشی کے لقب سے نوازتے ہیں اس سے پہلے کہ اس سلسلے کو حضرت شیخ نورالدین نورانیؒ کی مبارک ذات تک پہنچایا جائے لازم ہے کہ اس طرز عمل کے بانی حضرت للہ عارفہ یا للیشوری کے عارفانہ کردار پر بات ہو۔

للہ عارفہ

پچھلے صفحات کے مطالعے سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ کشمیر میں تمدن سازی کا عمل مختلف زمزموں سے ہمکنار آیا ہے اور اس کے پیکر میں نیل مت، شیومت، وشنومت اور بدھ مت کا چونا گارا استعمال ہوا ہے اور اس تمدنی امتزاج نے جو آخری شکل اختیار کی تھی وہ کشمیری شیوازم کی تھی ۱۳۰۲ء میں رینچن کی تخت نشینی کے بعد ہی یہاں اسلامی حکومت کا عمل دخل شروع ہوتا ہے فلسفے کے اعتبار سے اس وقت یہاں شیو فلسفے کا چلن ہوتا ہے لیکن عوامی ذہنوں میں ابھی تک بدھ مت کا اثر بھی تازہ ہی ہوتا ہے خاص طور پر یہاں کے عام سماجی ذہن پر بدھ اعتقادات کا بڑا چلن ہوتا ہے کشمیر کی تاریخ میں جھانک کر دیکھا جائے تو نو سال کے عرصے میں اس مذہب نے کشمیریوں کا ذہن بنانے میں بڑا سارا کام کیا ہے اسلامی تہذیب اور اعتقادات کے اس سرزمین پر قدم رکھنے کے ساتھ ساتھ ہی اس کا مقابلہ ایک طرف سے شیو فلسفے سے پڑا اور دوسری طرف بدھ مذہب کے گہرے نفوذ سے آنکھیں ملانا پڑیں۔ چنانچہ دو بڑے تمدنوں کا یہ تصادم ایک نئے امتزاج کا متقاضی تھا وقت نے اپنا کام کیا اور کشمیر ایک بار پھر ایک نئے تمدن کے سحر کے دروازوں پر دستک دینے لگا اس نئے تمدن کو اگر انسانی پیکر میں تراشا جائے تو ہمیں لازماً اس کا نام لل دید دینا پڑے گا کیونکہ یہی وہ عارفہ ہے جس نے نہ فقط نئے تقاضوں کو پہچانا، بلکہ ایک نئے عہد کو جنم دیا۔ یہ عہد آفریں شخصیت بظاہر مجذوبہ تھی لیکن اس کا پیغام اور اس کی حیات امن، سکون، انسان نوازی، صبر تحمل اور انکساری کی ہزار بہاروں کو

جنم دیتی ہے اسلام کی نوید توحید اور پیغام انسانیت نے اگرچہ نویں صدی عیسوی ہی سے یہاں کام کرنا شروع کیا جس کے نتیجے میں کشمیر شیوازم نہ تو ذات پات کا قایل رہا تھا اور نہ ہی کثرت پوجا کا لیکن اس دوران میں کوشش یہ ہو رہی تھی کہ شیومت کو نئے تقاضوں کے مطابق بنا کر اس نئے مذہب کا جواب پیدا کیا جائے جو توحید و مساوات کا قایل ہے لل دید کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ اس نے خود کو کسی مذہب سے منسلک نہیں کیا۔ بلکہ اس کے مقابلے میں ایسے تقاضوں کے نقیب کی حیثیت سے کام کیا جو خذ ما صفا و دع ما کدر کے مصداق تھے جو ہر نیکی ہر چیز کو خواہ وہ کسی مذہب کسی فرقے سے متعلق ہو حاصل کرنے کی تلقین کرتا تھا اس طرز عمل نے لل دید کو ہندوں اور مسلمانوں میں یکساں عظمت اور اہمیت کا حامل بنا دیا۔ حتیٰ کہ لل دید کی نیم تاریخی شخصیت کشمیری روایات کے سانچے میں پڑ کر سب سے زیادہ ہر دلعزیز اور سب سے زیادہ دلنواز سچائی کی حیثیت میں تاریخ کے مردہ اوراق کے بجائے ہر نسل کے زندہ دلوں میں جنم لیتی رہی اور ہر جوان خون اور بوڑھے تفکر میں شامل رہی۔ چنانچہ خواجہ اعظم دیدہ مری اس کے بارے میں رقمطراز ہے۔

"عارفہ کاملہ لل مجذوبہ را جذبۂ الہیٰ رو دادہ و دل با انقطاع نہادہ چندے لبسر دفعا نی گزرانید د کسے خویش و پیوندے بحالت باطنی آں مجذوبہ در د مندے برد"

اور حضرت بابا داود مشکواتی لکھتے ہیں۔

شور انگیختگان بادیۂ محبت و راہ شناساں وادی حقیقت واز طبل زندگان معرکہ وحدت و گوہر شناساں بازار معرفت بود"

اور حضرت بابا نصیب الدین کا قول ہے۔

جذبۂ حق آتشے زد خرمنش ... نورِ عشقے سر برآورد از تنش

بادۂ توحید مست از روز ازلی ... وز خمار بادہ خوش مخمور مست

للہ دید اگرچہ ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوئی۔ اور ایک ایسے ماحول میں تربیت پائی، جو سراسر ہندوانہ تھا۔ لیکن خشرستانِ حیات کے ہر ہر قدم پر اُس نے نئی صداقتوں کا استقبال کیا، انہیں اپنے دِل میں رچایا، اپنے ذہن میں بسایا، اور پھر ان کا واشگاف اعلان کیا۔ چنانچہ بت پرستی کے خلاف للہ دید کا جہاد اس قدر زبردست ہے کہ ذہنی طور پر للہ اس دور کی سب سے بڑی بُت شکن تصور کی جاتی ہے۔ اپنے استاد محترم سید حسین سمنانی کے ساتھ للہ کے مکالمے اور پُر معرفت اندازِ تخاطب کا اظہار اُس کی ذہنی پختگی اور قلبی بصیرت کا پتہ دیتے ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے کہ للہ کی دیوانگی اُس وقت کے رسوم زدہ سماج کے خلاف ایک کھلی بغاوت تھی۔ وہ قلندرانہ شان اور مجذوبانہ جلال کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی اور عام لوگ چونکہ سماجی بندھنوں کے غلام تھے، اور اپنے آپ کو دھارے سے باہر نہیں نکال سکتے تھے اس لئے اُس کی مآل اندیشانہ باتوں کو مجذوب کی بڑھ سے تعبیر کرتے تھے لیکن اگر ہم للہ دید کے حسی حیات اور وجدانی اندازِ نظر کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ دیوانوں کی بستی میں ایک وہی فرزانہ تھی اس لئے کہ ایک وہی ہے جسے تاریخ نے کندن سمجھ کر آئینہ تک لاثانی ہونے کا اقرار کیا اور تاریخ ایسے اقرار نامے بغیر دعویٰ دلیل کے نہ تو تسلیم کرتی ہے اور نہ قبول، عام انسان کا بقول پریم ناتھ بزاز یہ حال تھا کہ

the warfare of Ideas and Ideals in which the people of Kashmir were involved in the 14th Century was no ordinary one ; It was a gigantic clash of two great Cultures of the world. Islam and Brahmanism were in grips with each other. the Impact on the Common mind

was terrific It was quite different for the average man to decide what was true and what was untrue If and when he was allowed to make a choice for himself, He was simply bewildered and dazed.

برنارڈ صاحب کے اس نقطۂ نظر میں اگرچہ سو فیصد صداقت نہیں اس لیے کہ عام انسان بھی اُس وقت فیصلے میں مصروف تھا جب اُس نے ذات پات کی بندھنوں اور رسم پرستی سے چھوٹنے کی خاطر اسلام کو گلے لگایا تھا لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہاں عوامی اندازِ نظر ہی کام کر رہا تھا، شعوری طور پر تقاضوں کو پہنچاننا اور اپنے ردِ عمل کا اظہار کرنا کچھ اور ہے اور یہاں پہنچ کر ہماری نظر پھر اُسی نورانی مجذوبہ کے دروازے پر جاکر ٹھہرتی ہے جس نے اپنے جسم کو روح کی سب سے بڑی خانقاہ بنا دیا تھا۔ اور مختصر بستانِ ہستی میں لا و اِلا کی چوگان بازی میں مصروف تھی، حالانکہ عوام تو عوام خواص کا بھی یہی حال تھا اِسی لیے جب

رینچن شاہ نے بقول شری پریم ناتھ بزاز ہندو مذہب کی پناہ میں آنا چاہا، تو ہندو نے
اُسے دھتکار دیا جس کے نتیجے میں وہ اسلام کی آغوش میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا
شری پریم ناتھ بزاز ایسے مذہب زدہ لوگوں کو کم نظر اور کم سواد سمجھتا ہے۔

During the short rule of King Rinchana afterwards slighted by short sighted Brahmans and forced to embrace foll-owed him into the fold. Thus the people fairly acquainted with its culture and traditions, as well as the customs, and observances of Muslims.

بزاز صاحب نے معاملے کے سماجی پہلو پر غور فرما کر اور پہلوؤں کو نظر انداز کیا ہے
اور اُس ماحول اور صداقت کی بات نہیں کی ہے جس نے اسلام کو دل نشین بنا دیا تھا۔
دراصل میرے خیال میں یہ دور کئی اور پچھلے ادوار کی طرح روحانی تشنہ لبی کا دور رہا
ہے اس لئے اِس پیاس کو بجھانے کی خاطر عام آدمی اپنے عامیانہ انداز میں اور خاص
لوگ اپنی صداقت پرستی کے دائروں سے نئے پیغام کے زمزموں سے ہمکنار ہونے کے

لئے بے تاب تھے اسی لئے ہمیں لل دید جیسی عارفہ کاملہ بھی مسلمان صوفیوں کے ساتھ
عرفانِ نفس کے بلند مقامات پر اکتسابِ فیض کرتی نظر آتی ہے اس سلسلے میں
بزاز صاحب خود ان الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں کہ

As one whose consuming passion was ceaseless search after truth Lalla could niether ignore the rapidly spreading creed, nor even remaining indeffernt to it. when Sayed refuges poured in to Kashmir from Hamadan and other towns of Iran. She lost no time and opportunity to meet them and hear the expositions of the best informed and the most learned amongthem. She had

long interviews and frequent arguments with Syed Jalalud-Din Bukhari, Sayed Hussain Simnani and Sayed Mir Ali Hamadani.

اِس بات کی تصدیق نہایت پرانی تاریخوں سے ہوتی ہے کہ للہ عارفہ نے اپنی عارفانہ راہوں کو اسلامی عقائد کے صدق و صفا سے روشن کرلیا تھا چنانچہ مصنف اسرار الابرار اور مورخ حسن دونوں اس بات کے قایل ہیں کہ اسلامی تصوّف کے اعلیٰ مقامات کو للہ دید نے جہانیاں جہاں گشت حضرت میر سیّد جلال الدین بخاری سے پہلی بار حاصل کیا اور انہوں نے ہی للہ دید کی بیقراری کو دیکھ کر اُن سے کہہ دیا کہ حضرت میر سیّد حسین سمنانی رح کی ارشادتِ عارفانہ للہ دید کی بیقراری اور بے سکونی کو قرار و سکون سے ہمکنار کرسکتی ہے حسن رقمطراز ہے "اسی زمانے میں حضرت سیّد جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشت قدس سرہ کشمیر تشریف لے آئے۔ للہ عارفہ ہیرہ پورہ تک اُن کے استقبال کو گئی اور ملاقات ہونے پر جو بات حیرت انگیز تھی وہ دونوں کی حال پرسی اور بات چیت تھی دونوں اپنی اپنی زبان میں پوچھتے بھی تھے اور جواب بھی دیتے تھے اور بغیر کسی ترجمان کے ایک دوسرے کے خیال کو اچھی طرح سے سمجھ پاتے تھے حضرت للہ کی دیوانگی، بے چینی اور اضطراب کو دیکھ کر حضرت سیّد نے دلاسہ دیا، تسلی اور تشفی سے کام لیا، للہ کو سمجھایا کہ دیوانگی اور شوریدگی پر قابو رکھنے کی ضرورت ہے۔

"تذکرۃ اولیا" (صفحہ نمبر ۴۸ - ۴۹)

شاید یہ اسی بات کا اثر تھا کہ لل دید وحدت پرستی اور توحید پسندی میں بہت آگے بڑھ گئی اور بت پرستی اور رسومات کی پابندی کے خلاف زبردست جہاد کیا۔ عرفانِ نفس کی عظمتوں کا تذکرہ کیا، اور دنیائے دوں کی غلامی سے اپنے استکراہ کا بار بار اظہار کیا۔ اس طرح لل دید، شیومت، بدھ مت اور اسلامی وحدت الوجود کے چشموں سے نہا کر ایک نئے اور تر و تازہ اندازِ فکر و نظر کو پیش کر رہی تھی جس میں ان تمام فلسفوں کی خیر و برکت کا حسنِ ابد ٹپک ٹپک رہا تھا، بقول بزاز صاحب!

The glorious outcome of this mental churning was the syn-thesis of the ~~two~~ philosophies which was given to the world in poetic sermons by the wandering Ministrels through the rest of Herlife

حضرت شیخ نورالدّین نورانیؒ

سلسلۂ ریشیہ کے مجدّد

للہ عارفہ کی دِل نواز راہِ معرفت کے چراغ ابھی روشن تھے اور اُس کے صوفیانہ نغموں کی دھن ابھی تک عظمتِ کمال کو چھو ہی رہی تھی کہ اسی دور میں اُس کے فرزندِ معنوی حضرتِ شیخ نورالدین نورانیؒ تولد ہوئے للہ ابھی تک زندہ تھیں اور اُس کے عرفان کی سب ہی منزلیں طے ہو چکی تھیں اُس نے سماج میں دِلنوازی، انسان دوستی عرفانِ نفس، اور انہدوں ہی کی حیثیت میں ایک علامت کا درجہ پالیا تھا۔

حضرتِ شیخؒ کے والدین شیخ سالار دین اور صدرہ ماجی حضرت شیخؒ کی ولادت سے بہت پہلے مسلمان ہو چکے تھے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ حضرت سید سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ حق پرست پر ایمان لائے اور کچھ مورخوں کی رائے ہے کہ یہ مشہور ریشی یاسمن کی نظرِ کیمیا اثر کی کرامت تھی بہرحال معاملہ کچھ بھی ہو یہ بات ثقہ ہے کہ حضرتِ شیخ کے مبارک مولود کے موقعے پر اُن کا ماحول مسلمان تھا عام طور پر مشہور ہے اور اکثر مورخوں نے اپنے تذکروں میں اِس بات کو زور دے کر لکھا ہے کہ حضرت شیخ نے اپنی ولادت کے وقت اپنی دا'مہ صدرہ ماجی کی چھاتیوں سے دودھ نہیں پیا، حتیٰ کہ للہ دیدؒ تشریف فرما ہوئیں اور بچے کو اپنی چھاتیاں دِکھا کر کہا۔

'پی، آنے سے شرمائے نہیں، پینے سے کیا شرماتے ہو' یہ سن کر حضرت شیخؒ نے دودھ

پینا شروع کیا اس بظاہر خرق عادت واقعے میں ایک زبردست علامت چھپی ہوئی ہے وہ یہ کہ حضرت شیخ رح نے سب سے پہلے عرفان کی چھاتیوں کے زمزم اپنی والدہ کے بجائے لل عارفہ ہی سے حاصل کئے۔

حضرت شیخ نورالدین نورانی رح آٹھویں صدی کے نصف دوم میں کتم عدم سے منصۂ شہود پہ آئے ہیں (میں نے جان بوجھ کر صحیح سال پیدائش کا تذکرہ نہیں کیا ہے اس لئے اس سلسلے میں مورخوں کی مختلف رائیں ہیں کچھ لوگ ۷۵۷ھ کے قائل ہیں کچھ ۷۷۹ھ کے اور اسی طرح سے کچھ لوگ ۸۴۲ھ کو اُن کی تاریخ وفات مان لیتے ہیں اور کچھ ۸۳۷ھ کو)

اس وقت اسلام اپنی پوری تابانیوں اور ضوفشانیوں کے ساتھ کشمیر میں جلوہ گر ہوتا ہے اور توحید و مشاہدات کا عمل اپنے منطقی نتیجے پر پہنچا ہوا ہوتا ہے اسلامی صوفیائے کے عمل دخل اور اُن کی تشریف آوری نے اسلام کے ظاہری نظام ہی نے تسخیر قلوب کا کام شروع کیا اور لوگ جوق در جوق زمرۂ اسلام میں شامل ہو رہے تھے اسلامی صوفیاء (جن میں زیادہ تعداد سادات کی تھی) کشمیر میں ایران اور وسطِ ایشیاء سے واردِ کشمیر ہوئے تھے اس لئے ظاہر ہے کہ اسلام کا اس تصوفی نظام میں ایرانی اثرات بھی موجود تھے اور یہ زیادہ تر وحدت الوجودی اندازِ نظر کا قائل تھا حالانکہ رسیدہ صوفی وحدت الشہود کی منزلوں تک بھی پہنچ چکے تھے لیکن اس مرحلے تک پہنچنے کے لئے بھی وحدت الوجود کی منزلوں سے ہی راستہ جاتا ہے اس لئے عام اندازِ نظر وحدت الوجودی ہی تھا وسط ایشیاء سے آئی ہوئی یہ نئی تہذیب وہاں کے مختلف تمدنوں کی خوشبو سمیٹ کر اپنے اندر جذب کر چکی تھی اس انجذاب میں ویدانت، بدھ مت، زرتشتیت، نوفلاطونیت اور دوسری عقلیاتی تحریکیں پہلے ہی ایرانی فلسفہ تصوف میں شامل ہو چکیں تھیں اور وہاں اسی تہذیبی انجذاب کے نتیجہ میں مختلف نکتہ ہائے نظر اور مدرسہ ہائے فکر پیدا ہوئے تھے جن کے ڈانڈے ایک طرف

سے ہندوستان کے ساتھ ملتے ہیں اور دوسری طرف سے عراق و عرب سے جہاں خلافتِ بنو عباسیہ کے طفیل اسلامی تمدن میں پہلی بار فلسفہ کو بارآوری کا موقع ملا تھا چنانچہ متکلمین فلاسفہ اور صوفیائے کے درمیان نویں صدی عیسوی سے سولویں صدی عیسوی تک ایک حشر انگیز کشمکش تمام عالمِ اسلام میں نظر آتی ہے منصور حلاج کی تصلیب حضرتِ شہاب الدین سہروردیؒ کی شہادت اور ایسے ہی ہزاروں واقعات اِس کشمکش کی نشان دہی کرتے ہیں تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان سے لے کر اسپین تک اور ٹیونس و مراکش سے لے کر حجاز و اسماٹرا تک اثرپذیری کا ایک عجیب اور لمبا سلسلہ نظر آتا ہے جہاں ہر قوم نے اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے، دوسرے تمدنوں سے تاثر حاصل کیا ہے۔

اِسلام بحیثیت مذہب کسی بھی جدت پسندی کا قائل نہیں، بلکہ وہ اپنے آپ کو اسی قدر پرانا سمجھتا ہے جس قدر بذاتِ خود حیاتِ انسانیت ہے وہ ہر پرانے تمدن پرانے خیال اور پرانے مذہب سے نیکی خیر برکت اور حسن کے اجزا حاصل کرتا ہے اور اسے اپنے نظامِ فکر میں کچھ اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ خیر و برکت کی یہ تمام چیزیں خود اُس کی اپنی معلوم ہوتی ہیں پیغمبرِ انسانیت حضرتِ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر پرانے پیغمبر کی نبوت کا اقرار کیا اور "قرآن" نے دنیا کی قوموں سے یہ کہہ کر بے نام نبیوں کی صداقت کا بھی اقرار کیا اِس جذبے نے اسلام کو وطنیت کے بندھنوں سے آزاد کر کے اسے ایک State of mind یا ذہنی رویہ بنا دیا، اور یہی ذہنی رویہ تحریک کی شکل میں پھیلتا رہا۔ اور اپنی جلو میں تاثر آفرینی کے ہزاروں قافلے لے کر چلا، جس نے قوموں کے باہمی ارتباط کے ذریعہ مختلف قوموں کی اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے جذب و تحلیل کا ایک زندہ عمل جاری رکھا۔

ایران یا وسطِ ایشیاء سے جو صوفی بزرگ کشمیر میں تشریف لے آئے، وہ ایرانی تصوف کو اپنے ساتھ لیتے آئے تھے جس میں اب تک کئی تمدنوں کا خون شامل ہوا تھا اس کا اپنا

ایک طرزِ باطنی اور نظامِ تصوف تھا چونکہ توحید، رسالت، مساواتِ انسانی، صبر و تحمل رواداری اور تالیف قلوب اس نظامِ تصوف کے نمائندہ اصول تھے اس لئے لوگوں کے قلوب اپنی بساط کے مطابق اس نئے اندازِ فکر سے متاثر ہوئے، لل دید سے پہلے بھی ہمارے مؤرخ کشمیر میں مقامی صوفیوں یعنی رشیوں کی نشان دہی کرتے ہیں جو تن تنہا غاروں اور کوہساروں میں عبادتِ خدا اور اپنی عاقبت سنوارنے میں مصروف تھے لل دید نے اپنے عقائد کے دھارے کو اپنی فلسفانہ شاعری کے اشہبِ سبک گام پر سوار کرکے اسے عوام کے قلوب تک پہنچا دیا ایسے ہی وقت میں حضرت ریشؒ علیہ الرحمۃ کا ادراکِ ظاہری اور شعورِ باطنی بیدار ہو رہا تھا آپ کے ارد گرد صدیوں پرانی کشمیری تہذیب و تمدن کے رخشندہ و درخشندہ روایات تھے، ذہن و خیال توحید و رسالت کی دولت سے مالا مال تھے اور نئے ترقی پسند خیالات کو خالص کشمیری شکل میں لل دید کی بزرگ عارفانہ اور شاعرانہ حیثیت نے عوام کے دلوں تک پہنچا دیا تھا حضرت ریشؒ رحمۃ اللہ علیہ اسی راہ پر چل دئے، اس لئے کہ بقول علامہ اقبال،

"ذہنِ انسانی اپنی ایک مستقل انفرادیت بھی رکھتا ہے اور خود بخود اپنے اندر ایسی طاقتوں کو نمو دے سکتا ہے جن کی صدیوں پہلے دوسرے اذہان نے بھی پیش بینی کی ہو، کوئی تصور کسی قوم کی روح میں جاگزین نہیں ہو سکتا، تاوقتیکہ وہ ایک لحاظ سے خود اس قوم کا اپنا تصور نہ ہو، خارجی موثرات ان تصورات کو گہری غیر شعوری نیند سے بیدار کر سکتے ہیں لیکن وہ کسی طرح عدمِ محض سے اُس کو وجود میں نہیں لا سکتے۔" (فلسفہ عجم صفحہ ۱۴۲،۱۴۱)

سادات ایک برتر تہذیب لے کر وسطِ ایشیاء سے کشمیر آئے تھے اس تہذیب میں تمام عالم اسلام کی روشن روایتوں کی تابانی موجود تھی اور مقامی طور پر بھی ایک عظیم تہذیب موجود تھی جس نے کبھی چین سے لے کر برما تک اور ایران افغانستان یا کوسیلون

اور ہند چینی تک اپنی عظمت کے جھنڈے لہرائے تھے یہ تہذیب اگرچہ افسردہ ہو چلی تھی لیکن اس کا زبردست اثر یہاں کے لوگوں میں نسلاً بعد نسل آرکی ٹائپ کی صورت اختیار کر چکا تھا سادات جو کچھ ساتھ لے کر آئے تھے اُس کے بنیادی اجزاء یہاں کے مذہبی فلسفے میں پہلے ہی سے موجود تھے، گو اِن کی صورت کسی حد تک بدل گئی تھی لیکن اپنے اصل کے اعتبار سے شیومت توحید الاصل تھا اور بت پرستی اور رسوم پسندی اِس کے اصل سے کوسوں دور تھی اسلامی صوفیوں اور سادات نے اِسی اصل پر زور دیا اور اس کے ساتھ حضور رسالت مآبؐ کی رسالت پر ایمان لانے کا اضافہ کیا نتیجے کے طور پر یہ نیا تمدن یہاں کے اصلی باشندوں کو کسی بھی طرح انجانا اور غیر نہیں لگا۔ آنے والا تمدن اس حیثیت میں ترقی پسند تھا کہ اِس کے اجزا میں نہ فقط مختلف تمدنوں کا خون تھا بلکہ مختلف اجزائے کی ترکیب و تحلیل ایک ترقی پسند تحریک کی صورت میں وقت کے تقاضوں کے عین مطابق ترتیب پا گئی تھی اور تمدن کے ہر پہلو میں قدامت اور کہانت کے بجائے جدت اور عصر شناسی کی آبرو ٹپک رہی تھی کشمیر میں اِن دونوں کے اولین ثمر کے طور پر لل دید کے عرفان و آگہی کے سرمدی چشمے پھوٹے لیکن لل دید اپنی مقبول عام سرمست شاعری کے باوصف اپنے پیغام اور آشوبِ آگہی میں تن تنہا تھی آنے والے سادات اور صوفی ترقی پسند رجحانات کے باوصف ایک محدود دائرے میں ہی اپنے نفوذ کو قائم کر سکتے تھے یہ دائرہ کشمیر کے اِنٹی لیکچولز، یا سیاست داں کے اعتبار سے اہلیت کا حلقہ تھا اُن کے پیغام نے یہاں کے سربرآوردہ طبقہ کو اپنے دائرے میں شامل تو کیا لیکن اُن کے پیغام میں وہ عوامی اپیل پیدا نہ ہو سکی جو اس بشارت کا لہو عام انسان کے خون میں داخل کر دیتی جدلیاتی اعتبار سے یہ بہت ضروری بھی تھا اور اسی جدلیاتی تقاضے کو پورا کرنے کی خاطر قدرت نے علمدارِ کشمیر، شمس العارفین حضرت شیخ نورالدین نورانیؒ کو چن لیا۔ وہ عقیدتاً پکے

مسلمان تھے اور اسلامی تصوف کے تقاضوں سے باخبر تھے اُن کے تصوف کے ابتدائی مراحل حضرت سید میر حسین سمنانی کی فیضِ صحبت میں گزارے تھے اِس لئے وہ لوازمِ سادات اپنے ساتھ لے آئے تھے حضرت شیخؒ کے فانوسِ خیال اور قندیلِ دل میں زندگی کے اوائل ہی سے فروزاں تھا وہ اس پیغام کو یہاں کے تقاضوں کے پیشِ نظر عام انسانوں کے دلوں تک لے جانا چاہتے تھے مقامی روایات آر کی ٹایپ کی صورت میں اُن کے فکر وخیال میں بسی ہوئی تھیں اور توحید و رسالت اور عام اسلامی عقائد کی شمعیں سادات کی صحبت نے اُن کے ذہن وخیال میں فروزاں کی تھیں اِلل دید کی رہنمائی نے اِن عقاید سے ایک نئے اندازِ فکر کی نیو ڈالی تھی اس لئے حضرت شیخؒ کے لئے ایک متحدہ تمدن کی تشکیل کا راستہ صاف تھا گو وہ پہلے کشمیری الاصل مسلمان صوفی تھے جو اسلام کی حقانیت توحید مساوات انسانی عاقبت بینی اور آخرت اندیشی کی مشعلیں روشن کر کے اس ترقی پسند رجحان کو کشمیر میں عام کر رہے تھے جو اب تک بڑھنے اور پھیلنے کے باوصف عام اذہان تک اپنی پوری توانائی کے ساتھ نہیں پہنچ پایا تھا کشمیریوں نے اپنے اس دلاویز خندہ جبین شگفتہ دل صوفی کو بھی ریشی کے نام سے پکارا اور حضرت شیخؒ نے خود بھی اپنے لئے یہی لقب اختیار کیا اِس لئے کہ ریشی لفظ صدیوں سے ایک علامت تھی اور ہمارے عوام اس لفظ کی باطنی تاریخ سے بخوبی واقف تھے حضرت شیخؒ نے پہلی بار اسی مقامی لفظ یعنی ریشیت کو اپنا کر اسلام کی تبلیغ و ترسیل کا کام شروع کیا وہ شروع کے باراں سال کیموہ کے غار میں خلوت نشین رہے لیکن اس دوراں بھی حضرت سید حسین سمنانیؒ کی خدمت میں فیضیاب ہونے کے لئے آتے رہے اِس کے بعد کی زندگی میں حضرت شیخؒ نے نہ فقط یہ کی تقریباً سارے کشمیر کی سیاحت کی بلکہ ریشیت کو ایک تحریک بنانے کے لئے ساری زندگی وقف فرمائی اور اس کے ساتھ ساتھ تبلیغ و ترسیلِ اسلام

کا کام کرتے رہے چنانچہ ہماری تاریخیں ایسے تذکروں سے بھری پڑی ہیں جہاں وہ ایک طرف سے بمہ ساد ایک زبردست برہمن کو بحث و مباحثہ میں ہرا کر اُسے اپنا پیرو بناتے ہیں تو دوسری طرف ملا مانک شاہ ایک شدت پسند ملا کو بحث و تمحیص میں شکست دے کر راہِ طریقت پر ڈال دیتے ہیں اِس طرح سے یہ مفروضہ کہ حضرت ریشیؒ تمام عمر تارکِ دُنیا تھے اور نعوذ باللہ رہبانیت سے نزدیک تر تھے غلط ثابت ہوتا ہے ہاں البتہ دنیا پرست لوگ جسے دنیا سمجھ بیٹھے ہیں اُس سے حضرت ریشیؒ کوسوں دور تھے وہ دنیا پرست نہیں تھے لیکن دنیا سے الگ نہیں رہتے تھے اگر ایسا ہوتا تو پھر وہ تو اُن بے نام ریشیوں کی طرح ہوتے جو تاریخ کے اوراق کے لئے بھی گمنام ہیں اور جن کے معابد و مقابر تک کا کوئی پتہ نہیں لیکن معاملہ کچھ اور ہے کشمیر میں قدم قدم پر حضرت ریشیؒ کے ایسے نشانات موجود ہیں جنکی شہادت پر وہ یہاں کے تھوفیا ہیں سب سے بڑی تاریخی صداقت اور تاریخی شہادت کے حامل ہیں حضرت ریشی تقویٰ اور پرہیزگاری کی اُن عظمتوں کو چھو لیتے ہیں جو اصحاب کبار اور اولیاء اللہ کا خاصہ ہے حضرت عمرؓ سے ایک بار پوچھا گیا کہ حضرت تقویٰ کی کیا تعریف ہے آپ نے فرمایا کیا تم کبھی کسی کانٹوں بھرے جھاڑی دار میدان سے گزرے ہو، سوال کرنے والے صاحب نے عرض کیا جی ہاں حضرت عمرؓ نے فرمایا کیسے چلتے ہو عرض کیا گیا اپنا جسم اور کپڑے سمٹ سمٹا کر چلتے ہیں تو حضرت عمرؓ نے فرمایا بس یہی تقویٰ ہے اگر حضرت ریشیؒ کی حیات مقدسہ کا تجزیہ کیا جائے تو مقولہ بالا مثال کی آئینہ دار نظر آئے گی اُن کے ذہن میں حضورِ رسالت مآبؐ کا یہ قول تھا کہ اَلدُّنیا جیفَۃٌ وَّطَالِبُھَا کلاب۔ دُنیا مردار ہے اور اِس کے ڈھونڈھنے والے کتے ہیں، انہوں نے دُنیائے دوں کو ایک زبردست قیدخانہ جان لیا اور اِس کی خوشیوں اور مسرتوں کو ڈھلتے سائے سے بھی زیادہ عارضی جان لیا حدیث میں آیا ہے الدُّنیا سِجنُ المُؤمِنِینَ وَجَنَّۃٌ لِلکَافِرِینَ دنیا مومن کا قید خانہ ہے اور کافر کی جنت ہے، ذرا صور حضرت ریشیؒ

کی زندگی کو راہبانہ جانے والے خود جاہ پسند اور دُنیا پرست ہیں یہ نقطۂ نظر کا فرق ہے اور جہاں نقطۂ نظر کے ساتھ دوں پرستی، کم نظری اور بے بصری جمع ہو جاتے وہاں افہام و تفہیم سے کام نہیں چلتا۔

میرے ایک معزز کرم فرمانے مجھے ایک خط لکھ دیا ہے اور میری ایک تقریر پر نکتہ چینی کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ تم نے اصحاب صُفّہ اور حضرت یشخ کے فقر و فاقہ بلا کر اپنی کم علمی اور بے بضاعتی کا ثبوت دیا ہے کیونکہ اصحاب صُفّہ کا فقر و فاقہ اضطراری تھا۔ اور حضرت یشخ کا اختیاری، در اصل حضرت یشخ اپنے اس مسلک میں کسی اور مذہب کے رشیوں کی پیروی کرتے تھے میں نے ان صاحب کے خط کا جواب نہیں دیا اس لئے کہ خط کی عبارت سے اُن کی نیت ٹپک ٹپک پڑتی تھی اور جب نیت معلوم ہو تو بسا اوقات "خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید" والے مقولے پر عمل کرنا آسان بھی پڑتا ہے اور فائدہ مند بھی لیکن یہاں محض اس لئے اس بات کا جواب دینا چاہوں گا کہ اُن کا یہ اعتراض متکلمین کے ایک گروہ کا سوال ہے فقر و فاقہ کے اضطرار و اختیار کے بارے میں بات کرتے ہوئے ہمیں سب سے پہلے اس معاملے میں خود حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مقدس شہادت ڈھونڈتی ہے اس لئے کہ سنت نبوی تمام مسلمانوں کے لئے یکساں طور پر قابل عمل ہے حضوؐر کی تمام حیاتِ طیبہ میں کوئی بھی وقت ایسا نہیں آتا جب اُنہوں نے فقر و فاقہ کو حقارت کی نظر سے دیکھا ہو یا اسے خدا کی طرف سے نعوذ باللہ آزمائش گردانا ہو، وہ ہر روز صبح کو اٹھ کر پوچھ لیتے تھے کہ کیا کھانے کو کچھ موجود ہے اگر اُن سے کہا جاتا کہ گھر میں کچھ موجود نہیں، تو فرماتے اچھا تو ہم آج روزے سے رہیں گے اس کے لئے کبھی اُن کی زبان مبارک سے استحقار کا اظہار نہیں ہوا ہے بلکہ اس کے مقابلے میں ہزاروں ایسے واقعات تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے کہ جب بھی نعمتوں

کی فراوانی ہو جاتی تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسے ناپسند فرماتے اور بار بار فرماتے کہ جب دنیا آجاتی ہے تو دین تنگی کا شکار ہو جاتا ہے یہ محض اضطرار تو نہیں تھا خاص طور پر مدنی زندگی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم امیر المومنین بھی تھے اور مسلمانوں کے لیے دین و دنیا کے تاجدار بھی تھے لیکن اِس کے باوصف آن کی یہ دُعا کہ پروردگار! تو نے مجھے مسکین پیدا کیا مجھے مسکین ہی اِس دنیا سے لے جا، میری زندگی مسکینت میں گزرے اور میرا حشر بھی مساکین کے ساتھ ہو محض اضطرار نہیں بلکہ پیغمبرانہ اختیار رہے اور اُسے اضطرار کہنے والے حقائق کی دُنیا سے بہت دور رہتے ہیں، حضور رسالت مآبؐ کے بعد اہلبیت و اصحاب کی مسکینی اور اختیاری مسکنت اور فقر و فاقہ کا اگر تذکرہ کیا جائے تو شاید اُن واقعات سے ایک بڑی کتاب تدوین دی جا سکتی ہے جہاں حضرت بتولؓ کے ہاتھوں میں گھٹے پڑ جانے سے حضرتِ ابوذرِ غفاری کی دولت شکنی تک ہر بات آجاتی ہے اِسی تقویٰ اور پرہیزگاری کا اظہار اسلامی تصوّف کے بڑے بڑے چاند ستاروں نے بھی کیا ہے اور ظاہر ہے کہ اس وقت اسلام دولت دین کے ساتھ ساتھ دنیا کے خزانوں پر بھی اس قدر قادر تھا کہ قیصر و کسریٰ کے گنجینہ ہائے زر اُن کے قدموں پر پڑے تھے لیکن اس حال میں بھی کوئی شخص خیرات لینے کے لئے تیار نہ تھا چنانچہ بڑے بڑے شہروں میں لوگ خیرات کی بڑی بڑی رقمیں لے کر چوراہوں پر بیٹھ جاتے تھے لیکن شام کو مایوس گھر لوٹتے تھے اِس لئے کہ کوئی لینے والا نہیں ملتا تھا

فقیری میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اِتنے

کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

اِن واقعات کے پیشِ نظر حضرت شیخؒ کے فقر و فاقہ کو غیر اسلامی روایات سے جوڑنے والے حضرات میرا خیال ہے اپنی کم نظری اور تاریکی بے بصری کا ثبوت دے رہے ہیں اور خواہ مخواہ اپنی بات پر اَڑ کر اپنی عریانی کا سامان پیدا کر رہے ہیں حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ

حضرت شیخؒ کے قلب و روح کی گہرائیوں میں اسلام کی حقانیت شریعت کا احترام طریقت کا وجدان اور حقیقت کا عرفان موجزن تھا حضرت شیخؒ چونکہ کشمیری الاصل تھے اس لئے قدرتی طور پر اُن کے خمیر میں وہ اجزا موجود تھے جو انہیں ریشیت کے قریب تر لا دیتے ہیں اور یہاں کے مخصوص حالات میں حضرت شیخ نورالدین نورانی رحمتہ اللہ علیہ کی ریشیت اسلامی تصوف کا دوسرا نام ہے اور شاید اسی وجہ سے خاک نشینان ہند و صوفیان ولایت، قلندران بغداد، سرداران عجم، امیرانِ خراسان، سلاطینِ عرب، حافظانِ سندھ مشتاقانِ ماوراء النہر، عاشقانِ غور اور ظریفانِ چین کے ساتھ ساتھ ریشیان کشمیر کا نام بھی لیا جا رہا ہے حضرت شیخؒ کی حیاتِ مقدسہ کا کوئی واقعہ نہیں جس پر اسلامی تصوف کا رنگ غالب نہ ہو اُن کا کلام قرآن و حدیث کا کشمیری روپ ہے میرا خیال ہے کہ یہ الگ موضوع ہے لیکن حضرت شیخ کی حیات میں ترکِ لذات سے لے کر اعتکاف نشینی تک اگر اُن کی زندگی کے واقعات کو الگ الگ لیا جائے تو اِن کی تطبیق قرآن و حدیث سے بھی ہو سکتی ہے اور ائمہ صوفیین کی زندگیوں کے واقعات سے بھی حضرت شیخؒ کے کلام کا ابتدائی مطالعہ کرنے کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے کہ توحید، رسالت، نماز، روزہ، کلمہ اور دوسرے اسلامی ارکان کو حضرتِ شیخؒ نے کشمیری زبان کے دل نشین انداز میں اپنے عارفانہ انداز تجربات کے ساتھ پیش کیا ہے اور کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ اُن کے کلام کو کاشُر قرآن کشمیری قرآن کہا گیا ہے اور انہیں خود کاشُر واعظ یعنی کشمیری واعظ کا لقب بھی دے دیا گیا ہے اسلامی تصوف کے سابقون الاولون یعنی اصحاب صفہ ہوں یا تابعین و تبع التابعین ہوں حضرتِ شیخؒ کی زندگی اِن کے قدم بقدم چلتی ہے ہمیں یا تو اسلامی تصوف سے ہی انکار کرنا ہوگا یا پھر حضرت شیخؒ کے تصوف کو اسی طرح اسلام کا آئینہ دار ماننا پڑے گا جس طرح ایرانی، خراسانی، عراقی اور ہندوستانی تصوف کو اسلامی تبلیغ و ترسیل کا ذریعہ مانا جاتا ہے یہاں ایک اور بات

کی طرف بھی اشارہ لازمی بن جاتا ہے کہ حضرت شیخؒ کے وقتِ مبارک میں ساداتِ عرب اور ایرانی صوفیوں کا ایک ریلا کشمیر آیا ہوا تھا اگر ایسی بات ہوتی کہ حضرت شیخؒ نعوذ باللہ کسی غیر اسلامی فعل میں مصروف ہوتے تو سادات اور ایرانی صوفیوں نے اپنے ردعمل کا اظہار کیا ہوتا اس لئے کہ حضرت شیخ مسلمان تھے اور مسلمان سے کسی بھی طرح غیر اسلامی افعال یا عقایدٗ کا صدور ایسے اوقات میں ضرور قابل مواخذہ گردانا جاتا۔ حضرت شیخؒ اپنے مشن کو کہیں خاموشی سے نہیں چلا رہے تھے بلکہ کشمیر کے ہر گوشے میں اِن کی تربیت گاہیں کھلی ہوئی تھیں جنہیں مقام کے نام سے پکارا جاتا تھا مراز میں عشق مقام ناگہ مارزن ڈمیر اور منزگام سے لے کر شمالی کشمیر کے لوٹھو، اہم شیخ مقام، بٹن، ترہگام، علاقہ بانگل، علاقہ کچھ، علاقہ چھراٹ علاقہ پھاک، غرض کشمیر کے چپے چپے میں ایسے لوگ موجود تھے جو حضرت شیخؒ کے تربیت یافتہ تھے اس کے مقابلے میں سید السادات حضرت میر محمد ہمدانیؒ جب حضرت شیخؒ سے ملتے ہیں تو نہ فقط اُن کا زبردست احترام کرتے ہیں بلکہ انہیں سدرہ نشینان وحدت کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور اُن کے طریقے کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے خطِ ارشاد میں اُن تمام چیزوں کی اجازت دیتے ہیں جن پر وہ قائم تھے گویا بالفاظ دیگر اُن کے طریق طریقیت کو تسلیم کرتے ہیں خط ارشاد کے یہ الفاظ نہایت اہم ہیں۔

فاجزتہٗ بتوبۃِ المُریدین وبَیعَتھُم وتَرغیب الطالبین السالکین
وَتربیتھُم وَتعلمُ الاذکار کاربعِ الضرُوب وَاَخذِ النزورات
والفتوحات وَجلوس الخلواتِ الدایم۔

اِس کے باوجود حضرتِ شیخؒ کی خلوت پسندی اور ترکِ لذات پر اُنگلی اُٹھانا خود اپنے آپ کو انگشتِ نما بنانے کے سوا اور کچھ نہیں، ہاں اگر بذاتِ خود تصوّف ردّ وقدح کی زد میں آجاتا ہے تو پھر معاملہ کچھ اور ہے اور بحث کی نوعیت کچھ

بدل جاتی ہے حالانکہ اس صورت میں بھی نتیجہ معلوم ہے میں اس سلسلے کو پروفیسر حاجنی کے اس اقتباس پر ختم کرنا چاہوں گا۔

" خطۂ ارشاد کے بعد بھی ریشیت کا سلسلہ جاری رہنے کی ایک دوسری تاریخی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایرانی مبلغوں کو حکومت میں ایک خاص اثر ورسوخ حاصل تھا جب بادشاہوں کے ہاتھوں کبھی کسی غیر مسلم پر عتاب نازل ہو جاتا تو عام لوگ اس کا الزام غیر کشمیری مبلغوں کے سر تھوپ دیتے۔ تبلیغی پروگرام میں جب حکمران وہاں کے عوام کو ستاتے تو ان مواقع پر ریشی سلسلہ کے مبلغ تعصب کی آگ کو بجھانے کی خاطر سیاسی شعبدہ بازی سے اپنا دامن بچا کے عام لوگوں کے ساتھ بلا لحاظ مذہب و ملت مہر و محبت سے پیش آتے جب یہاں پارٹی بازی اور مذہبی تفرقوں میں سر پھٹول ہو جاتی تو اس وقت اُن کا یہ سلوک دیکھ کر غیر مسلم کشمیری ریشیوں سے روحانی فیضان حاصل کر لیتے اس کا بدیہی نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طرف تبلیغ اسلام کا کام چلتا رہا اور دوسری طرف جن کشمیریوں نے اسلام قبول کر لیا تھا وہ بھی اِن ریشیوں کے عقیدت مند رہے اور یوں جو کام بادشاہوں کے ظلم و جبر کے باوجود نہ ہو سکا وہ کام ریشیوں نے نہایت امن و سکون کے ساتھ انجام دیا۔"

ایک اور بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ غیر کشمیری مبلغوں کی زبان فارسی تھی اور اِن کے برعکس ریشی سلسلہ کے مبلغوں کی زبان کشمیری تھی ایرانی مبلغ یہاں کے خاص لوگوں کو جن میں علماء و فضلاء تھے اپنے دلائل و براہین قایل کیا کرتے اور ریشی لوگ عوام الناس کو نتیجہ یہ نکلا کہ زلکا ریشی سے لے کر بابا نصیب الدین غازی تک جن بزرگوں نے اسلام کی قندیل کو روشن سے روشن تر کر دیا انہوں نے اپنی طریقوں سے اپنے مشن کو کامیاب بنا دیا اِن دو طبقوں کے علامتی نمائندے

حضرت امیر کبیر رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ نور الدین نورانی رہے حضرت شاہ ہمدان کو "اگر علی ثانی" کا لقب دیا گیا، تو شیخ العالم کو علمدار کشمیر کا امتیازی لقب بخشا گیا۔ لفظ علمدار پر غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ریشیت کے تینوں طبقوں نے یہاں کی کشمیریت کو اس لحاظ سے قائم رکھا کہ یہاں مذہب تبدیل کرنے کے بعد بھی کشمیریت بہ حیثیت قومیت کے زندہ رہی۔" (علمدار صفحہ ۹،۱۰)

میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ حضرت شیخؒ کی ریشیت اسلام کا کشمیری روپ ہے حضرت شیخؒ اس حیثیت میں یہاں کے ریشیت کے بانی ہیں کہ انہوں نے اس صدیوں پرانی تحریک کو تبلیغ اسلام اور اسلامی روح کو پیش کرنے کے لئے استعمال کیا، اور عملی طور پر اسے عوام میں مقبول بنانے کی خاطر جگہ جگہ پھرتے رہے، تربیت گاہیں قائم کرتے رہے، ایک زبردست جماعت کی تنظیم کی، جو کشمیر کے ہر علاقے میں پھیل کر اپنے کردار سے لوگوں کے دلوں کو فتح کرتے رہے ریشیت کی تاریخ کا جہاں تک تعلق ہے اس پر غور کرنے سے یہ بات طے ہوئی ہے کہ حضرت شیخؒ اس تحریک کے مجدد تھے لیکن جہاں تک اس میں اسلامی اعمال و وظایف کو رواج دینے اور اسلامی کردار پیدا کرنے کا تعلق ہے وہ اس کے بانی تھے۔

نمایندہ معاصرین

بشیر اختر

بام الدّین

اصل نام بُمہ ساد تھا۔ ساد کشمیری میں درویش کو کہتے ہیں۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے علاقہ بُمہ زُو کے ایک غار میں گوشہ نشین تھے۔ کہتے ہیں کہ ان کے مندر میں تین سو ساٹھ بُت تھے۔ روحانی کمال اس حد تک تھا کہ طے مکان کر کے علی الصّباح پانچ تیرتھ استھانوں سے اشنان کر کے پَو پھٹنے سے پہلے ہی واپس اپنی گپھا میں پہنچ جاتے۔ طے مکان میں بجبہاڑہ، شوپار، چھتہ بل، وُلر ناگ اور کھادن یار کے مندروں کی زیارت اور مسافت طے کر کے اپنے مقام تک مُنہ اندھیرے پہنچنا ان کے روحانی کمال کی ایک جھلک تھی۔ دُور و نزدیک کے لوگ ان کے ہاں جاتے اور مُرادیں پُوری کرواتے۔ حضرت شیخ ان کے اس کمال سے واقف ہوئے اور مُلاقات کے لئے چل پڑے۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت شیخ ہاتھ میں ایک بچھڑے کا ٹھہرا ہوا پیٹا لے کر ان کے مندر میں داخل ہوئے۔ برہمن برہم ہوا اور حضرت شیخ کو مندر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ بحث مُباحثہ و تلقین کے بعد آخر بُمہ ساد مسلمان ہوئے۔ حضرت شیخ نے ان کا نام بام الدّین رکھا اور اپنی مصاحبت میں شامل کر لیا۔ مسلمان ہونے کے بعد بابا بام الدّین بارہ برس تک زندہ رہے اور مرتے دم تک بادشاہ وقت کی کفالت قبول نہ کی۔ بستیوں سے دُور گوشہ نشین ہو کر یادِ خدا میں مشغول رہے اور تاحیات لوگوں سے کوئی میل جول نہ رکھا۔ کہتے ہیں کہ ایک بار سُلطان زین العابدین کے ہاں گیا اور درخواست کی کہ مجھے کوئی نصیحت کریں۔ بابا بولے کہ بادشاہ کی فطرت آگ کی سی ہے اور آگ پر کسی کی نصیحت کا اثر نہیں ہوتا۔ بہتر ہے کہ آپ دُوبارہ میرے ہاں نہ آئیں اور نہ ہی اپنے دربار میں میرا نام لیں۔ بابا کی ایک مشہور کرامت یہ ہے کہ وہ دِیئے میں بجائے تیل کے پانی ڈال کر اپنی گپھا کو روشن رکھتے۔ بوقت نزع زین الدین دار کو پکارا جو اُس وقت مدارج میں تھے۔ مرشد کی آواز سُن کر زین

الدین نے طے مکان کیا اور لداخ سے دوڑے چلے آئے اور کفن دفن کے مراسم انجام دیئے۔

بابا بام الدین بمہ زُو میں دفن ہیں اور دریائے لدر کے بائیں کنارے علاقہ ہٹہ مر سے ایک میل کی مسافت پر ان کا جو مزار شریف ہے وہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں ایک بہت پرانی عمارت تھی جس پہ مزار شریف بننے کے بعد معمولی سی تجدید و مرمت کی گئی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اصل میں یہ عمارت بھیم شاہی نام کے کابل کے بادشاہ کا بنایا ہوا ہری مندر ہے جس کا ذکر کلہن پنڈت نے بھیم کیشو کے نام سے کیا ہے۔ بھیم شاہی دہدرانی کا نانا تھا اور ۸۹۵ء عیسوی میں جبکہ یہاں کھیم گپت کی حکومت تھی۔ وارد کشمیر ہوا تھا۔

کشمیر میں لفظ "زُو" جزیرے کو کہتے ہیں۔ اور بمہ زُو کا نقشہ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ علاقہ ان ہی جزیروں کا حصّہ ہے جو دریائے لدر کے پانیوں :: آس پاس کے رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ لغوی معنوں میں بھی "بمہ زو" کی اصل مارتنڈ مہاتم میں دیئے گئے لفظ "بھیم دیپ" سے ملتی ہے۔

پرانے مندر کی تجدید و مرمت میں جس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے وہ عمارت کی دیواروں پر چڑھایا گیا موٹا پلستر ہے۔ اس پلستر نے اگرچہ پرانی عمارت کے تمام نقوش چھپا دئے ہیں البتہ اس کی تکونی محرابیں طاق اور کلش دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس عمارت کا طرز بھی اسی قسم کا ہے جو لدو، نارستھان اور پایر میں جلوہ گر ہے۔

مندر سے تھوڑی دور ایک پہاڑی کے دامن میں وہ گپھا موجود ہے جہاں روایت کیمطابق بابا بام الدین مسلمان ہونے سے پہلے بتوں کی پوجا کیا کرتے تھے۔ ایک چھوٹا سا مندر اس گپھا میں بھی ہے جو اب غیر آباد ہے۔ البتہ اہل ہنود یہاں کبھی کبھار آتے رہتے ہیں۔

بہاؤالدّین گنج بخش

حضرت بہاؤالدین خواجہ اسحاق ختلانی کے مرید تھے۔ مدت تک گوشہ گمنامی میں چھپے رہے۔ لیکن بابا عثمان اور اوچپ گنائی جس دن سے حضرت بہا کے معتقد ہوئے چاروں طرف ان کا نام پھیل گیا۔ پھر ایک نانوائی کے بیٹے کو زندگی بخشنے کا واقعہ ان کی شہرت کا سبب بنا۔ دن رات عقیدت مند ان کی درگاہ میں آتے اور فیضان حاصل کرتے رہے۔

آپ نے زینہ کدل پل کے متصل سرکنڈوں کی ایک جھونپڑی بنالی تھی اور اسی میں بیٹھ کر ریاضت و عبادت کرتے۔ ایک دن شہزادہ زین العابدین کشتی میں سوار تھا مگر زینہ کدل میں آپ کی جھونپڑی پر اس کی نظر پڑی۔ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے اصرار کیا کہ کشتی میں بیٹھ کر تھوڑی دیر دریا کی سیر کریں۔ حضرت بہا نہ مانے لیکن شہزادہ اصرار کرنے لگا۔ آپ نے مجبور ہو کر اپنا ہی مصلّیٰ دریا میں ڈال دیا۔ اور اسی پر بیٹھ کر پانی پر تیرتے رہے۔ شاہی ملاح باوجود کوشش کے مصلّے کے ساتھ رفتار قائم نہ رکھ سکے۔ ایکدن شہزادہ زین العابدین کی کسی بات پر خوش ہوئے تو اس کو بلا کر بشارت دی۔ کہ "جاؤ تم کو ہم نے تاج بخش دیا اور مالا مال کر دیا"

زیادہ وقت نہیں گذرا کہ زین العابدین اپنے بھائی پر غالب آیا اور کشمیر کے تخت کا مالک بنا۔ زین العابدین کو بے شمار خزانے ملے اور انہوں نے ہی آپ کو گنج بخش کہنا شروع کیا۔

ایک رات مراقبے میں تھے کہ چوروں کی ایک جماعت نے خوف کی وجہ سے آپ کو قتل کر دیا۔ سلطان تک جب اس حادثے کی خبر پہونچی تو وہ جائے وقوع کی طرف دوڑ پڑے اور ان کی نعش وہاں سے اٹھوائی۔

کہتے ہیں کہ حضرت بہاؤالدین نے اپنے مصاحب سے وصیت کی تھی کہ "مرنے کے بعد میری نعش کو رسی سے گھسیٹ کر قبرستان تک لے جانا"۔ محب اور دوست یہ کام کرنے سے کتراتے رہے۔ آخرکار

سلطان نے یہی تجویز سوچی۔ انہوں نے گھاس کی رسیوں کا تابوت بنایا اور اسی میں آپ کو بٹھا کر دُور تک گھسیٹ کر لے گئے۔ یہ واقعہ ۸۴۳ ہجری کی پہلی رجب کو ہوا۔

حضرت گنج بخش، سید محمد مدنیؒ، شیخ نورالدین نورانیؒ اور شیخ سلطان کے دلی دوست تھے۔ حضرت بابا عثمان فرماتے تھے کہ شیخ العالمؒ ان کو اپنے ساتھیوں میں سب سے بڑھ چڑھ کر گردانتے تھے۔

کہتے ہیں حضرت بہاءؒ ایک مدت تک قطب عالم بھی رہے۔ ان کا مرقد ملہ کھاہ میں اُسی جگہ بنوایا گیا جو سلطان زین العابدین کی بیگم نے پہلے اپنے لئے پسند کیا تھا۔

حضرت بہا کے ملہ کھاہ میں دفنانے کے بعد زین العابدین کی والدہ نے جہلم کے کنارے وہ جگہ اپنے مرقد کے لئے منتخب کی جو اب "مزار بڈشاہی" کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت بہا کے تئیں اس درجہ التفات برتنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہی خاندان میں ان کا بہت حد تک عقیدت اور احترام تھا۔ خود بادشاہ تک ان کا معتقد تھا۔

مورخ حسن زین العابدین بڈشاہ سے متعلق لکھتے ہیں۔

"و در خدمت مشائخ کبار و اولیاء روزگار مثل شیخ بہاؤالدین گنج بخشؒ و جناب شیخ نورالدین رشیؒ و سید حسین منطقیؒ و سید ناصر الدین بیہقیؒ وغیرہ اہل حال و اصحاب کمال بہرہ اندوز صحبت میگشت۔ و در خدمت سید حسین منطقیؒ اخذ بیعت کردہ بتربیت و تعلیم ایشاں معانی باطن حاصل کردہ بود"

بہت دہد

کشمیری ان کو "زاٹہ کور" کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ بہت دہد اور دہت دہد دونوں بہنیں حضرت شیخ کی پناہ میں اس وقت آئیں جب وہ عمر کی آخری حدود تک آنے لگے تھے۔ ان کے والد علاقہ دربیہ گام میں پٹواری تھے۔

ایک بار دونوں بہنیں کھیت میں گھاس کاٹ رہی تھیں کہ حضرت شیخ لاٹھی ٹیکتے ہوئے وہاں سے گذرے۔ حضرت شیخ نے ان کو گھاس کاٹنے سے منع کیا (اس وجہ سے کہ گھاس میں بھی جان ہوتی ہے) شیخ کی بات سُن کر دونوں بہنیں کھڑی ہوگئیں اور ترنک کر بولیں۔ "عاصا ٹھکھہ ڈکھران ۔ ساسا ٹھکھہ کٹران"۔ یعنی لاٹھی ٹیکتے جا رہے ہو اور ہزاروں کو قتل کر رہے ہو"۔ حضرت شیخ نے گھاس ہٹا کر دیکھا تو کئی چونٹیوں کو زمین پر تڑپتے پایا۔ وہ لاٹھی کی زد میں آگئیں تھیں۔

حضرت شیخ ان کی بات سن کر تائب ہوئے اور لاٹھی ٹیک کر چلنا چھوڑ دیا۔

بہت بی بی حضرت شیخ کے ہاتھوں مسلمان ہوئیں اور ان کی صحبت میں بہت سی روحانی منازل کو طے کر گئیں۔

بہت دہد کا مزار چرار شریف کے ایک نزدیکی گاؤں زالوسر میں ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں روایت کے مطابق حضرت شیخ العالمؒ کے نام حضرت میر محمد ہمدانیؒ نے خط ارشاد دے کر اپنی مہر ثبت کر دی تھی۔

بھٹ اوتار

بھٹ اوتار سلطان زین العابدین کے درباری شاعر اور اپنے دور کے سرکردہ عالم تھے۔ سلہن اچاریہ ے شاگرد تھے۔ بادشاہ کے چھبیسویں جلوس یعنی ۱۴۴۶ عیسوی میں بھٹ اوتار نے باناسُرکتھا، نام کی کتاب لکھی ہے۔ یہ واحد کشمیری کتاب ہے جو اس عظیم بادشاہ کے دور کی یادگار ہے جو اب تک موجود ہے۔

حال ہی میں اس کتاب کا نسخہ بھنڈارکر ریسرچ انسٹی چیوٹ پونا میں دریافت ہوا ہے جس پر تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ باناسُرکتھا کی کہانی پورانوں کی ایک داستان پر مبنی ہے جس میں اوشا اور انرُدھ کی محبت کو نظم کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ باناسُر اور بھگوان کرشن کی جنگ کو ہری ونش پوران سے لیا گیا ہے۔ شاعری کے لحاظ سے یہ کتاب اعلیٰ تخلیقی ادب میں شمار ہوتی ہے۔

بھٹ اوتار کی ایک اور کتاب " زین ولاس" جس میں بادشاہ کی PRECEPTS لکھی گئی ہیں اب ناپید ہے۔

تاج الدّین ریشی

تاج الدین سلطان سکندر کے وقت میں کوتوال شہر تھے کہتے ہیں کہ ان کا قہر و غضب مشہور تھا۔ ایک بار حضرت شیخ کی بیوی زرے دید نے بادشاہ کے ہاں شکایت بھیجی کہ ان کا خاوند بچوں کے نان و نفقہ کی ذمہ داری قبول کرنے سے کترا رہا ہے۔ بادشاہ نے تحقیقات کے لئے تاج الدین کوتوال کو کیموہ بھیج دیا۔ چنانچہ وہ غیض میں آکر حضرت شیخ کی گپھا میں داخل ہوئے۔ لیکن حضرت شیخؒ سے ملتے ہی دل اعتقاد بدل گیا کہ کوتوالی سے استعفا دے دیا۔ دنیا داری تیاگ دی اور کپڑے پھاڑ کر حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مرشد کے حکم سے وزر ہیل کو اپنا مسکن بنایا۔ چنانچہ وہیں ان کی آرام گاہ بھی ہے۔ کشمیری ان کو تاز رِ پوش کے نام سے یاد کرتے ہیں

جسرت کھوکھر

زین العابدین کو کشمیر کا تخت حاصل کرنے میں جسرت کھوکھر نے جس قدر مدد دی ہے وہ قابل داد ہے۔ شاہی خان جسرت کھوکھر ہی کی مدد سے علی شاہ کے خلاف جنگ جیت سکا۔ جسرت کھوکھر اپنے وقت کا جری سپہ سالار اور بروقت فیصلے لینے والا کامیاب منتظم تھا۔ راجہ بلادیو سلطان علی شاہ کے نام اپنے پیغام میں ان الفاظ کے ساتھ جسرت کھوکھر کی بہادری کا اعتراف کرتا ہے۔ "اگرچہ آپ کے پاس پورے ساز و سامان سے لیس فوج ہے، تیز رفتار گھوڑے ہیں، جان دینے والے سپاہی ہیں۔ لیکن پھر بھی جنگ کرنے میں پہل نہ کرنا۔ ہم کھوکھر کی جنگ بازی سے واقف ہیں۔ اس کی چالاکی سمجھتے ہیں۔ جان لو کہ ایک سانپ ہی دوسرے سانپ کے وار کو سمجھتا ہے۔۔۔۔"

یہ اور بات ہے کہ سلطان علی شاہ نے اس پیغام کو اپنے لئے ہتک کا باعث سمجھا۔ وہ اپنے سسر کے کہنے کی پرواہ کئے بغیر میدان جنگ میں کود پڑا اور جسرت کھوکھر کے ہاتھوں قتل ہوا۔

جسرت کھوکھر کے والد ملک شیخ کھوکھر کو دلی کے سلطان نے پنجاب میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز کیا تھا۔ ملک شیخ کھوکھر اپنے قبیلے کا سردار تھا۔ اور والد کے انتقال کے بعد جسرت کو سرداری وراثت میں ملی۔ جسرت نے بغاوت کا پرچم بلند کیا اور الگ سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ سیالکوٹ اس کا دارالخلافہ تھا۔ کشمیر اور کھوکھر قبیلے کے تعلقات سلطان سکندر ہی کے وقت سے پروان چڑھے۔ جسرت سردار بننے سے پہلے تیمور کے ہاں بطور مخبر تعینات تھا۔ تیمور نے اس کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے جسرت کو انعام و اکرام سے نوازا بھی لیکن جسرت اپنی آزاد طبیعت کی وجہ سے زیادہ دیر تک تیمور کے ہاں نہ رہ سکا۔ اس نے تیمور کے خلاف ہی بغاوت کر دی۔ تیمور نے جسرت کو قید کیا اور اپنے ساتھ سمرقند لے گیا۔ ۱۴۰۵ء میں جب تیمور کا انتقال ہوا تو جسرت کھوکھر سمرقند سے بھاگ آیا۔ سلطان سکندر نے جسرت کھوکھر کو تخت حاصل کرنے میں مدد دی۔ چونکہ علی شاہ راجہ بلادیو والیٔ جموں

کا داماد تھا اور چوں کہ جسرت کھوکھر کو راجہ بلادیو سے ذاتی عناد تھا اس لئے کھوکھر علی شاہ کے خلاف زین العابدین کی مدد کو آیا۔ زین العابدین کیطرف سے علی شاہ کے خلاف جسرت کھوکھر نے جنگ ۱۴۲۰ء میں لڑی اور ۱۴۲۱ء میں جب دہلی کا سلطان خضر خان فوت ہوا تو جسرت نے سید کی سلطنت پر حملہ کیا اور پنجاب کا اکثر علاقہ اپنی قلمرو میں شامل کیا۔ لیکن ان علاقوں پر اس کی حکومت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ وہ سید مبارک شاہ کے ہاتھوں جنگ ہار گیا۔ جسرت کی دولت لوٹی گئی اور وہ کنگال ہوا۔ اس وقت زین العابدین ہی نے اس کی ڈھارس بندھائی۔ زر و جواہر دے کر اس کو واپس اپنے وطن روانہ کر دیا۔ ۱۴۲۳ء میں جسرت کھوکھر کے ہاتھوں جموں کا راجہ بلادیو قتل ہوا۔ اور ۱۴۴۱ء میں جب دہلی کے سلطان بہلول لودھی نے پنجاب پر حملہ کیا تو جسرت کو پھر ایک بار کشمیر بھاگ آنا پڑا۔ اس وقت بھی زین العابدین نے اس کی مدد کی اور جسرت نے تیسری بار پنجاب پر قبضہ کر لیا۔

کہتے ہیں کہ جسرت کھوکھر کی ایک بیوی راجہ بلادیو کی بیٹی تھی اور اسی نے باپ کے قتل کا انتقام لینے کی غرض سے ایک رات جسرت کھوکھر کو قتل کر دیا۔

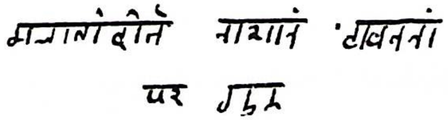
جون راج

جوُن راج کا دُوسرا نام نذوبۂ نزازۂ کہا جاتا ہے ۔شری ور کے بیان کے مطابق جون راج بڈشاہ کے دربار میں اعلیٰ عہدے پر فایز تھے ۔برہمن منڈلی کے سرگرد تھے ۔بہت اچھے مقرر ۔زباندان اور جید عالم تھے ۔بڈشاہ ان کی بہت تعظیم کرتے تھے ۔

جون راج کے والد کا نام نون راج اور دادا کا نام لول راج کہا جاتا ہے جو اپنے وقت میں آسودہ حال شہری تھے جس وقت بڈشاہ کے دربار میں آئے بادشاہ نے ان کی آو بھگت کی ۔اور کشمیر کی تاریخ اس دور سے آگے لکھنے پر انہیں مامور کیا جہاں کلہن پنڈت چھوڑ گئے تھے ۔شاہی دربار میں جون راج کے علم کا شہرہ پروان چڑھا اور انہیں "راجانک" کا خطاب ملا ۔شری ور کے کہنے کے مطابق جون راج سپت رشی سموت ۳۵، ۴م ۴ میں فوت ہوئے ۔

راج ترنگنی کے علاوہ جون راج نے منبکھ کے شری کنٹھ چرت پر شرح لکھی ہے، بھاروی کی برکرانتر پر تبصرہ اور جیانکر کی پرتھوی راج وجے پر سیر حاصل مقدمہ بھی لکھا ہے ۔

جون راج کی راج ترنگنی میں شیخ العالم کے ذکر کے بارے میں عالموں میں دو رائیں ہیں ۔کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے اپنی کتاب میں شیخ العالم کا کہیں ذکر ہی نہیں کیا ہے ۔اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جون راج کا یہ بیان شیخ العالم ہی کی طرف منسوب ہے ۔



حاجی ابراہیم ادہم

سُلطان ابراہیم ادہم کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ شہر بلخ کے عزت داروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ظاہری و باطنی علوم اور عشقِ الٰہی سے سرشار تھے۔ علم کی تلاش میں کئی ملکوں کا سفر کیا۔ مکہ و مدینہ کی زیارت سے مشرف ہو کر سُلطان سکندر کے عہد میں وارد کشمیر ہوئے اور یہاں تقریباً ۵۰ برس گزار کر ۸۴۱ ہجری میں انتقال کیا۔ آپ کو شیخ بہاؤالدین گنج بخش، شیخ سُلطان اور شیخ نورالدین کے ساتھ ذاتی اُنس تھا۔

جناب کی تصانیف میں 'مقالات در حالات اولیا' مشہور رہے۔

دہت دید

بہت دید کی چھوٹی بہن تھیں۔ شیخ العالم کے ساتھ دریہ گام میں ملاقات ہوئی اور ان ہی کی بیعت میں مسلمان ہوئیں۔

علاقہ زالوسہ میں حضرت شیخ اور حضرت میر محمد ہمدانی کی ملاقات کے وقت دہت دید بھی موجود تھیں چنانچہ جس وقت جناب میر نے شیخ سے سوال کیا "اے شیخ گھوڑے کو دبلا کیوں بنا دیا ہے؟" تو دہت دید نے شیخ کے جواب کے بعد دست بستہ عرض کی "منزل رسیدہ لوگوں کو سواری اور کجاوہ کی حاجت نہیں رہتی" میر نے سوال کیا "منزل رسیدہ کون ہیں؟" تو بی بی مُسکرا کر بولیں "جو اپنے آپ سے چھوٹ گئے ہیں"۔ اس پر حضرت میر نے فرمایا "تم نے اپنے آپ سے رہائی پائی ہے کیا" بی بی نے جواب دیا کہ "اپنے آپ سے رہائی نہ پاتی تو اس مقدس مجلس میں بیٹھنے کی گستاخی نہ کرتی۔"

دہت دید برابر اسی جگہ دفن ہوئیں جہاں اُس دن حضرت میر بیٹھے تھے اور ان کی بہن بہت دید اس جگہ جہاں حضرت شیخ رہے تھے۔

زین الدین

اصل نام زیا سنگھ تھا اور جائے پیدائش باندر کوٹ کشتواڑ تھی۔ کشمیر میں ان کو زینہ شاہ صاحب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بابا زین الدین بچپن میں ہی یتیم ہو گئے تھے۔ ان کے والد کا کسی کے ہاتھوں قتل ہوا تھا اور پرورش و پرداخت کی ذمہ داری ماں ہی کے کندھوں پر آپڑی تھی۔ کہتے ہیں ایام طفولیت ہی میں ایک دن بابا زین الدین بیمار ہوئے۔ ایسے بیمار ہوئے کہ مہینوں بستر سے لگے رہے۔ بچنے کی ساری اُمیدیں ختم ہو کر رہ گئیں۔ بچے کی تکلیف ماں سے نہ دیکھی گئی تو وہ زار زار رونے لگی۔ ایک رات ایسا ہوا کہ حضرت شیخ نے ان کو خواب میں بشارت دی کہ تمہارا بچہ ضرور ٹھیک ہو گا لیکن شرط یہ ہے کہ اسے کشمیر بھیج کر میری مصاحبت میں داخل کرنا ہو گا۔ ماں نے خواب میں ہی وعدہ دیا اور بچہ رفتہ رفتہ ٹھیک ہونے لگا۔ وقت گذرتا رہا اور ماں کارِ جہاں میں کھو کر رہ گئی اور اسے حضرت شیخ کو دیا ہوا وعدہ یاد نہ رہا۔ کچھ عرصہ بعد بچے کو پھر وہی بیماری عود کر آئی تو ماں گھبرا گئی اس نے توبہ کی اور بعجز وانکساری حضرت شیخ کی خدمت میں بچے کو لے کر دوڑی چلی آئی۔ ابھی یہ سفر ہی میں تھے کہ حضرت شیخ کو مکاشفے سے معلوم ہوا اور انہوں نے بابا بام الدین سے کہا کہ ایک خاتون بیمار بچے کو لے کر یہاں آئے گی۔ اس کی خاطر و مدارات کرنا چنانچہ وہ ایک عرصے تک بابا بام الدین کے ہاں رہے۔ حضرت شیخ کی خدمت میں رہ کر ماں بیٹے مسلمان ہوئے۔ حضرت شیخ نے ہی بچے کا نام بدل کر زین الدین رکھا۔ پیر و مرشد کی صحبت میں بچہ اس درجہ کمال حاصل کر گیا کہ خود مرشد کو ان الفاظ میں اعتراف کرنا پڑا۔

گوٹہ زا اٹھا گورس ژرٛ ژے
نیتھی منے ورِ دِتو یِروو

(چنانچہ شاگرد ہی اپنے اُستاد سے بڑھ کر نکلا۔ خدایا مجھے بھی ایسی ہی توفیق دے)

بابا زین الدین اپنی ماں سے رُخصت ہو کر علیش مقام کی گپھا میں گوشہ نشین ہوئے۔ یہ جگہ انہیں اپنے مرشد کی طرف سے عنایت ہوئی تھی جس وقت وہ پہلی بار گپھا میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ سانپ اور بچھوؤں نے اپنا مسکن بنا رکھا ہے۔ بابا زین الدین کے غار میں داخل ہوتے ہی سانپوں نے اپنا مسکن بدلا۔ علیش مقام کی گپھا میں حاجی شمس الدین نامی ایک دیندار نے ان کی خوب خدمت کی وہ بہت دور سے ان کے لئے پانی لے آتے تھے۔ ایک بار یوں ہوا کہ ٹیلے پر چڑھتے وقت شمس الدین کا پاؤں پھسل گیا اور موچ آنے کی سبب پاؤں میں شدت کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ وہ روتے دھوتے بابا کی خدمت میں پہنچے اور اپنا پاؤں دکھایا۔ بابا زین الدین اسی وقت اٹھے اور مقام حادثہ تک آئے۔ دیکھا کہ مٹکا لوٹا پڑا ہے حضرت بابا نے دعا کی اور روئیں۔ پر پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا اور جہاں جہاں سے بابا گذرے وہاں وہاں بہتا پانی انکے پیچھے پیچھے چلتا رہا اور جس جگہ سے بابا واپس مڑے اُسی جگہ پانی زمین میں جذب ہو کر غائب ہوا۔ چنانچہ آج بھی وہاں پانی ایک مقام پر ایک بڑے پتھر کی اوٹ سے نکلتا ہے اور تھوڑی دُور جا کر زمین میں دھس کر غائب ہو جاتا ہے۔ بابا زین الدین کی شہرت کی وجہ ایک اور کرامت بھی ہے جس کے ذریعے اُنہوں نے ذبح کئے گئے ایک بکری کے بچّے کے اعضاء جوڑ دیئے اور اس کو پھر سے زندہ کرا دیا تھا۔

بابا زین الدین کے ساتھ ایک اور کرامت منسوب ہے کہ جنگلی جانور آ کر آپ کے دائیں بائیں بیٹھ جایا کرتے تھے۔ آپ نفس کُشی میں بھی یکتا تھے۔ اخروٹ کے چھلکے پیس کر رکھ دیتے اور ان ہی کا سفوف پانی میں گھول کر پیتے۔

بابا زین الدین کے ہی حکم کے بموجب ریشیوں میں لکیر دار پگڑی باندھنے کا رواج مروج ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ ایک بار علیش مقام گاؤں کے سارے لوگ کسی نہر کی کھدائی میں مصروف تھے کہ اتفاق سے بابا کا ایک خدمت گذار پانی لینے کی خاطر اُسی نہر پر گیا۔ کارندوں نے پکڑ کر اس کو بھی بے گار کے طور نہر کی کھدائی میں لگا دیا۔ دن بھر کی محنت کے بعد جب وہ دیر گئے بابا کی خدمت میں حاضر ہوا تو سارا حال ان کو سنا دیا۔ بابا برہم ہوئے اور ایک لاٹھی لے کر نہر کی سمت چل پڑے۔ اُنہوں نے غضب میں آ کر لاٹھی نہر میں ڈال دی۔ کہتے ہیں

کہ لاٹھی کے گرتے ہی نہر کا پانی غائب ہونے لگا۔ گاؤں والوں نے جب دیکھا تو نادم ہو کر بابا سے معافی مانگ لی اور درخواست کی کہ بابا اپنے خدمت گاروں کے لئے کوئی نشان مقرر کر دیں تاکہ دوبارہ ان کو پہلی ہی نظر میں شناخت کیا جائے اور کوئی ان سے کسی قسم کی گستاخی نہ کرے۔ چنانچہ بابا زین الدین کے ہی کہنے پر رشیوں میں دھاری دار پگڑی باندھنے کا رواج ہوا۔ اس کو کشمیری میں "رتش کا زن" کہتے ہیں۔

ایک اور واقعہ ہے کہ شاہ کوہ کی کھدائی کے دنوں میں سلطان زین العابدین بابا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کسی وجہ سے ناراض ہو کر چلے گئے۔ سری نگر آ کر انہوں نے بابا کو تبت جلاوطن کر دیا اور کہا کہ یہ فقیر صرف لودھوں کے لائق ہے۔ حکم سلطانی پا کر بابا زین الدین تبت چلے گئے اور وہاں کئی سال رہے۔ اتفاق سے تبت کا ولی عہد اچانک بیمار ہو کر مر گیا۔

لوگ بابا زین الدین کو ہی بیٹے کی موت کا ذمہ دار ٹھہرانے لگے چنانچہ والی تبت نے بابا زین الدین کو حکم بھیجا کہ یا تو میرے بیٹے کو اپنے کشف سے زندہ کر دو نہیں تو خود ہی مرنے کو تیار ہو جاؤ۔ بابا زین الدین نے رات بھر کی مہلت طلب کی۔ چنانچہ بابا ساری رات عبادت میں مصروف رہے اور دوسرے دن راجہ کا بیٹا صحیح سلامت بستر مرگ سے اٹھا۔

آپ تبت ہی میں تھے کہ بڈشاہ کو آپ کی یاد آئی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بیٹے حیدر خان کو آپ کے ہاں بھیجا اور آپ کے کشمیر میں دوبارہ وارد ہوتے وقت بذات خود استقبال کو آیا۔

بابا بام الدین کو آپ ہی نے بمہ زو میں غسل دیا اور آخری آرام گاہ تک پہنچایا ہے۔

بابا زین الدین عیش مقام میں دفن ہیں۔ مزار سے تھوڑی دور آپ کے مصاحب کی قبریں ہیں۔ جو زیارت خاص و عام ہیں۔ بیساکھ مہینے کی بارہ تاریخ کو آپ کا عرس منایا جاتا ہے اور اسی دن عیش مقام کے لوگ کشمیر کی بہت پرانی رسم "پھیر دو" کا اعادہ کرتے ہیں۔

زین العابدین (بڈشاہ)

سلطان سکندر کے پانچ بیٹوں میں سب سے عقلمند مدبر اور بیدار مغز تھے۔ بچپن میں ان کا نام شاہی خان تھا۔ سلطان سکندر کی بیگم میرا کے بطن سے ۸۰۴ ہجری میں پیدا ہوئے۔ بیگم میرا مہاراجہ اودیندر کی بیٹی تھیں اور سلطان سکندر ان کو اپنے نکاح میں ۱۳۹۷ عیسوی میں لائے تھے۔ شاہی خان کے علاوہ بیگم میرا سے بادشاہ کو دو اور بیٹے بھی ہوئے تھے۔ بڈشاہ کی پیدائش کا سال وہی ہے جو سری نگر کی جامع مسجد تکمیل کا آخری سال کہا جاتا ہے۔

شاہی خان کی تعلیم سب سے پہلے سید محمد مدنی کے ہاتھوں ہوئی جنہوں نے شاہی خان کو قرآن حکیم کی تعلیم دی۔ مولانا کبیر نے مروجہ تعلیم سے ان کو سرفراز کیا۔ شاہی خان کی تعلیم و تربیت میں ان کی والدہ کا بہت بڑا ہاتھ ہے جس نے اس کو زندگی کے حقائق کا قریب سے مشاہدہ کرنے کا سلیقہ سکھایا۔ مولانا کبیر جو خود ایک LIBERAL ذہن کے مالک تھے نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔ شاہی خان کی ایک سوتیلی ماں ہندو راجہ کی بیٹی تھی۔ اس کی نظرِ عنایات کا اثر بھی شاہی خان پر پڑا۔ علاوہ ازیں صوفیوں اور رشیوں کے ساتھ قریبی تعلقات رکھنے کی وجہ سے شاہی خان اس درجے کا کٹر مسلمان (FANATIC) نہ بن سکا۔ جو اس کے بعض مسلمانوں کا خاصہ تھا۔ شاہی خان کے شیخ نورالدین ولی سے بھی قریبی تعلقات تھے۔ سلطان سکندر کی عالم شناسی اور علم دوستی اور شفقت نے شاہی خان کے HIGHER AESTHETICS بیدار کرنے میں کافی مدد دی۔

سلطان سکندر کے وقت سے ہی ملک سیف الدین عملی طور فرمانروا بنا۔ چونکہ وہ کٹر قسم کا مسلمان تھا اس لئے اس کی ہندو کش پالیسی نے ملک میں ہر طرف اتھل پتھل مچادی تھی۔ شاہی خان ملک سیف الدین کی اس پالیسی سے بیزار تھا اور سیف الدین نے جب شہزادے کے روپ میں ایک بڑے دشمن کو ابھرتے دیکھا تو وہ اس سے خار کھانے لگا۔ ملک سیف الدین نے شاہی خان کے خلاف بادشاہ کو بھڑکایا۔ وہاں سے مایوس ہو کر خود

اپنے حواریوں کے ذریعے شاہزادے کی موت کا ساماں کرنے لگا۔ لیکن شاہی خان کی خوش بختی تھی کہ وہ موت کے چنگل سے بچ نکلا اور ۱۴۱۵ء میں خود ملک سیف الدین ہی دنیا سے رُخصت ہوا۔ اس طرح شاہی خاں نے اپنے ایک بہت بڑے مُخالف سے نجات حاصل کرلی۔ سیف الدین کی موت کے وقت سلطان علی شاہ کشمیر کا فرمانروا تھا۔ اس نے شاہی خان کو ولی عہد کا خطاب دے کر اپنا جانشین بنالیا۔ لیکن اس کے نئے وزیر ملک یوسف کو شاہی خان سے عداوت پیدا ہوئی۔ آخر کار ۱۴۱۸ء میں ملک یوسف اور شاہی خان کے مابین باقاعدہ جنگ ہوئی۔ ملک یوسف عیدگاہ کے میدان میں جسرت کھوکر کے ہاتھوں قتل ہوا۔

۱۴۱۸ء میں لڑی گئی عیدگاہ کی لڑائی کے بعد ہی سے شاہی خان کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔ عام لوگوں نے اس کی فتح کا جشن منایا۔ اور عوام میں بڑھتی ہوئی مقبولیت کے باعث ہی سلطان علی شاہ نے شاہی خان کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا۔ اپنی خداداد صلاحیت کی بنا پر شاہی خان نے وزیر اعظم کی ذمہ داری خوش اسلوبی سے نبھائی۔ عوام میں اس کی مقبولیت بڑھتی گئی اور آخر ۱۴۱۹ء میں سُلطان علی شاہ نے تخت سے سبکدوش ہونے کا فیصلہ کرلیا اور حکومت شاہی خان کے سپرد کرکے زیارت مدائن کے لئے رخت سفر باندھا۔

جاتے وقت ہی سلطان علی شاہ نے شاہی خان کو تاج پہنایا اور یوں دعا دی۔ "تم بحیثیت سلطان عُمر دراز تک اس ملک پر حکمران رہو اور زین العابدین کا لقب پاؤ"۔

شاہی خان جو اب زین العابدین کے لقب سے کشمیر کا بادشاہ ہوا، سلطان نے عزت و تکریم کے ساتھ علی شاہ کو رخصت کیا۔ زاد راہ کے علاوہ شاہی خزانے سے تحفے تحائف بھی دیئے۔

جموں پہنچ کر سُلطان علی شاہ نے حج کا ارادہ بدل دیا۔ واقعات یوں بیاں کئے جاتے ہیں کہ جموں کے راجہ بلادیو نے جب علی شاہ کے تخت چھوڑنے کی روداد سُنی تو وہ اپنے داماد سے بہت ناراض ہوا۔ اور علی شاہ کو اس حماقت کے لئے خوب لتاڑا۔ علی شاہ چونکہ پکا ارادہ کرنے والا آدمی نہ تھا۔ اس نے ایک دم اپنا فیصلہ بدل دیا۔ چنانچہ راجہ بلادیو کی فوج کی معیت میں وہ واپس کشمیر آیا۔ زین العابدین نے تھوڑی مزاحمت کی لیکن علی شاہ سے ہار کر راجہ جسرت کھوکر کے یہاں سیالکوٹ چلا گیا۔ راجہ جسرت کھوکھر نے زین العابدین کی ڈھارس بندھائی اور ۱۴۲۰ء میں ایک بڑی فوج لے کر زین العابدین کی مدد کے لئے کشمیر میں وارد ہوا

تحفہ کے مقام پر دونوں فوجوں میں زبردست لڑائی ہوئی۔ سلطان علی شاہ جسرت کھوکھر کے ہاتھوں قتل ہوا اور زین العابدین دوسری بار کشمیر کا سلطان بنا۔

زین العابدین کے دوبارہ سلطان بنتے ہی کشمیر کی حالت یکسر بدل گئی۔ مذہبی فرقوں کی آپسی رقابت ختم ہوئی۔ ملک میں امن و امان قائم ہوا اور نصف صدی تک لوگ فن آرٹ اور دستکاری جیسی مصروفیتوں کی طرف راغب ہوئے۔ سلطان سکندر اور سلطان علی شاہ کے دور میں جو کشمیری مذہبی عناد کی بنا پر ملک چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ واپس بلائے گئے۔ ملک میں پہلی بار مذہبی آزادی کا اعلان کر دیا گیا۔ مسمار کئے گئے مندر دوبارہ تعمیر کئے جانے لگے جزیہ ہٹا دیا گیا۔

زین العابدین کشمیر کے تمام مسلمان حکمرانوں میں سب سے قابل مدبر اور عظیم بادشاہ تھا۔ ہر زاویے سے اس کا عہد زریں حروف سے لکھنے کے لائق ہے۔ افلاطون کی نظر میں جو خوبیاں ایک قابل بادشاہ میں ہونی چاہئیں۔ زین العابدین میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ ایک طرف تو وہ متقی و زاہد تھا۔ تو دوسری طرف غیر مسلموں کے تئیں ہمدرد، مخلص اور ان کا بہی خواہ۔ وہ ایک ماہر عالم اور زباندان تھا اور میدان جنگ کا تجربہ کار سپاہی بھی۔ اس کی شخصیت لاتعداد شخصیات کا مرکب تھی۔ زین العابدین اپنی رعایا کا ہر دلعزیز حکمران تھا اور اسی ہر دلعزیزی کی وجہ سے رعایا نے اُسے بڈشاہ کا خطاب دیا تھا۔ زین العابدین کو علم اور عالموں کی تلاش رہتی تھی۔ خود بھی ایک بڑا عالم تھا۔ بہ یک وقت فارسی، عربی، سنسکرت، کشمیری اور لداخی زبانوں کا ماہر تھا۔ فارسی نظم میں اس کا الگ سے ایک دیوان ترتیب دیا گیا تھا۔

زین العابدین کی خوبیوں میں سب سے بڑی یہ خوبی ہے کہ وہ فرقہ پرستی سے کوسوں دور اور مذہبی رواداری کا دل سے قائل تھا۔ اس کے پیش رؤں نے مذہب کے نام پر جو بھی سختی اپنی رعایا پر برتی، زین العابدین نے نہ صرف وہ ختم کر دی بلکہ اپنے خزانے سے زر کثیر دے کر ان سختیوں کا ازالہ بھی کرا دیا۔ اس نے کسی بھی طرح اپنی غیر مسلم رعایا کے جذبات کو مجروح نہ ہونے دیا۔ اور نہ ہی ان میں کسی طرح کا احساس غیریت یا COMPLEX پیدا کرنے کی دانستہ کوشش کسی اہلکار کو کرنے دی۔

زین العابدین پہلا بادشاہ ہے جس کے عہد میں کشمیری زبان شاہی دربار میں داخل ہوئی۔

اس میں سرکاری سطح پر دار التحقیق اور دار الترجمہ قایم کیا گیا۔ کشمیری میں کئی ایک کتابیں لکھی گئیں۔ شاعروں نے کشمیری مشاعرے کئے۔ اور دنیا کی اہم کتابوں کے تراجم کشمیری میں شایع کئے گئے۔ زین العابدین ہی کے دور میں فن خطاطی کو عروج ملا۔

۵۲ سال کی حکومت کے بعد سلطان زین العابدین ۱۴۷۰ء میں فوت ہوا اور سلطان سکندر کے پہلو میں دفن ہوا۔

کہتے ہیں کہ زین العابدین عالم پرور ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی ایک اچھا شاعر تھا اور قطب تخلص کرتا تھا۔ مندرجہ ذیل اشعار بادشاہ ہی کی طرف منسوب ہیں:۔

ع

ای بگرد شمع رویت عالمی پروانۂ
وز لب شیرین تو شور لیست در ہر خانۂ
ماہ من گر میتوانی رحم کن بر بیدلان
کز تو ماند این حکایت در جہان افسانۂ
من بچندیں آشنا میخورم خون جگر
آشنا را حال این است وای بر بیگانۂ
گشتہ ام دیوانہ وجای ندارد خانہ ام
شب بہ کوے یار ہا شم روز در ویرانۂ
قطب مسکیں گر گناہے میکند عیش مہ کن
عیب نبود گر گناہے می کند دیوانۂ

سُلطان سِکندر

سلاطین کشمیر میں سُلطان سکندر کی شخصیت سب سے زیادہ CONTROVERCIAL رہی ہے۔ ہندو مورخ اگر ایک طرف سُلطان سکندر کو فرقہ پرست بُت شکن اور کٹر قسم کا مسلمان گردانتے ہیں تو دُوسری طرف مُسلمان مورخ اس کا نام اس طرح کے الفاظ کے ساتھ زبان پر لاتے ہیں۔

خداشناس، پیمبر صفت، سکندر شاہ

کہ آفرین خُدا بر روانش باد ہزار

ایک اندازے کے مطابق سِکندر ۷۸۳ ہجری میں پیدا ہوا اور صرف آٹھ سال کی عمر میں اپنے باپ سُلطان قطب الدین کا جانشین بنا۔ سُلطان سِکندر کی تربیت و تعلیم میں اس کی ماں ملکہ حورا کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

سکندر کے سُلطان بننے کے بعد ملکہ حورا نے پوری طاقت کے ساتھ اپنے بیٹے کے مخالفین کو دبایا۔ بیٹے کی سلطنت بچانے کی خاطر وہ اپنی بیٹی اور داماد تک کی جانی دشمن بن گئی اور ان کا قتل کرادیا۔ سکندر کی سپاہیانہ طاقت اور ولولہ انگیزی ملکہ حورا ہی کی دین ہے۔ سُلطان سکندر میں مذہبی جنون از حد تھا اور اسی جنون کی وجہ سے وہ سلطنت کے ہر کام میں مذہب ہی کو بنیاد بناتا تھا اور سُلطان کے اسی جنون کو حیلہ بنا کر سہہ بٹ نے ہندو دشمنی کی بدنام زمانہ پالیسی اختیار کر رکھی۔ مورخوں کی رائے میں ملک سیف الدین (سہہ بٹ) ہی نے سلطان سکندر کے نام پر غیر مسلم رعایا کے ساتھ بغض و عناد برتا اور ان کو قتل کرادیا۔ ان کی جائداد پر قبضہ کرلیا۔ مندر تڑوادیے اور جبزیہ بڑھادیا۔ پرہاسپور کی بستی جلادی گئی اور بجبہاڑہ کا تین سو سالہ پرانا مندر خاکستر کردیا گیا۔ اسی مندر کے پتھروں سے بجبہاڑہ کی جامع مسجد تعمیر کی گئی۔ جی، ایم، ڈی، صوفی کے مطابق سہہ بٹ یا ملک

سیف الدین نے ہی سلطان سکندر کے اعتقادات سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور اپنے ذاتی عناد کا بدلہ اپنے پرانے ہم مذہبوں سے لیا۔ لیکن جون راج کی نظر میں سلطان سکندر اس حد تک کمزور حکمران نہ تھا کہ ایک وزیر کے ہاتھوں کا کھلونا بن کے رہ جاتا۔ اس میں حکمرانی کی وہ تمام صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں جو ایک قابل ایڈمنسٹریٹر میں ہونی چاہئیں۔ جون راج کی نظروں میں سلطان "یاونوں" کے بہکاوے میں آ گئے۔ سکندر کے عہد میں سید محمد کی قیادت میں غیر ملکی "یاونوں" کی ایک بڑی جماعت وارد کشمیر ہوئی۔ وہ سکندر کی شہرت سن کر یہاں آئے تھے۔ اور آتے ہی اس ملک پر اس طرح چھا گئے جس طرح دھان کے کھیت پر ٹڈیوں کے دل چھا جاتے ہیں۔ ان ہی کے مشورے پر سلطان نے اس ملک سے "نجاست" دور کرنے کی ٹھان لی کیونکہ ان کی نظر میں کشمیر جیسا ملک گھٹا ٹوپ اندھیرے کا شکار تھا۔ سہہ بٹ کی تبدیلی مذہب اور اس پر ملیچھوں کے اثرات نے سکندر کے دل میں بُت شکنی کا شوق پیدا کیا۔ اس کے ہاتھ میں ہتھوڑا دیکھ کر دیوتا بھی پتھر ثابت ہوئے۔ جون راج کی نظروں میں سلطان سکندر ایک قوی حکمران تھا اور اس کی اجازت کے بغیر ملک سیف الدین ہندو دشمن پالیسی اختیار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

سکندر کی شخصیت کا دوسرا روپ ایک عالم اور نڈر سپاہی کے روپ میں ہمارے سامنے اس وقت آتا ہے جب تیمور کے حملے کے وقت اس نے حاضر دماغی سے کام لے کر مولانا نورالدین بدخشی کو دلی بھیجا اور ایک بڑی تباہی سے کشمیر کو بچا لیا۔ سلطان سکندر خود بھی ایک اچھا عالم تھا کہ عہد میں سید محمد مدنی کشمیر آئے۔ انہوں نے سلطان سکندر کی علم دوستی کا چرچا سن کر کشمیر آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مولانا افضل بخاری جیسے فاضل درسگاہوں میں مصروف تھے۔

سلطان سکندر ہی کے عہد میں سید میر محمد ہمدانی وارد کشمیر ہوئے ان کے ہمراہ تین ہزار سادات بھی تھے جن میں سے اکثر نے کشمیر ہی میں بود و باش اختیار کی۔ حضرت میر محمد ہمدانی نے سکندر ہی کے عہد میں شیخ العالم کو خط ارشاد بخشا۔ اس طرح کشمیر میں پنپنے والی دو تہذیبوں کا ایک طرح سنگم ہونے لگا۔ اور دو الگ تہذیبیں ایک دوسرے کے ساتھ مدغم ہو کر ایک ہی دھارے میں بہنے لگیں۔

سلطان سکندر کو اگر ایک طرف مندروں کا مسمار کرنے والا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ دوسری طرف

اسی سلطان کو کشمیر کی اکثر بڑی بڑی خانقاہوں کا موجد بھی گردانا جاتا ہے۔ سلطان سکندر ہی کے عہد میں سری نگر کی جامع مسجد کی تعمیر عمل میں آئی۔ زینہ کدل کے نزدیک خانقاہ معلیٰ کی تعمیر بھی مکمل ہوئی۔ ترال کی خانقاہ عالیہ کا سنگ بنیاد بھی سلطان سکندر ہی کے ہاتھوں رکھا گیا۔

۲۵ سال کی حکومت کے بعد سلطان سکندر ۷۸۳ ہجری میں فوت ہوا اور مزار سلاطین سری نگر میں دفن ہوا۔

مؤرخ حسن ایران و خراسان میں سلطان سکندر کی شہرت کے بارے میں رقمطراز ہیں:-

"در شجاعت و سخاوت و مروت مشہور شد و از شنیدن آوازۂ جود و احسان و بذل و امتنان او دانشمندان عراق و خراسان و ماوراء النہر وغیرہ بلاد بہ ملازمتش آمدند و علم و فضل و اسلام را در مملکت کشمیر رواج تمام پیدا شدہ نمونۂ عراق و خراسان گردید۔ مدعا کہ سلطان در عدل و رافت و احسان و جود و سخاوت و امتنان و کسر اصنام و رفع بدعات و ترقی اسلام مدت بیست و چہار سال و نہ ماہ و شش روز بسر بردہ"

سلطان علی شاہ

سلطان سکندر کا بڑا بیٹا تھا۔ اصلی نام میر خان تھا۔ سنہ ۸۱۶ ہجری میں جب سکندر فوت ہوا تو میر خان سلطان علی شاہ کے خطاب کے ساتھ کشمیر کا حکمران ہوا۔ کل ملا کر علی شاہ نے اڑھائی سال تک حکومت کی۔

زین العابدین کے برعکس سلطان علی شاہ ایک کمزور دل اور کمزور ذہن کا مالک تھا۔ اس کی اسی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر وزیر اعظم ملک سیف الدین من مانیاں کرتا رہا۔ ملک سیف الدین چار سال تک وزیر اعظم کے عہدے پر فائز رہا اور اس کی موت کے بعد ملک یوسف سلطان کا وزیر اعظم بنا اور اس نے بھی اپنے پیشرو کی سی پالیسی اپنائی۔ سلطان علی شاہ کے دور میں ہی نور الدین (یا شیخ نور الدین) پر اس وجہ سے پابندی عائد کی گئی کہ وہ ہندوؤں کے تئیں ہمدردانہ رویے کا قائل تھا۔ ملک یوسف شاہی خان کے ساتھ ایک جنگ میں مارا گیا اور شاہی خان وزیر اعظم بنا اور اتنا بڑا منصب حاصل کرتے ہی وہ لوگوں میں مقبول ہوا۔ سلطان علی شاہ نے جب شاہی خان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت دیکھی تو وہ شاہی خان کے حق میں تخت سے دستبردار ہوا اور حج کا رخت سفر باندھا۔ جموں کا راجہ بلا دیو جو علی شاہ کا خسر تھا یہ فیصلہ سن کر آپے سے باہر ہوا۔ اس نے علی شاہ کی مذمت کی اور علی شاہ اپنے خسر ہی کے کہنے پر واپس کشمیر میں وارد ہوا اور حج کا ارادہ بدل دیا۔ شاہی خان جو زین العابدین کے نام سے تخت نشین تھا۔ اپنے بڑے بھائی کے حق میں تخت سے دستبردار ہوا (کئی مؤرخوں کے حوالے کے مطابق شاہی خان آسانی سے دستبردار نہ ہوا بلکہ وہ علی شاہ کے مقابلے پر آیا اور جنگ ہار کر سیالکوٹ بھاگ گیا) علی شاہ کے دربار میں شاہی خان کے حواری تھے انہوں نے شاہی خان کی طاقت کا ڈنکا بڑھا چڑھا کر علی شاہ کے سامنے کرنا شروع کر دیا۔ رعایا چونکہ ملک یوسف اور سہہ بٹ کی وجہ سے سلطان علی شاہ سے نالاں تھی شاہی خان کی مقبولیت اور بھی خطرناک ثابت ہوئی۔ ان حالات کو دیکھتے

ہوئے سلطان علی شاہ نے شاہی خان کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ شاہی خان کی مدد کو سیالکوٹ کا راجہ جسرت کھوکھر آیا۔ تھنہ کے مقام پر دونوں فوجوں میں جنگ ہوئی اور علی شاہ ۱۴۲۰ء میں جسرت کھوکھر کے ہاتھوں مارا گیا۔

سنگرام ڈار

علاقہ چرار کا ایک صاحب ثروت آدمی تھا۔ اسی کی منت پر حضرت شیخ علاقہ روپہ ون سے اٹھ کر چرار شریف تشریف لائے اور سنگرام ڈار کے باغوں میں بیٹھ کر اپنی عمر کے سات سال گزار دیئے۔ سنگرام ڈار نے حضرت شیخ کی خدمت دل و جان سے کی اور خود بھی ریاضت و عبادت میں بہت بڑا مقام حاصل کیا۔

سنگرام ڈار کا مرقد چرار شریف کی خانقاہ سے لگ بھگ دو سو گز دور ہے۔ چرار شریف میں آج بھی سنگرام ڈار کی اولاد رہتی ہے۔

سنگرام (گنائی) گنے

علاقہ دریہ گام کا ایک ذی عزت آدمی تھا۔ اس نے حضرت شیخ کی اپنے گھر کے بالکل مقابل ایک حجرہ بنا دیا اور حضرت شیخ ایک سال تک اسی حجرے میں رہے۔ سنگرام گنائی کے ہاں سے ہر روز حضرت شیخ کی خاطر دودھ جاتا تھا اور اسی کے گھر میں حضرت شیخ کی وہ کرامت وقوع پذیر ہوئی جب کہ ایک بنیر گائے دودھ دینے لگی۔ ایک دن سنگرام گنے کی بیٹی حضرت شیخ کے ہاں دودھ لے کر آئی اور اس نے حضرت شیخ کے ہاں کئی انجانے لوگوں کو باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ دیکھنے میں وہ لوگ ایسے لگتے تھے جیسے وہ کوئی آسمانی مخلوق ہوں۔ چنانچہ اس نے من و عن اس واقع کا ذکر اپنے ماں باپ سے کیا اور دوسرے دن بیٹی کی موت واقع ہوئی۔ والدین حضرت شیخ سے خائف ہوئے اور حضرت شیخ آخر کار سنگرام گنے کے ہاں سے چلے آئے اور چرار شریف میں رہنے لگے۔ ان کا مدفن دریہ گام میں ہے۔

سیّد حسین سمنانیؒ

سید تاج الدین (مدفن اونتی پورہ) کے برادر اور شیخ رکن الدین عالم کے مرید تھے۔ ایک روایت کے مطابق حضرت امیر کبیرؒ کے ارشاد کے بموجب کشمیر میں مذہبی تبلیغ کے امکانات کا جائزہ لینے کی غرض سے آئے۔ ایک اور روایت کے مطابق حضرت سید حسین سمنانیؒ امیر تیمور کے تشدد کو دیکھکر آزردہ خاطر ہوئے اور اپنا آبائی وطن سمنان چھوڑ کر ہندوستان ہجرت کی اور دہلی کے نزدیک قصبہ سامان میں رہنے لگے اور وہاں سے چل کر ۷۷۳ھ ہجری میں وارد کشمیر ہوئے۔ پیر پنچال کی چوٹی کو عبور کرتے وقت ان کا گھوڑا زخمی ہوا اور بجائے گھوڑے کے ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھتے ہی پتھر دوڑنے لگا۔ کہتے ہیں کہ یہ پتھر ابھی تک ہرہ پورہ میں موجود ہے اور "پیر پل" کے نام سے مشہور ہے۔ قصبہ سامان کو چھوڑ کر آپ اکیلے ہی کشمیر آئے اور علاقہ دیوسر کو اپنا مسکن بنا لیا۔ کچھ مدت بعد آپکا اہل و عیال بھی دلی سے چل کر دیوسر میں آباد ہوا۔ آپ کے فرزند سید حسن سمنانی بھی آپ ہی کی طرح جید عالم اور صاحب سنت آدمی تھے۔ انہوں نے بھی اسلام کی ترویج و اشاعت کی خاطر دن رات ایک کیا۔

حضرت سیّد حسین سمنانی کی کرامات بہت ساری ہیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت شیخ العالم روحانی فائدے حاصل کرنے کی خاطر آپ کے حضور میں اکثر تشریف لاتے تھے۔ لل دید سے بھی آپ کی ملاقات ہوئی ہے۔

آپ ۱۱ ماہ شعبان ۸۹۲ھ ہجری کو چل بسے اور کولگام میں دفن ہوئے۔ آپ کی خانقاہ میں آج بھی ہزاروں عقیدت مند روزانہ آتے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ آستانہ کے لنگر میں روزانہ ایک خروار چاول پکا کر غریبوں اور یتیموں میں بانٹے جاتے تھے۔

سیّد حسین منطقیؒ

بیہق خراسان کا ایک شہر ہے۔ حضرت سید حسین منطقی بیہق کے بڑے سیدوں میں سے گردانے جاتے ہیں۔ آپ کے والد ماجد کا نام سیّد نور الدین اور دادا کا نام سیّد تاج الدین تھا۔ تیمور کے حملے کے وقت خراساں کو چھوڑ کر کشمیر چلے آئے۔ آپ کے ہمراہی کنبے کے تمام افراد تھے۔ سلطان سکندر کے عہد میں آپ کی سیاسی پوزیشن کافی حد تک مسلم تھی۔ اور بادشاہ سے قریبی تعلقات تھے۔ آپ ہی نے شہزادہ شاہی خان (بڈشاہ) کا نکاح سید محمد کا ندہ ہائی کی بیٹی سے کرایا۔ ملک کے معتبرین کے ساتھ ساتھ آپ کے تعلقات کشمیر سے باہر رہنے والے اکثر رؤسا کے ساتھ کافی حد تک دوستانہ تھے۔ بد قسمتی سے سکندر کے عہد میں ہندوستان کی ایک فوج نے کشمیر پر حملہ کر دیا۔ سلطان کے آدمیوں نے بادشاہ تک خبر پہنچائی کہ چونکہ سید حسن کے تعلقات حملہ آور راجہ کے ساتھ نہایت دوستانہ ہیں۔ اغلب ہے کہ سید حسن نے ہی حملہ آور کو ترغیب دی ہو۔ یہ تہمت سن کر سید حسن حملہ آور فوج کی صفوں میں گئے اور ان کی منت و سماجت کی لیکن وہ نہ مانے اور جنگ چھڑ گئی۔ اور سلطان سکندر نے حملہ آور کی فوجوں کو کچل کے رکھ دیا۔ آخیر میں سیّد حسن کو حکم دیا گیا کہ وہ کشمیر سے باہر چلے جائیں۔ سیّد حسن دلی چلے گئے اور کئی سال وہاں رہے۔

بعد میں بڈشاہ زین العابدین نے آپ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے آپ کو واپس کشمیر آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ آپ بڈشاہ کی دعوت پر دوبارہ کشمیر آئے۔

سیّد حسین کے تئیں بہت سی کرامات منسوب ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک بار بڈشاہ نے سید حسین سے درخواست کی کہ ان کی بیگم کے لئے اولاد کی دعا کیجئے۔ سیّد نے مکاشفے سے معلوم کیا اور پتہ چلا کہ سلطان کی بیگم بانجھ ہیں۔ چنانچہ آپ نے اپنے آستین میں ہاتھ ڈالا اور تازہ جنا ہوا بچہ یہ کہکر سلطان کو دے دیا کہ بچے کا نام امین رکھیں۔ ان

دنوں آپ کی اہلیہ بیگم دلی میں تھیں۔ جب وہ کشمیر آئیں تو آپ سے ایک عجیب واقعے کا ذکر کیا کہ فلاں تاریخ کو میرے ہاں ایک بچہ ہوا تھا معلوم نہیں کہ کس طرح وہ اپنے پالنے سے غائب ہوا۔ سید حسین نے بادشاہ کو دئے ہوئے بچے کو منگوایا اور کہا کہ یہ تمہارا بچہ ہے اور میں نے سُلطان کو دیدیا ہے۔ ماں نے بچے کو پہچانا اور اس کی بلائیں لینے لگیں۔

حضرت سیّد حسین منطق کے بڑے عالم تھے اسی وجہ سے آپ کو منطقی کہا جاتا ہے۔

آپ مزار سلاطین میں دفن ہیں۔

بادشاہ زین العابدین کے دربار میں جو مشائخ کبار اور اولیائے روزگار آتے جاتے تھے ان میں حضرت بہاؤالدین گنج بخشؒ، سیّد ناصرالدین بیہقیؒ اور مّلا کبیر جیسے علماء کے علاوہ حضرت سیّد حسین منطقیؒ بھی تھے۔ مؤرخ حسن لکھتے ہیں :-

" در خدمت سیّد حسین منطقیؒ اخذ بیعت کردہ بہ تربیت و تعلیم ایشاں صفای باطن حاصل کردہ بود۔"

سیّد علی بلخیؒ

شہر بلخ کے بادشاہ تھے۔ شروع ہی سے خدا دوستی کا غلبہ تھا۔ فرط شوق میں ایک بار تخت شاہی کو چھوڑ کر راہ بیابان اختیار کی۔ مصائب سفر کی تاب نہ لاکر رفیقہ حیات داغ مفارقت دے گئیں۔ مراقبے میں شیخ نورالدین نورانیؒ کی بیعت کرنے کا حکم ہوا۔ حسب ارشاد پاپیادہ کشمیر کی جانب چل پڑے۔ سات ماہ کے مسلسل سفر کے بعد ہیرہ پورہ پہنچے اور آنے جانے والوں سے حضرت شیخ العالمؒ کا نام و نشان دریافت کیا۔ بالآخر معلوم ہوا کہ حضرت شیخ علاقہ رہ پہ ون میں اپنے خلیفہ نصرالدین کے ساتھ مقیم ہیں۔ ادھر سے حضرت شیخ کو بھی مکاشفہ سے آپ کی آمد کا پتہ چل گیا چنانچہ بعجلت آپ کے استقبال کو چلے حضرت شیخ سے بیعت لے کر آپ پکھر پورہ میں مقیم ہوئے۔

روایت ہے کہ ایک روز آپ انتہائی مغموم اور کبیدہ خاطر تھے۔ حضرت شیخ نے سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ "وطن میں میرے والدین کی قبور ہیں چاہتا ہوں کہ ہر وقت انکی زیارت سے مستفید ہوتا رہوں اور خود بھی ان ہی کے پہلو میں دفن ہوں۔"

کہتے ہیں حضرت شیخ نے قبول کیا اور آنکھ جھپکتے ہی قبور مع باغ کے پکھر پورہ پہنچ گئیں حضرت سید کے مدفن کے ارد گرد سرسبز و شاداب درختوں کی موجودگی یہی وجہ بتائی جاتی ہے۔

۲۰ محرم الحرام ۸۱۶ھ میں آپ عالم جاودانی کو سدھارے اور پکھر پورہ میں مدفون ہوئے۔

سیّد محمد مدنیؒ

آپ کو مدین صاحب بھی کہا جاتا ہے۔ آپ ایک وسیع النظر عالم تھے جن کا سب سے بڑا ثبوت بڈشاہ زین العابدین جیسی شخصیت ہے جو آپ ہی کے شرف تلمذ سے مستفید ہو کر کشمیر کی تاریخ میں امر ہو کر رہ گئی۔ آپ بطور سفیر سلطان سکندر کے دربار میں حاضر ہوئے اور بادشاہ کی علم دوستی سے متاثر ہو کر کشمیر میں ہی آباد ہو کر درس و تدریس کا کام شروع کر دیا۔ آپ بڈشاہ کے عہد میں فوت ہوئے۔ اور بڈشاہ زین العابدین نے ہی آپ کا مقبرہ ۱۴۴۴ سنہ عیسوی میں تعمیر کرایا۔ طرز تعمیر کے لحاظ سے سیّد محمد مدنیؒ کا روضہ کئی اہم خصوصیات کا حامل ہے۔ اس کی دیواروں پر مختلف رنگوں کے ٹائل جڑے ہوئے تھے جن پر بہت ہی خوبصورت ڈیزائنوں میں گلکاری کی گئی تھی۔ اس قسم کے ٹائل کشمیر کی کسی عمارت میں موجود نہیں اور ہندوستان میں بھی دیوار پر دیدہ زیب ٹائل جوڑنے کا رواج مغل حکمرانوں کے دور میں مروج ہوا۔ ان ٹائلوں کے علاوہ روضہ کے دروازے کے اوپر ۴ فٹ لمبا حیوان بنایا گیا تھا جس کا دھڑ شیر کا سر انسان کا اور اژدھا کی شکل کی دُم تھی۔ یہ کشمیر کی واحد عمارت ہے جس کی تعمیر میں مغل دور سے پہلے کی گئی لکڑی پر کھدائی کے کام کے نمونے آج بھی موجود ہیں۔

۱۴۸۰ء میں پٹھان حکمران ابراہیم خان کے دور میں فرقہ وارانہ فساد ہوئے اور اسی فساد میں روضہ کے اہم حصے مسمار کر دئے گئے۔ فن تعمیر، سنگ تراشی، نقاشی اور گلکاری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہونے کے باوجود بھی آج مدین صاحبؒ کی مسجد غیر آباد ہے۔

شام بی بی

ایک بڑے جاگیردار کی اکلوتی بیٹی تھی۔ کہتے ہیں کہ شادی کے دن کہار ڈولی اُٹھائے شام بی بی کو سسرال کی اور لے جارہے تھے کہ محض اتفاق سے شیخ العالم کا گذر اس راستے سے ہوا۔ شام بی بی حضرت کو دیکھکر زار زار روئی اور ان سے اپنی کہانی کہنے لگی۔ حضرت شیخ نے بہت کہا کہ اپنے خاوند کے گھر جاو۔ میاں کی خدمت ہی تمہاری سب سے بڑی عبادت ہے لیکن شام بی بی نہ مانی اور زیور اتار کر حضرت شیخ کے پیچھے چل دی۔ تھوڑی ہی مدت میں روحانی منازل کو طے کیا۔ جنگلی ساگ (وہ پل ہاکھ) اور پانی کے سوا کسی اور چیز کی طرف راغب نہ ہوتی تھی۔

شام بی بی نے حضرت سید حسین کے ساتھ بھی ایک روز مجادلہ کیا اور ان سے یہ کہا کہ میں خراسان کی وہ چڑیا نہیں جو معمولی غلطی کی خاطر آپ کی ایک نظر سے بھسم ہو کر رہ گئی۔ میں حضرت شیخ کی طالب ہوں اور وہ میرے مرشد۔ ان کے ہوتے ہوئے میرا بال تک بیکا نہیں ہو سکتا۔

شام بی بی کا مرقد علاقہ دیوسر میں بابا قیام الدین کے روضے کے ساتھ ہی ہے۔

شری بھٹ

زین العابدین کے عہد میں دھرم ادھیکاری اور نظامت صحت کا انچارج تھا۔ وزیر بننے سے پہلے وقت کا ایک مشہور حکیم تھا اور کی دوکان زینہ کدل کے پاس تھی۔ سلطان سے اس کی دوستی کے بارے میں ایک دلچسپ داستان بیان کی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک بار بڈشاہ کی کلائی میں مہلک قسم کا پھوڑا نکل آیا۔ اس پھوڑے کو کشمیری میں "زہر باد" کہتے ہیں۔ ملک کے اکثر وید چونکہ سلطان سکندر ہی کے وقت سے ملک چھوڑ کر بھاگ اٹھے تھے بادشاہ کا علاج کرنے کے لئے کوئی بھی حکیم یا وید ہاتھ نہ آسکا۔ اتفاق سے بادشاہ کے آدمیوں کے ہاتھ شری بھٹ لگا اور بادشاہ کے دربار میں اس کی طلبی ہوئی۔ شری بھٹ تھر تھر کانپنے لگا۔ اور ہاتھ باندھے بادشاہ کے روبرو کھڑا ہوا۔ بادشاہ نے اپنی کلائی دکھائی اور شری بھٹ زہر باد کا علاج کرنے لگا۔ کچھ مدت بعد بادشاہ ٹھیک ہوا۔ اور خوش ہو کر شری بھٹ سے کہا کہ وہ اسے اس کی خدمت کے عوض منہ مانگا انعام دینے کو تیار ہے۔ شری بھٹ نے نہ دولت طلب کی اور نہ کوئی بڑا عہدہ۔ اس نے بادشاہ سے درخواست کی کہ غیر مسلم رعایا جو خوف کی وجہ سے سلطان سکندر اور علی شاہ کے دور میں کشمیر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے کو واپس بلا کر کشمیر میں آباد کیا جائے اور ان کے تئیں برادری، نرمی اور ہمدردی برتی جائے۔ ملک میں مذہبی آزادی کا اعلان کیا جائے اور جزیہ معاف کیا جائے۔ بادشاہ شری بھٹ کا یہ ایثار دیکھ کر بہت ہی متاثر ہوا اور نہ صرف یہ کہ غیر مسلموں کو رعایات دیدیں بلکہ شری بھٹ کو بھی اپنا مصاحب وصلاح کار بنا دیا۔ عمر بھر شری بھٹ کے سلطان زین العابدین سے قریبی تعلقات رہے۔ شری بھٹ ہی کی صلاح سے بڈشاہ نے ستی کی رسم پر عائد کردہ پابندی بھی اٹھائی اور جزیہ ۲ پل سے گرا کر صرف صرف ایک ماشہ رکھا کہتے ہیں کہ ایک ماشہ بھی برائے نام سرکاری کتابوں میں اندراج کی خاطر رکھا گیا تھا۔

ورنہ اس کے دور میں کسی نے بھی جزیہ جمع کرانے کی جرأت تک نہ کی۔

دھرم ادھیکاری مقرر کئے جانے کے بعد ہندو رعایا کا قضا و قدر شری بھٹ ہی کو سونپا گیا اور اس نے اپنی دانائی سے عدل و انصاف کے ایسے کارنامے انجام دئے کہ زین العابدین کا نام کشمیر کے سیاسی افق پر ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا۔ وہ ملک کی تمام عدالتوں کا مختار کل بھی رہا ہے یہاں تک کہ بادشاہ کی عدالت کا بھی۔

شری بھٹ ہی کے ایما پر سلطان زین العابدین نے عہد سکندری میں ڈھائے گئے مندر دوبارہ بنائے جانے کی اجازت دیدی اور ان کی تعمیر کی خاطر زر کثیر اپنے خزانے سے دیدیا۔ شاہ کول شری بھٹ ہی کی سرکردگی میں تعمیر کی گئی۔

شری بھٹ ۱۴۵۹ عیسوی میں فوت ہوا اور سلطان نے اس کی وفات پر ایک کروڑ دینار شری کا بھٹ کے بیٹوں کے درمیان تقسیم کئے۔ نقد رقم کے علاوہ ان کو ملک کے مختلف علاقوں میں جاگیریں بھی دیدیں۔

شری کنٹھ

کشمیر میں سدھ لوبے کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ علاقہ بانپور میں رہنے والے ایک اعلیٰ پایے کے برہمن تھے۔ ایک روایت کے مطابق سدھ شری کنٹھ کو لل دید کی وساطت سے حضرت شیخ تک رسائی حاصل ہوئی۔ ایک اور روایت کے مطابق سدھ لوبے حضرت شیخ کے ہاتھوں ہی مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں۔

سدھ شری کنٹھ شیو درشن کے ایک جید عالم اور وسوگپت جن کو شیو درشنی فلسفے کا خالق جانا جاتا ہے کے خاندان سے متعلق تھے۔ لل دید نے سدھ شری کنٹھ سے ہی اس فلسفے کی تعلیم حاصل کی۔

شنگہ بی بی

اپنے وقت کی مشہور رقاصہ تھی۔ لوگ اس کو "یاون ثمرؔ" کے نام سے بھی پکارتے تھے۔ کہتے ہیں کہ کچھ شر پسندوں نے حضرت شیخ کو بہکانے کی خاطر اس حسین رقاصہ کی خدمات حاصل کیں، اس کو کہا گیا کہ وہ اپنی تمام تر جلوہ نمازلیوں کے ساتھ حضرت شیخ کی کٹیا میں جائے اور جس طرح بھی ہو سکے ان کے ایمان میں شگاف ڈالنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ "یاون ثمرؔ" سج دھج کر ان کے ہاں گئی اور حضرت شیخ پر اپنے حسن کے جلوے بکھیرتی ہوئی یوں گویا ہوئی: "اے شیخ میرے حسن کو لوٹ لے" حضرت شیخ نے نظر اٹھا کر دیکھا اور کہا "کس حسن پر ناز کرتی ہو۔ ذرا اپنا چہرہ تو دیکھو۔ اسی حسن پر تمہیں ناز ہے"۔ یاون ثمر نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو دیکھا کہ سو برس کی بڑھیا کی طرح اس میں جھریاں پڑ رہی ہیں۔ وہ اپنی مسخ ہوتی ہوئی صورت دیکھ کر گھبرا گئی۔ غم سے اس کی کمر دوہری ہوئی اور تائب ہو کر ایکدم حضرت شیخ کے پاؤں پر گر کر زار زار رونے لگی۔ حضرت شیخ نے کہا "اپنے گناہوں سے توبہ کر لے"۔ اس دن کے بعد "یاون ثمرؔ" حضرت شیخ کے مریدوں میں شامل ہوئی اور انہوں نے اس کا نام شنگہ بی بی رکھ دیا۔ عمر بھر حضرت شیخ کی خدمت کی اور جب مرشد برگوار وفات پا گئے تو بہت دنوں تک ان کی آرام گاہ کے دروازے پر بیٹھی دن رات روتی رہی۔ آخر اسی دروازے پر جان دیدی۔ چرار شریف میں دفن ہوئی۔

شیخ سُلطان

سید میر محمد ہمدانی کے مصاحبوں میں سب سے روشن ضمیر اور صاحب حال بزرگ تھے۔ شیخ نورالدین بدخشی اور خواجہ اسحاق سے ارشاد کی سند حاصل کی تھی۔ شیخ سُلطان نے بہت سے ممالک کی سیر کی کچھ دنوں تک سری نگر کے محلہ درگجن میں ایک خانقاہ میں یادِ خدا کرتے رہے اور آخر عمر میں پکھلی تشریف لے گئے۔

حضرت شیخ نورالدین نورانی اور شیخ بہاؤالدین گنج بخش سے قریبی تعلقات تھے۔ علاقہ پکھلی میں آسودہ ہیں۔

شیخ سلیمان

اصلی نام سری کنٹھ تھا۔ کشمیر کے ایک رئیس گھرانے سے ان کا تعلق تھا۔ سلطان سکندر کے عہد میں مسلمان ہوئے اور رشتہ داروں نے ملک میں رہنے نہ دیا۔ ترک وطن کر کے سمرقند چلے گئے۔ وہاں کچھ سال رہ کر وطن واپس آئے لیکن بھائیوں کے ڈر سے دوبارہ کشمیر چھوڑ کر لولاب چلے گئے۔ لولاب کی وادی میں امیر کبیر سے مُلاقات ہوئی۔ حضرت امیر نے جب پُوچھا کہ کہاں سے آئے ہو تو شیخ سلیمان نے جواب دیا "حضرت سلیمان کی وادی سے آرہا ہوں"۔ امیر نے اسی دن سے آپ کو سلیمان کے نام سے پکارنا شروع کیا۔ بعد ازاں امیر کے ساتھ ہی کشمیر میں وارد ہوئے اور اس کے بعد یہیں بس گئے۔

جامع مسجد کے متصل آپ کا مزار ہے۔

قاضی جمال الدین

قاضی جمال الدین کی سلطان زین العابدین تک رسائی کی داستان بہت ہی دل چسپ ہے۔ کہتے ہیں جمال الدین ابتدا میں ہندوستان سے آئے تھے اور خانقاہ شاہ ہمدان میں درس و تدریس کا کام کرتے رہتے تھے مدرسی کے علاوہ وہ کبھی کبھار اپنے ہمسایوں کی عرضیاں لکھتے تھے جو بادشاہ کے حضور جاتی تھیں۔ سلطان زین العابدین چونکہ ہر عرضی خود پڑھنے کے عادی تھے جمال الدین کے طرز تحریر سے متاثر ہو جاتے تھے۔ ایک بار جمال الدین نے بادشاہ کے حضور کسی کی عرضی نظم میں لکھی۔ نظم کا مفہوم تنقیدی تھا اور آخری شعر کچھ اس طرح کا تھا۔

شہے کہ بود مہ ہوش بجائے مسکیناں
بجان و دل طلبید ے دعائے مسکیناں

زین العابدین نے جب یہ نظم پڑھی تو اس سے رہا نہ گیا۔ فوراً عرضی لکھنے والے کو بلوا بھیجا۔ دربار میں بلوا کر بادشاہ نے جمال الدین کی بہت ہی عزت و تکریم کی اور شہر کا قاضی القضا بنا دیا۔ اس دن سے ان کا نام قاضی جمال الدین ہوا۔

قاضی جمال الدین نے جھگڑے اس خلوص نیت سے چکائے کہ ملک میں ہر طرف ان کا نام روشن ہوا۔ آپ ایک بیدار مغز منصف تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک بار آپ کی عدالت میں عجیب قسم کا مقدمہ دائر ہوا۔ علاقہ بارہ مولہ میں رہنے والے کسی شخص کی گائے چند برس پہلے کھو گئی تھی۔ ایک دن اتفاق سے مالک نے اپنی گائے اننت ناگ میں دیکھی کہ وہ کسی کے آنگن میں گھاس چر رہی تھی اور گائے کے سامنے ہی اس کا بچھڑا اکھڑا تھا۔ گائے کے مالک نے گھر والوں سے صورت حال بیان کی لیکن وہ سرے سے منکر ہوتے اور کہا کہ یہ گائے ہمارے ہی گھر

میں پیدا ہوئی اور پلی بڑھی ہے ۔ چنانچہ بادشاہ کے حضور مقدمہ پیش کیا گیا اور سلطان نے قاضی جمال الدین کو حکم دے دیا کہ وہ حقیقت کی چھان بین کریں ۔ قاضی جمال الدین نے دونوں اشخاص کا بیان نوٹ کیا اور تھوڑی دیر تک سوچتے رہے ۔ آخر میں انہوں نے دو دن کے لئے مقدمہ اٹھا رکھا ۔ تیسرے دن قاضی جمال الدین نے گائے اور بچھڑے دونوں کو طلب کیا اور ملازموں سے کہا کہ وہ سنگھاڑے کی گھاس لاکر دونوں جانوروں کے سامنے رکھ دیں ۔ یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ سنگھاڑے کی گھاس صرف جھیل وُلر کے علاقے میں اُگتی ہے ۔ اور وہاں کے چوپائے اس کو بڑی رغبت سے کھاتے ہیں ۔ اننت ناگ کے علاقے میں چونکہ سنگھاڑے نہیں اُگتے اس لئے وہاں کے چوپائے اس قسم کی گھاس کھانے کے عادی نہیں ۔ چنانچہ جب ملازموں نے سنگھاڑے کی گھاس گائے اور بچھڑے کے سامنے رکھ دی تو لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ گائے اس گھاس کو دیکھتے ہی اس طرح لپکی جس طرح بچہ مٹھائی کی طرف لپکتا ہے ۔ لیکن بچھڑے نے گھاس کو صرف سونگھا اور سونگھ کر منہ اٹھا لیا ۔

قاضی جمال الدین مزار سلاطین میں دفن ہیں ۔

قاضی میر علی

زین العابدین کے عہد میں بخارا سے آئے تھے ۔ عقلی اور نقلی علموں میں سربلند عالم تھے ۔ مناظرہ میں زبردست تھے ۔ بادشاہ نے ان کی فضیلت دیکھ کر انہیں یہاں کا قاضی مقرر کیا اور کچھ جاگیریں بھی دیدیں ۔ ان کی اولاد میں سے اکثر قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائض رہے ہیں ۔

قاضی موسیٰ شہید بھی ان ہی کے اولاد میں سے تھے جو چکوں کے عہد میں شہید کئے گئے ۔

قطبُ الدین

اصل نام کمتی پنڈت تھا۔ سنسکرت کے جید عالم تھے۔ حضرت شیخ کے ساتھ بہت پہلے سے ہی علیک سلیک تھی۔ رفتہ رفتہ ان کی صحبت کا ایسا اثر ہوا کہ سارے کام چھوڑ کر ان ہی کی خدمت میں صبح و شام حاضر رہنے لگے۔ مسلمان ہونے کے بعد قطب الدین کہلائے۔

حضرت شیخ کے اکثر اشعار کو قطب الدین نے ہی شاردا رسم الخط میں زیب قرطاس کیا ہے اور ان کو کتابی شکل دی ہے۔

بابا قطب الدین اپنے مرشد ہی کے مزار میں دفن ہیں۔

قیامُ الدّین

شیخ العالم کے مصاحب میں بابا قیام الدین کا مرتبہ بلند ہے۔ ایام جوانی سے ہی مشہور مشائخ سے رابطہ رہا اور ان سے فیضان حاصل کیا۔

پرگنہ دِوسر میں گوشہ نشین ہو کر عبادت خدا میں ساری عمر مصروف رہے۔ کہا جاتا ہے کہ بابا قیام الدین نے ساری عمر ایک ہی خرقہ پہنا۔ جسم کی نشوونما کے ساتھ ان کا خرقہ بھی بقدر جثہ لمبا ہوتا گیا۔

آخر میں دیوسر میں دفن ہوئے۔

لچھم ریشی

شیخ العالم کے مصاحب تھے۔ ریاضت و مجاہدہ اور نفس کشی میں عمر بسر کی۔ رحلت کے بعد چرار شریف میں دفن ہوئے۔

لطیفُ الدّین

اصلی نام آدِتیہ رینہ تھا۔ علاقہ مرلھودا ڈاڈون کے حاکم تھے۔ اور ہر سال بادشاہ وقت کی خدمت میں سلامی کی غرض سے آتے تھے۔ ایک بار قسمت کی یاوری سے حضرت شیخ کی خدمت پہنچے۔ حضرت شیخ نے آنے کا مقصد پوچھا تو بابا بولے کہ آپ کے درشن کرنے آیا ہوں۔ حضرت شیخ بولے کہ تم میرے دوست بن سکتے ہو لیکن دوستی نبھانے کے لئے لازم ہے کہ تم بھی میرے ہم رنگ بن جاو۔ چنانچہ بابا نے دنیاداری چھوڑدی اور حضرت شیخ کے مصاحب میں شامل ہوگئے۔ انہوں نے لطیف الدین نام رکھا۔ عبادت و چلہ کشی کی خاطر پرگنہ ہگچھ کے گاؤں دو دُبھگر میں گوشہ نشین ہوئے۔

شیخ شریف اشوار نے ان کی خوب خدمت کی ہے۔ ایک دن شیخ شریف جنگلی ساگ اُبال رہے تھے کہ کہ ہانڈی سے لبق لبق کی آواز آئی۔ لطیف الدین نے دیکھا اور کہا۔ شیخ۔ تم نے زندہ ساگ ہانڈی میں ڈال دیا ہے ۔ یہ چلّا رہا ہے۔ بھلا میں یہ کیسے کھاسکوں گا۔" شیخ نے تند ہو کر بولے۔" تب آپ کا ژن (اندرائن کے پتے) کو اپنی غذا بنائیے"۔ بابا بولے" ہاں کل سے کاژن ہی میری غذا ہوگی"۔ اس کے بعد بابا لطیف الدین سچ مچ کاژن ہی کھانے لگے۔ حالانکہ یہ صحت کے لیے بہت ہی مضر کہلائے جاتے ہیں۔

واڈون میں کچھ برس قیام کرنے کے بعد بابا لطیف الدین وترہیل چلے گئے اور وہاں کچھ دیر قیام کیا۔ وترہیل کے بعد پوشکر کو اپنا مسکن بنالیا۔

ان کا مدفن پوشکر میں ہے جہاں ان کی زیارت دور نزدیک فیض و برکت کی آماجگاہ ہے۔

پھاگن کے مہینے کی پانچ تاریخ کو ان کا عرس منایا جاتا ہے۔

لل دید

لل دید سری نگر سے چھ میل دور سیمپورہ گاؤں کے ایک پنڈت گھرانے میں پیدا ہوئی اور وہاں سے دو میل دور قصبہ پانپور میں بیاہی گئی۔ سسرال میں اس کا نام پدماوتی رکھا گیا۔ اس کی ساس (جیسے کہ کشمیر میں ہر بہو کے ساتھ ہوتا رہا ہے) پدماوتی کے ساتھ بہت ہی برا سلوک کرتی رہی، اسے بدنام کرتی رہی اور طرح طرح کے الزام دیتی رہی۔ کہتے ہیں کہ وہ اس کے برتن میں چاولوں کے نیچے ایک پتھر رکھتی تھی۔ لل دید نے کبھی اپنی ساس کی شکایت نہ کی۔ لیکن ایک دن اس کے سسر کو پتہ چل ہی گیا اور اس نے گھر میں اودھم مچا دی۔ اس دن کے بعد ساس کی سختیاں بڑھتی ہی گئیں۔ بات بات پر لل کو طعنے اور کوسنے ملنے لگے۔

اس زمانے کے دستور کے مطابق لل دید نے اپنے خاندانی گرو سدھ شری کنٹھ سے اپدیش لیا اور تھوڑے ہی عرصے میں ریاضت میں وہ کمال حاصل کیا کہ اپنے گرو سے بھی بہت آگے نکل گئی۔ سسرال میں کچھ وقت گذرنے کے بعد آخر کار ایک دن گھر کو خیر باد کہا اور ایک مست قلندر کی طرح نیم برہنہ حالت میں جا بجا گھومنے لگی۔ رفتہ رفتہ لل دید کے نام سے مشہور ہوئی۔ روایت ہے کہ اسی دوران اس کی ملاقات میر سید علی ہمدانی سے ہوئی۔ حضرت امیر جتنے عرصے تک یہاں رہے۔ لل دید سے ان کی ملاقات ہوتی رہی۔

کہتے ہیں جس دن شیخ نورالدین تولد ہوئے۔ تو وہ اپنی ماں سے دودھ نہیں پیتے تھے۔ اتفاق سے لل دید کا گذر وہاں سے ہوا اور انہوں نے ہی بچے کی فہمایش ان الفاظ کے ساتھ کی۔ "زینہ ہیلہ نہ منہ چھوکھ۔ چینہ کیاز منہ چھوکھ" (جب پیدا ہونے میں شرم نہ آئی تو دودھ پینے میں کیسی شرم) کہتے ہیں کہ بچے نے اسی وقت دودھ پینا شروع کیا۔ لل دید شیخ نورالدین سے کئی دفعہ ملیں اور انہیں اپنے روحانی کمال اور وجدانی نظر و فکر سے متاثر کرتی رہیں۔

محمد امین ویسیؒ

سید حسین منطقی کے فرزند تھے اور انہوں نے اپنے مکاشفے کے ذریعے زین العابدین کی بیگم (دختر سید محمد کا ندہ ہامی) کو بخش دیا تھا۔ بادشاہ نے آپ کو بطور متبنیٰ پالا پوسا۔ آپ نے حاجی ابراہیم ادھم کی شاگردی میں دینی و دنیاوی علوم پر عبور حاصل کیا اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد خواجہ ہلال نقشبندی سے سلوک و منازل کے مقامات عبور کئے۔

ایام جوانی ہی میں امارت کو تج دیا اور اشم کے گاؤں میں گوشہ نشینی اختیار کی۔ بادشاہ نے اشم میں آپ کی عبادت کی خاطر ایک خانقاہ تعمیر کرائی۔ آپ اشم سے اٹھ کر قلعہ ہاری پربت کے دامن میں آ گئے اور وہیں پر ایک باغ لگوایا۔ اس باغ میں آپ کئی سال تک رہے اور آپ ہی کی نسبت سے یہ یہ علاقہ آج بھی "ببرہ واٹر" کے نام سے مشہور ہے۔ ببرہ واٹر میں چند سال گذرنے کے بعد آپ عالی کدل آئے وہاں ایک مسافر خانہ سجا کر اس میں باقی عمر گذار دی۔

سنہ ۸۸۹ ہجری میں جب کہ سلطان حسن شاہ کا راج تھا۔ احمد یتو اور تازی بٹ میں جنگ ہوئی۔ اس حملے کے دوران کسی نے آپ پر بھی حملہ کر دیا۔ اس حملے کی تاب نہ لا کر آپ فوت ہوئے۔ آپ شہید کشمیر کہلائے۔

حضرت ویسی اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے

زاں بہ کشمیر اندری شدہ ام　　　　کیں ہمہ جملہ بوستاں من است

چند روزے کہ بودہ ام بشما　　　　منتے زاں بسے بجان من است

مُلّا احمد کشمیری

سُلطان زین العابدین کے دربار میں ملک الشعراء تھے۔ مُلّا احمد علامہ آپ کے نانا تھے۔ مُلّا افضل بخاری سے مروجہ تعلیم حاصل کی اور تھوڑی ہی مدت میں اپنے ہم سبقوں سے بہت آگے نکل گئے۔ اپنی سعیٔ جمیل سے سُلطان زین العابدین کے مصاحب اور وزیر ہو گئے۔ سلطان ہی کے ایما پر کلہن کی راج ترنگنی کا ترجمہ فارسی میں کیا اور "بحر الاثمار" نام رکھا۔ اس کے علاوہ بہت سارے رسالے بھی آپ کی تصانیف میں شامل ہیں۔ ایک روایت ہے کہ مُلّا احمد کشمیری قطب تخلص کرتے تھے۔ بہت ہی حاضر جواب تھے۔ روایت ہے کہ ایک دن دربار میں داخل ہوئے۔ دستار کا شملہ پیشانی پر آویزاں تھا۔ بادشاہ نے از رُوئے مذاق کہا ؎

شاخِ پیشانیٔ مُلّا احمد کشمیری ببیں
گر ندیدستی تو در آفاق گاوِ شاخسار

مُلّا احمد نے جواباً یہ شعر کہا ؎

شاخِ پیشانی خدا یوا اگر گاوادی داشتم
تا نیایم درمیانِ مادہ گاواں در شمار

ایک بار بادشاہ کسی بات پر مُلّا احمد سے ناراض ہوئے اور فوراً ان سے کہا کہ ملک چھوڑ کر چلے جائیں۔ مُلّا احمد پکھلی پہونچے۔ پکھلی سے آپ نے بادشاہ کے نام شکایتاً یہ شعر بھیجا ؎

نئے بہ نحوم ز مبتدا خبرے — نے بہ منطق زِ جزو و کُل اثرے
بر منِ ایں کسرہ جر چرا رانند — احمد از غیر منصرف خوانند

بادشاہ نے یہ شعر سنا اور مُلّا احمد کو واپس بلوایا۔

مُلّا احمد علامہ

اپنے والد کے بعد شیخ الاسلام کے عہدے پر فائض ہوئے۔ جھگڑوں کے فیصلے کرانے میں اپنی نظیر آپ تھے۔ ان کے فیصلے آج تک زبان زد عام ہیں۔ عام لوگوں میں خیال تھا کہ مولانا کے تابع کوئی بھوت ہے جو ان کو ہر شخص کے اچھے اور برے افعال کی خبر ہر رات کو پہنچا دیتا ہے۔ اس لئے کسی کی جرأت نہ ہوتی تھی کہ غلطی کرتا۔ سلطان سکندر کے عہد میں ۸۱۵ھ ہجری میں واصل بحق ہوئے۔

مُلّا پارسا

زین العابدین کے عہد میں بخارا سے آئے اور مدرسہ سلطانی میں بطور مُدرس مُتعین ہوئے عالم باعمل ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ اہل قلم تھے۔ کہتے ہیں کہ زین العابدین کے بہت ہی ذی عزت مصاحب تھے۔

ملک جلال ٹھاکر

صاحب علم اور روشن ضمیر بزرگ تھے۔ آپ کا نسب سُلطان شہابُ الدین غوری تک جاتا ہے۔ سلطان زین العابدین کے عہد میں آپ کا خاندان وارد کشمیر ہوا۔ سلطان نے عزت و تکریم کی اور پرگنہ شاورہ کے گاؤں بطور جاگیر دئے اور اپنے مصاحبوں میں شامل کرکے ملک کا خطاب دیا اور سارے بھائیوں کو اپنی فوج میں شامل کیا۔ ملک جلال ٹھاکر کو اس کی خداداد لیاقت و استعداد کی بنا پر ملک سیف الدین کی بیٹی لچھم خاتون سے بیاہا۔ سُلطان کی وفات کے بعد سب بھائی نوکری سے مستعفی ہوئے اور ترک دنیا کر کے خلوت میں رہنے لگے۔ ملک جلال ٹھاکر نے گوجوارہ میں خانقاہ تعمیر کی اور لچھم خاتون نے جامع مسجد کو پانی پہونچانے کی غرض سے نالہ ہارون سے ایک نہر جاری کروائی جو نانوپورہ سے ہوتے ہوئے جامع مسجد تک جاتی تھی۔ یہ نہر لچھیم کوہل کے نام سے آج تک مشہور ہے۔

جلال ٹھاکر باطنی صفائی میں آپ اپنی نظیر تھے۔ حضرت شیخ العالم کے علاوہ آپ کو شیخ سُلطان زرہبادُالدین گنج بخش کے ساتھ بھی ذاتی اُنس تھا۔

آخر میں آپ گوجوارہ میں دفن ہوئے۔

ملک سیف الدین (سہہ بٹ)

ہندو مورخ اس کو فرقہ پرست۔ ظالم اور کینہ ور گردانتے ہیں اور مسلمان مورخوں کے نزدیک ملک سیف الدین سچا مسلمان۔ مذہب پرست، شجر معرفت کا دلدادہ کہلایا جاتا ہے۔

سُلطان سکندر ہی کے عہد سے مسند وزارت پر براجمان رہے سُلطان علی شاہ کے عہد میں صدر انجمن مشیران تھے۔ اصلی نام سہہ بٹ تھا۔ سید میر محمد ہمدانی کے ہاتھوں مسلمان ہوئے اور حضرت میر کے مریدوں میں شامل ہو کر معرفت و شریعت کی منزلوں کو عبور کیا۔ حضرت میر سے اختلاط اس قدر بڑھا کہ اپنی بیٹی کا بیاہ ان سے کرا دیا۔ بابا نصیب الدین غازی نے ملک سیف الدین کی اسلام دوستی کی بے حد تعریف کی ہے۔ جون راج کے مطابق غیر مسلموں پر ظلم و تشدد۔ مندروں کا مسمار کرنا اور مذہبی انتقام گیری ملک سیف الدین کا آخری دم تک خاصہ رہا ہے۔ جون راج اپنی تاریخ راج ترنگنی میں لکھتے ہیں کہ بڈشاہ سے پہلے کشمیر کے غیر مسلموں پر جو بھی ظلم ڈھائے گئے۔ سب سہہ بٹ ہی کے ایما پر ہوتے تھے۔ بُت خانوں کو مسمار کرنا غیر مسلموں کو جبراً دائرہ اسلام میں لانا اس کا شیوہ رہا۔ اس نے اپنے حکم سے اعلان نامے جاری کروائے جن کی رو سے مذہبی قربانی پر روک لگائی گئی۔ ناگ پوجا بند کی گئی اور اس ظلم سے نجات پانے کی خاطر جو لوگ وطن چھوڑ کر بھاگنا چاہتے تھے۔ ان پر روک لگا دی گئی۔ پرمٹ سسٹم چالو کیا گیا ان حادثات نے لوگوں کو یہاں تک مجبور کیا کہ وہ گھر والے بے گھر ہوئے اور گلی گلی کتوں کی طرح پھرنے لگے۔ سہہ بٹ ۸۲۵ ہجری میں فوت ہوئے اور عالی کدل کے نزدیک دفن کئے گئے۔

ملک سیف الدین کی موت کے بارے میں جون راج رقمطراز ہے۔ "یہ برہمن دق کے عارضہ میں مبتلا ہو کر چل بسا۔ اور یہ اس کے لئے اچھا ہی ہوا۔ کیونکہ اپنی کرتوت کے پیش نظر یہ اسی قابل تھا۔"

سہہ بٹ کے نام پر سری نگر کی مسجد سہہ یار۔ ایک گھاٹ سہہ یار بل اور محلہ سہہ یار ابھی تک مشہور ہیں۔

ملک لدی ماگرے

کشمیری پنڈتوں میں با اثر شخصیت کے مالک تھے حضرت امیر کبیر کی توجہ سے مسلمان ہوئے اور ان ہی کی صحبت میں اکثر رہنے لگے۔ ان کی تربیت میں ہی سلوک اور تصوّف کے منازل کو طے کیا۔ اور رخط ارشاد حاصل کیا۔

حضرت امیر جس وقت پکھلی گئے تو اور مصاحبین کے علاوہ ملک لدی ماگر۔ یہ بھی آپ کے ہمراہی تھے حضرت امیر نے اپنا علم ملک لدی ماگرے ہی کے سپرد کیا۔ جو آج تک اہالیان کشمیر کے لیے باعث نجات رہا ہے۔ آپ احمد پورہ بانگل میں مدفون ہیں۔

مولانا کبیر

سلطان زین العابدین کے عہد میں شاہی محل ہی کے نواح میں ایک بڑی یونیورسٹی تھی۔ اس یونیورسٹی سے وقت کے نامور عالم اور مدبر فارغ التحصیل ہوئے۔ یہ دارالعلوم آج کل کے نوشہرہ کے قرب وجوار میں واقع تھا۔ اور سترہویں صدی تک اہالیانِ کشمیر کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرتا رہا تھا۔

شاہی محل کے نزدیک ہونے کی وجہ سے سلطان اکثر اس دارالعلوم میں فیض پانے آتے رہتے تھے۔

اسی دارالعلوم کی سرپرستی کے لیئے سلطان کی نظر انتخاب مولانا کبیر پر پڑی مولانا کبیر علوم و فصاحت کے تمام شعبوں میں یکتا تھے۔

آپ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے سلطان نے آپ کو شیخ الاسلام کا خطاب دیا۔

کہتے ہیں کہ سلطان زین العابدین کی بصیرت اور حصول علم میں مولانا کبیر کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔

آپ ہی جیسے اُستادوں کی رہبری نے کشمیر کو زین العابدین جیسا عادل و منصف بادشاہ عطا کیا ہے۔

میر سید علی ہمدانیؒ

شجرۂ نسب والد بزرگوار کی طرف سے امام حسین تک اور والدہ ماجدہ کی طرف سے امام حسن پر ختم ہوتا ہے۔ میر سید علی ہمدانی کے والد ہمدان کے حاکم تھے اور سید شہاب الدین نام تھا۔ امیر کبیر کی ولادت ۱۲ ماہ رجب ۷۱۴ھ ہجری کو ہوئی۔ وہ دن سوموار کا تھا۔ ۱۱ سال کی عمر میں ہی علوم عقلیہ و نقلیہ سے فارغ التحصیل ہوئے۔ ظاہری علوم میں آپ کے مرشد سید علاؤالدین تھے اور ان ہی کی وساطت سے شیخ شرف الدین فرد قانی کی خدمت میں پہونچے اور ان ہی کے مدرسے میں آخر کار عام لوگوں کی تعلیم و تلقین پر مامور ہوئے۔

حضرت امیر میں وہ تمام خاصیتیں بدرجۂ اتم موجود تھیں جو ایک سچے مومن میں ہونی چاہئیں۔ آپ علم کا بے کراں سمندر تھے۔ آپ ساری عمر سفر میں رہے اور اس کے باوجود بھی تصنیف و تالیف کا شغل جاری رکھا۔ آپ کی مومنانہ شان کو دیکھ کر ہی لگ بھگ ۳۴ بزرگوں نے آپ کے نام خط ارشاد رقم کئے۔ آپ کی کرامات مشہور ہیں۔ جن میں تیمور کی طرف سے بطور امتحان تپتے ہوئے تانبے کے گھوڑے پر آپ کو سوار کرانا بھی شامل ہے۔ آپ سے ایک مردے کو زندہ کر دینے کی کرامت بھی منسوب ہے۔

امیر تیمور نے آپ کے لئے بھی جلاوطنی کا حکم دیا تھا۔ اور اسی حکم کی بنا پر آپ ۷۷۴ ہجری میں وارد کشمیر ہوئے اور محلہ شہاب الدین پورہ میں قیام فرمایا۔ آپ چار ماہ کشمیر میں رہے اور حج کا رخت سفر باندھ کر ہندوستان کی طرف روانہ ہوئے۔ دلی میں ان دنوں فیروز شاہ تغلق کی حکومت تھی۔ حج سے فارغ ہو کر آپ ۷۸۱ھ ہجری میں دوبارہ وارد کشمیر ہوئے۔ اس وقت آپ کے ہمراہ ۷۰۰ سادات اور عالم دین تھے۔ اس وقت آپ نے محلہ علاؤالدین پورہ (متصل خانقاہ معلیٰ) میں سکونت کیا۔ آپ کے حجرہ کے قریب کالی کا مندر تھا اس مندر کا پجاری آپ کی تلقین کے بعد مسلمان ہوا اور آپ کے حکم سے کالی کے مندر کو تڑوا کر

اس کے پتھروں سے ایک صفہ سجایا۔ آپ وہیں خلوت نشین ہوئے۔

سلطان قطب الدین آپ کے مریدوں میں شامل تھے۔ ۷۸۳ ہجری میں آپ تبت کی سیر کو گئے اور تین برس وہاں رہ کر ۷۸۵ ہجری میں واپس کشمیر آئے۔ اور یہاں آکر اوراد فتحیہ کو بلند آواز سے پڑھنے کی اجازت دے دی ۷۸۶ ہجری میں آپ پکھلی گئے اور اسی سال کُنر سواد میں رحلت فرمائی۔ تاریخ وصال ۶ ماہ ذی الحج ۷۸۶ھ ہے آپ حضرت قوام الدین بدخشی کے فتوا کے مطابق ختلان میں دفن کئے گئے۔

جو علم آپ کے ساتھ ساتھ رہتا تھا ملک لدی ماگرے کو بخشا گیا اور دوسرا علم اپنے ساتھ کشمیر لے آئے۔ کہتے ہیں کہ یہ علم آپ نے شیخ محمد ازدگانی سے حاصل کیا تھا۔ کشمیر میں اسلام کی ترویج و اشاعت آپ کی ذات گرامی ہی کی مرہون منت ہے۔ آپ خود بھی ایک بڑے عالم تھے۔ آپ کی تصانیف کی تعداد ایک سو پچاس کہی جاتی ہے جن میں سے اکثر کتابوں کے مسودے تاشقند میں محفوظ ہیں۔ آپ کی مشہور تصانیف یہ ہیں۔

ذخیرۃ الملوک، رسالہ نوریہ، درمعرفت صورت و سیرت انسان۔ درحقائق توبہ، حل الفصوص علی الفصوص، شرح قصیدہ عمریہ، فصوص الحکم، رسالۃ الاصطلاحات، علم القافیہ، دہ قاعدہ۔ کتاب المودۃ فی القربیٰ۔ کتاب السبعین فی فضائل امیر المومنین، اربعین امیریہ، روضۃ الفردوس، فردوس الاخبار منازل السالکین، اوراد الفتحیہ۔ خلاصۃ المناقب۔

آپ اعلیٰ پایہ کے صوفی شاعر تھے۔ "چہل اسرار" کے نام سے آپ کے مجموعہ کلام کو ترتیب دیا گیا ہے۔

آفریدآں مرد ایران صغیر
با ہنرہائے غریب و دلپذیر

میر محمد ہمدانی رح

امیر کبیر کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ والدہ کے انتقال کے وقت آپ کی عمر صرف بارہ برس تھی۔ حضرت امیر نے رحلت کے وقت دو دستاویزیں (وصیت نامہ و خلافت نامہ) مولانا سرائی کے حوالے کئے اور فرمایا کہ دونوں دستاویزات خواجہ اسحاق ختلانی اور مولانا نورالدین بدخشی کے پاس پہنچ جانے چاہئیں۔ جس وقت میر محمد ہمدانی جوان ہوئے تو آپ نے خواجہ ختلانی سے ان کاغذات کا تقاضا کیا۔ خواجہ نے وصیت نامہ بغیر کسی رکاوٹ کے آپ کے حوالے کیا لیکن خلافت نامہ آپ کو بخشنے میں ٹال کیا اور کہا کہ یہ کاغذ اس شخص کو دیا جائے گا جس کا رتبہ خادمیت سے مخدومیت کے مراحل انجام پا چکا ہوگا۔ ابھی آپ کے لئے یہ کاغذ اپنانے کا وقت نہیں آیا۔ جب آئے گا اور آپ اس کے اہل ہوں گے تو حوالے کیا جائے گا۔ چنانچہ میر محمد ہمدانی نے اسی دن سے سجادہ نشینی چھوڑ دی اور حضرت خواجہ کی خدمت میں لگ بھگ ساڑھے تین برس رہے۔ شروع شروع میں خواجہ کے لئے کلوخ استنجا تیار کرتے رہے۔ آخر میں پانی لانے کی خدمت سپرد ہوئی۔

۱۶ برس کی عمر میں آپ کے حوالے خلافت نامہ کیا گیا۔ آپ ۷۹۶ ہجری میں تین ہزار سادات کو لے کر وارد کشمیر ہوئے۔ ان دنوں کشمیر میں شیخ نورالدین نورانی کا چرچا تھا۔ حضرت شیخ نے جب مکاشفے سے آپ کی تشریف آوری معلوم کی تو بے اختیار کہہ اٹھے "کاشر پنا پیرا آو"

سلطان سکندر نے آپ کی آؤ بھگت کی اور آپ ہی کے کہنے پر خانقاہ معلیٰ کی تعمیر شروع کی۔ حضرت میر محمد ہمدانی اپنے ساتھ ایک بدخشانی لعل گراں آئے تھے وہ انہوں نے بنز گا سلطان کو بخش دیا اور سلطان نے اس کے عوض تین گاؤں ترال، لوئہ وُنی اور وچی بطور جاگیر آپ کو عطا کئے۔

جناب میر محمد ۲۲ سال وادی میں رہے اور اسلام کی ترویج و اشاعت کے لئے رات دن کام کیا۔

حضرت سید محمد ہمدانی کے نکاح میں حسن بہادر کی بیٹی تاج خاتون تھیں وہ صرف پانچ سال بعد اللہ کو پیاری ہوئیں ۔ ملک سیف الدین (سہہ بٹ) کی دختر بی بی بارعہ سے آپ کا نکاح ثانی کیا گیا۔ وہ بھی تین سال بعد فوت ہوئیں ۔ بی بی بارعہ کا مزار سری نگر سے تھوڑی دور کرالہ پورہ میں ہے اور 'دید ماج' کے نام سے مشہور ہے ۔

حضرت میر محمد ہمدانی تبت بھی تشریف لے گئے اور لداخ میں خانقاہیں تعمیر کرائیں

۸۱۷ ہجری میں آپ حج کو تشریف لے گئے ۔ اور ۸۵۴ ہجری میں ہمدان میں رحلت فرمائی ۔

آپ ہمدان میں اپنی والدہ ماجدہ کے ہمسایہ مدفون ہیں ۔

جون راج کے مطابق حضرت سید محمد ہمدانیؒ اگرچہ جوان سال تھے لیکن علم و اخلاق میں آپ کا مرتبہ بہت بلند تھا ۔ علم و تصوف کے موضوع پر آپ نے ۵۴ رسائل تصنیف کئے ہیں ۔

نصر الدین

اصل نام وُترَ کہا جاتا ہے۔ ان کے ماں باپ آسودہ حال تھے۔ بابا نصر کو بچپن ہی میں تپ کی بیماری لگی۔ اور اسی مقصد سے حضرت شیخ کے پاس لائے گئے۔ ان کی صحبت کا ایسا اثر ہوا کہ انہی کے ہو کر رہ گئے۔ مسلمان ہو کر نصر بابا کہلائے۔ حضرت شیخ کے ہاں لنگر خانہ کے مالک بنے اور بہت دیر تک ریشیوں فقیروں کی خدمت کرتے رہے۔

بابا نصر الدین کی نفس کشی کی داستانیں زبان زد عام ہیں۔ ایک دن ایک آدمی حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کی کہ "یا شیخ! نصر بابا تو خود دودھ پی جاتے ہیں اور ہم کو وپل ہاکھ (ایک جنگلی ساگ) کھلاتے رہتے ہیں" شیخ نے فرمایا کہ "اب کے جب وہ دودھ پینے لگے گا تو آپ اس کی دودھ بھری کٹوری اٹھا کر میرے پاس لے آنا"۔ چنانچہ موقع ملتے ہی وہ آدمی دودھ کی کٹوری لے کر حضرت شیخ کے سامنے حاضر ہوا۔ شیخ بولے کہ "آج تم ہی یہ دودھ پیو اور وہ بھی میرے سامنے"۔ اُس آدمی نے دودھ کا ایک گھونٹ بھرا اور جوں ہی اُسے دودھ کی بدمزگی علم ہوا تو تھو تھو کرنے لگا۔ حضرت شیخ نے نصر بابا سے دریافت کیا۔ "کب سے یہ مٹی گھول کر پینے لگے"۔ نصر بابا نے عرض کی کہ جب سے آپ کی درگاہ میں آیا ہوں۔ اس پر حضرت شیخ نے مٹی گھول کر پینے سے منع کیا اور کہا کہ آج سے چاول کھا کر افطار کیا کرو۔ اس دن کے بعد نصر بابا اٹھارہ دانے چاول اٹھاتے اور ان ہی سے افطار کیا کرتے۔

ایک بار چلہ کشی کا حکم ہوا تو نصر بابا نے چار اخروٹ دس دن کی خوراک کے لئے اٹھائے اور چلہ میں جانے سے پہلے ان کو توڑنے لگے۔ مرشد نے جب دیکھا کہ نصر اخروٹ توڑ رہا ہے تو اس نے وجہ پوچھی۔ نصر بابا بولے کہ چلہ کشی کی خاطر اخروٹ توڑ رہا ہوں۔ مرشد بولے "نصر! میں تو سمجھا تھا کہ تم نفس کو توڑ رہے ہو۔ تم تو ابھی تک اخروٹوں ہی کے جھمیلے میں پھنستے ہو۔ تم سے کیا ریاضت ہوگی"

چنانچہ جس دن نصر بابا چلے سے باہر آئے سارے کے سارے اخروٹ مرشد کے سامنے رکھے۔

حضرت شیخ کے کئی شلوک بابا نصر ہی کی طرف مخاطب ہو کر کہے گئے ہیں۔

حضرت شیخ کی وفات کے چند سال بعد نصر بابا کو اپنے مرشد خواب میں آئے اور کہا "نصر تم نے کافی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ اب میرے پاس آ جاؤ اور ملک جوگی رینہ کو ریشیوں کا ذمہ دار بناؤ"۔ جب نصر بابا کی آنکھ کھلی تو وہ متفکر ہوئے۔ کیونکہ بادشاہ کے وزیر کو کس منہ سے کہدیتے کہ تم ریشیوں کے سردار بنو۔ لیکن طوعاً کرہاً چلے گئے۔ ملک جوگی رینہ نے جب حضرت کا پیغام سُنا تو وہ ناراض ہوئے۔ نصر بابا منہ لٹکائے واپس آئے۔ دوسرے ہی روز علی الصباح ملک جوگی رینہ کپڑے پھاڑے دیوانہ وار نصر بابا کی خدمت میں چلے آئے۔ صرف ایک رات میں ان کے ہاں زبردست تبدیلی آئی تھی۔ ملک جوگی رینہ کے آتے ہی نصر بابا کو واپسی کی فکر لگی۔ ملک نے خوب خدمت کی اور اسی خدمت کے صلے میں وہ بھی منصب اعلیٰ پہ پہونچا۔

۸۵۵ ہجری میں نصر بابا نے انتقال کیا۔ مرتے وقت ان کی عمر ۵۴ برس کہی جاتی ہے۔

چرار شریف میں مرشد بزرگوار کی قبر کے پہلو میں دفن ہیں۔

کتاب نامہ

١	اسرارالاخیار	پیر حسن شاہ
٢	الہند	البیرونی
٣	تاریخ کشمیر	ملک حیدر چاڈورہ
۴	تاریخ حسن	پیر حسن شاہ
۵	تحائف الابرار	حاجی محی الدین مسکین
۶	تاریخ اقوام کشمیر	منشی محمد دین فوق
٧	دبستان مذاہب	ملا محسن فانی
٨	Raj Tarangini	Tr. M. A. Stein
٩	Zaina Raj Tarangni	Ed. S.K. Kaul
١٠	Kashir	G.M.D. Sufi
١١	Zainul Abidin	M.K. Zutshi

۱۲	Kashmir Under Sultans	Mohibul Hassan
۱۳	History of Muslim Rule in Kashmir	R.K. Parimu
۱۴	Ain Akbari	Jarrett
۱۵	کشمیری زبان اور شاعری	عبدالاحد آزاد
۱۶	کاشر زبانی ہند تاریخ	اوتار کرشن رہبر
۱۷	علمدار	کشمیر کلچرل آرگنائزیشن
۱۸	Valley of Kashmir	S.W. Lawrence.
۱۹	نورنامہ	امین کامل
۲۰	نورنامہ	بابا نصیب الدین غازی
۲۱	نورنامہ	بابا کمال
۲۲	نورنامہ	بابا خلیل

منسوب مقامات

مسعود سامون

فصل اوّل

سری نگر شہر کے جنوب مغرب میں تقریباً ۳۰ کلومیٹر کے فاصلے پر چرارِ شریف واقع ہے آس پاس دور دور تک جنگل نہیں ہے اور یہ چھوٹا سا قصبہ ایک سُرخ و زرد رنگ کے کریوہ پر آباد ہے آس پاس اس قسم کے کریووں کا ایک سلسلہ موجود ہے روایت ہے کہ پہلے اس کو چرار سون کہتے تھے اور یہ ایک گھنا جنگل تھا اور جب بڈشاہ نے پہلی بار زیارت شریف تعمیر کروائی تو لکڑی آس پاس سے پاس ہی میں دستیاب تھی۔

کہتے ہیں کہ جب حضرت شیخؒ یہاں پہنچے تو جگہ کا نام پوچھا جواب ملا۔ چرار۔ فوراً بولے وولہ نُوُد بیتی یرار (اے میری جان بسرا ہیں منتظر رہو) موجودہ زیارت کی جگہ دراصل سنگرام ڈار کا انگور کا باغ تھا اور اس جگہ کو دچھ ہار کہتے تھے جہاں آستانہ شریف واقع ہے اس کو پرابن یاری کہتے ہیں جہاں حضرت شیخؒ کو غسل دیا گیا اس جگہ کا نام شیبتہ واری اور جہاں تابوت شریف رکھ کر نماز جنازہ پڑھی گئی اس کو نند جنگ کہتے ہیں

بوڈ تلاؤ (بڑا تالاب) وہ تالاب ہے جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ بڈشاہ نے بنوایا تھا اس کا نام بھی بوڈ تلاو رہا۔ لوکٹ تلاؤ (چھوٹا تالاب) خانقاہ کے جنوب کی طرف واقع ہے اور کوکر تالاب نامی تالاب جو ردپہ دن سے آتے ہوئے راہ میں پڑتا تھا اب سوکھ گیا ہے۔

پنڈت سمسار چند کول اپنی کتاب Srinagar and its environs میں رقمطراز ہیں کہ چرار ہندوؤں کی ایک دیوی کا نام ہے اور موجودہ چرارِ شریف میں دراصل اُسی دیوی کا استھاپن تھا جس بنا پر یہ مقام اُسی دیوی کے نام سے منسوب ہوا اس وقت یہ ایک بڑا قصبہ ہے اور اس کی آبادی تقریباً ۸ ہزار نفوس پر مشتمل ہے کریوہ پر واقع ہونے کی وجہ سے یہاں دھان وغیرہ کی پیداوار نہیں ہوتی یہاں کی خاص پیداوار ناشپاتی ہے جو زائرین تبرکاً اطراف و اکناف میں لے جاتے ہیں چرارِ شریف کی کانگڑی اور مٹی کے برتن تمام وادی میں مشہور ہیں چنانچہ زائرین درگاہ شاید و باید ہی ان تبرکات کے بغیر گھر لوٹتے ہوں۔

حضرت شیخ العالم کے مرقد پرانوار کے ساتھ ہی وہ خانقاہ بھی موجود ہے جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ بڈشاہ نے اس کی تعمیر پہلی مرتبہ کروائی تھی چک سلاطین کے عہد میں یہ خانقاہ حادثۂ آتش کا شکار ہوگئی اور یعقوب چک نے اسے دوبارہ تعمیر کروایا۔ کہتے ہیں اس مرتبہ یہ قبلہ سے منحرف ہوگئی تھی چنانچہ حکی ریشی نے اس کو باطنی کمال کی مدد سے متحرک کر کے قبلہ رو کر دیا۔ عہد چغتائی ۱۱۴۹ھ میں دوبارہ نذر آتش ہوگئی۔ اس کے بعد خواجہ محمود دیدہ مری اور خواجہ نظام درابو نے تجدید تعمیر کروائی چنانچہ ۱۲۱۷ھ میں جب ایک مرتبہ پھر نذر آتش ہوگئی تو اس کے بعد حافظ عطا محمد خان جب مسند حکومت پر متمکن ہوا تو خانقاہ کو دوبارہ تعمیر کروایا اور روضہ شریف کو بھی تعمیر کیا۔ یہ تعمیر اب تک موجود ہے یہ وہی حافظ عطا محمد خان ہیں جنہوں نے حضرت شیخؒ کی یاد میں ایک سکہ بھی جاری کیا تھا۔

روضہ شریف میں حضرت شیخ العالمؒ کے آس پاس جو اصحاب مدفون ہیں ان کے بارے میں کسی شاعر نے کہا ہے ؎

گرد شمس العارفین این دہ ستارہ روشن اند
نصر الدین دجوگی ریشی لولی حاجی یک تن اند
روپ ریشی ریپ ریشی سہہ ریشی میرہم
ملا بابا فتہ بابا با جنید این دہ تن اند

یہ تمام اصحاب حضرت نصر الدینؒ کے سلسلۂ خلافت سے متعلق ہیں ان میں سے اب چرار شریف میں صرف دو کی اولاد موجود ہے جو مجاورین آستانہ ہیں۔ ۱۔ میر محمد ریشیؒ ۲۔ بابا جنید ریشیؒ

چرار شریف میں حضرت شیخ العالمؒ کے دربار پر انوار میں جو تبرکات شریف موجود ہیں ان کی تفصیل یہ ہے

۱۔ منجیلہ شریف سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہراؓ: یہ منجیلہ شریف زیر کونکا آب کھجور کے درخت کے چھلکوں کا بنا ہے اس کی نشان دہی خاص اوقات پر ہوتی ہے

۲۔ عصائے مبارک حضرت اویس قرنیؓ: اس عصا شریف کا دستہ بلور کا ہے اور باقی حصہ لکڑی کا ہے

۳۔ جامۂ مبارک حضرت شاہ ہمدانؒ: یہ جامۂ مبارک ۸ کلی ہے اور اس کا رنگ سبز ہے۔

مندرجہ بالا تینوں تبرکات حضرت شیخؒ کو حضرت میر محمد ہمدانیؒ نے بوقت وداع عطا فرمائے تھے

۴۔ عصائے مبارک حضرت شیخ العالمؒ :۔ اس عصا شریف کا دستہ چاندی کا ہے اور باقی حصّہ لکڑی کا ہے

۵۔ جامۂ مبارک حضرت شیخ العالمؒ :۔ اس جامۂ مبارک کا رنگ سفیدی مائل ہے اور یہ اونی ہے اس میں سرخ رنگ کی ہلکی ہلکی لکیریں بھی ہیں۔

۶۔ کاسہ ہای مبارک حضرت شیخ العالمؒ :۔ لکڑی کے دو پیالے موجود ہیں۔ ان کا سائز ناریل کا جتنا ہے ایک کاسہ مبارک میں سوراخ بھی ہے کہتے ہیں کہ حضرت شیخؒ پیالے میں دودھ بھرتے وقت سوراخ پر انگلی رکھ لیتے تھے۔ دہن شریف کے قریب لے جاتے تو انگلی اٹھاتے۔ دودھ دھڑ کر پیالے میں گر جاتا اور آپ ایک دو قطرے نوش فرما کر نفس سے مخاطب ہوتے کہ اے نفس دیکھ تو کتنا دودھ پیتا ہے۔

۷۔ نعلین مبارک حضرت شیخ العالمؒ :۔ یہ کشمیری طرز کی لکڑی کی بنی ہوئی کھڑاوں شریف ہے۔

۸۔ جامۂ مبارک حضرت سید محمد عالیؒ :۔ آپ بکھر پورہ میں مدفون ہیں یہاں آپکا جامۂ مبارک ہے جو اونی ہے اور رنگ سبز ہے۔

۹۔ تسبیح شریف حضرت سید محمد عالیؒ :۔ سرخی مائل رنگ کے چند دانے ہائے تسبیح ہیں۔ انگوٹھے کے برابر موٹے موٹے ہیں۔ شعوبیں لکڑی کے بنے ہوئے ہیں۔

تاریخیں لکھتی ہیں کہ چرار شریف میں حضرت غوث الاعظمؒ کا موئے مبارک بھی موجود تھا۔ جو نشان دہی کے وقت حادثتاً غائب ہوگیا۔

قصبہ چرار شریف کے مشاہیر

قطب الدین واعظ

آپ چرار شریف کے رہنے والے تھے قطب تخلص کرتے تھے کشمیری زبان میں آپ نے صوفیانہ طرز کا کلام یادگار چھوڑا ہے فارسی شعر بھی کہتے تھے زیادہ تر نعت ومنقبت کی طرف مائل تھے تمام منظومات میں گہرا مذہبی رنگ دکھائی دیتا ہے آپ نے ۲۷ رمضان ۱۲۷۱ھ کو وفات پائی اور حضرت ریشی العالمؒ کے آستانہ شریف کے صحن میں مدفون ہوئے۔

واعظ حیدر بابا

حیدر بابا چرار شریف کے رہنے والے تھے انہیں بابائے حیدر اوّل کہا جاتا ہے کیوں کہ چرار کے واعظ خاندان میں اس نام کے دو بزرگ گذرے ہیں حیدر بابائے دوم شاعر نہیں تھے آپ صوفی منش شاعر تھے زیادہ نعت ومنقبت سے شغف رکھتے تھے تقریباً ۱۸۵۵ء میں وفات پاکر آستانہ عالیہ کے صحن میں مدفون ہوئے۔

خواجہ اکرم بقال

چرار شریف میں رہتے تھے شاعر شیرین مقال کے لقب سے مشہور تھے دآدی لد تخلص کرتے تھے رندمزاجی اور عاشقی میں مشہور تھے قصبہ کی ایک حسینہ سے ان کے عشق کا خاصہ چرچا تھا بڑے خوش طبع اور شگفتہ مزاج تھے۔

مقبول شاہ کرالہ واری سے اصلاحِ سخن لیتے تھے آپ کے حریف اور ہم عصر حسن گنائی تھے

غزلیات کے علاوہ ایک مثنوی موسوم بہ "مہر و وفا" کشمیری زبان میں لکھی ہے اس میں جگہ جگہ ان کی اپنی سوانح کی جھلکیاں ملتی ہیں اس مثنوی کا مرتبہ کشمیری شاعری میں کافی اہم ہے۔ محبوبہ کی وفات سے دل برداشتہ ہو کر صرف چند سال جیے۔ آخر راہی ملک بقا ہو گئے۔

حسن گنائی

حسن نام اور تخلص بھی۔ گنائی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ قصبہ چرار ان کا مولد و مسکن تھا آپ بڑے بذلہ سنج اور حاضر جواب تھے غریب اور مفلوک الحال تھے کبھی کبھی درزی کا کام کیا کرتے تھے معمولی خواندہ تھے لیکن شعری استعداد اچھی تھی غزلیں، نعتیں، مناقب اور نظمیں کہی ہیں کشمیر میں ہیضہ کی وبا سے متاثر ہو کر ایک طویل نظم لکھی ہے ایک مثنوی "بوتل نامہ" لکھی ہے جس میں ۱۳۰۲ھ میں کشمیر میں آنے والے بھونچال کا سال درج ہے۔

آپ غزل سے زیادہ نظم کے شاعر تھے اور وقائع نگاری آپ کا خاص وصف ہے

حاجی الیاس بابا

آپ قصبہ چرار کے ریشی خاندان میں حاجی احمد کے ہاں ۱۹۳۸ بکرمی میں پیدا ہوئے علم دوست خاندان کے فرد ہونے کی وجہ سے ادبی ذوق ورانتاً ملا تھا۔ فارسی اور عربی سے واقف تھے مدبر اور معاملہ فہم مشہور تھے جوانی میں پٹواری رہے ہیں عین جوانی میں جوان فرزند کی ذولت سے ان کو زبردست صدمہ پہنچا۔ اس حادثہ پر انہوں نے ایک مرثیہ بھی لکھا ہے جو بڑا پرسوز ہے اس حادثہ جان کاہ نے ان کی شاعرانہ صلاحیتیں بڑی حد تک سلب کیں آخری عمر میں مذہبی رنگ کی منظومات کی طرف مائل ہوئے شباب میں عاشقانہ شعر کہتے تھے۔

کشمیری زبان میں مثنوی ممتاز بے نظیر، پانچ حصے "خنجر عشق" "مکر زن" مناقب، غزلیں نعتیں نیز کچھ مزاحیہ کلام بھی یادگار چھوڑا آخر عمر میں سیرۃ النبی کو منظوم کر رہے تھے جو تشنۂ تکمیل رہ گئی۔

غلام محمد زاغ

نام غلام محمد عوام بانڈے تھا اور کاڈیبنی کوا لقب تھا اسی وجہ سے اپنا تخلص زاغ رکھا آپ ۱۸۸۷ء میں چرار شریف میں محمد رمضان بانڈے کے گھر میں پیدا ہوئے آب وجد کا پیشہ تجارت تھا اس لئے کچھ پڑھے لکھے خاندان سے تعلق کی بنا پر کسب علم میں ان کو خاص دشواری پیش نہ آئی آپ کے والد اردو اور فارسی میں استعداد رکھتے تھے۔

آپ نے کشمیری کے علاوہ اردو اور فارسی میں بھی شعر لکھے ہیں آپ نے غزلیات کے علاوہ نعت منقبت اور مناجات بھی لکھے ہیں آخری عمر میں کلام شائع کرنے کا خیال بھی آیا تھا مگر ممکن نہ ہو سکا آپ ۱۹۴۷ء میں وفات پا گئے ان کے علاوہ چرار شریف میں دو ایسے بزرگ عالم شاعر اور معتقدین ریشی پیدا ہوئے ہیں جن پر چرار شریف کو فی الحقیقت فخر ہونا چاہیئے۔

بابا کمال چرار شریف کے ایک ریشی خاندان میں اٹھارویں صدی کے آخری ربع میں تولد ہوئے آپ نے حضرت شیخ کی سوانح اور ان کے کلام کو جمع اور مدون کرنے کی جو سعی بلیغ فرماتی تھے اس کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے آپ نے درویشی نامے ایک نظم اور دوسرا نثر میں لکھا ہے نثری کارنامہ کا نام ریشی نامہ عنبر شمامہ اور منظوم کارنامہ کا نام نور نامہ ہے اس کے علاوہ نعتیں اور مناقب علمدار بھی آپ سے منسوب ہیں ریشی نامہ عنبر شمامہ کی عبارت سلیس اور روان ہونے کی وجہ سے پسندیدہ ہے۔ آپ ۱۸۴۰ء میں وفات پا کر صحن آستانہ حضرت شیخ العالم میں مدفون ہوئے

بابا خلیل آپ بابا کمال کی وفات کے چند برس بعد چرار شریف میں پیدا ہوئے روضۃ الریاض نام کا ریشی نامہ لکھ کر آپ نے علمدار کشمیر کے کلام اور ان کی سوانح کے سلسلے میں بڑا گراں مایہ کام کیا ہے ہر چند اس ریشی نامہ منثور کی زبان بڑی مغلق اور پیچیدہ ہے لیکن اس کی افادیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے آپ نے حضرت شیخ کے کشمیری کلام کا بڑا خوبصورت فارسی ترجمہ بھی کیا ہے اصل کتاب نثر میں ہے پھر غزلیات منظومات اور مناقب جگہ جگہ بڑی مقدار میں درج ہیں۔ آپ آج سے تقریباً سو سال قبل واصل بحق ہو کر آستانہ حضرت شیخ کے صحن میں مدفون ہوئے۔

فصل دوم

قصبۂ چرار شریف کے خدّام درگاہ

زیارت شریف حضرت شیخؒ کے جتنے بھی خدّام اِس وقت موجود ہیں تین اصحاب کی اولاد ہیں۔ ۱۔ سنگرام ڈار ۲۔ جنید ریشی ۳۔ میر محمد ریشی آستانۂ عالیہ کے خدام میں نوبت کا جو طریقہ رائج ہے اس کے مطابق آج کے تمام خدّام اِن گیارہ "چھٹی داروں" کی اولاد ہیں جن میں ایک وقت درگاہ کی نوبتوں کی تقسیم ہوئی تھی جب یہ تقسیم عمل میں آئی تھی اس وقت یہ چھٹی دار تھے جس کا باقاعدہ ریکارڈ ابھی بھی موجود ہے[1]

۱۔ فتح اللہ ڈار ۲۔ ابراہیم شاہ گنائی ۳۔ الیاس بابا ۴۔ عمہ بابا ریشی ۵۔ میر عبدالخالق ۶۔ عبدالرحیم بابا ۷۔ نظام الدین بابا ۸۔ عبدالکریم بابا ۹۔ میر فتح اللہ بابا ۱۰۔ محمد صالح ڈار ۱۱۔ محمد ہاشم بابا

چنانچہ تمام موجودہ خدّام اِن ہی گیارہ اصحاب کی اولاد سے ہیں یہ گیارہ اصحاب بہ حساب ذیل تین متعلق خاندانوں سے متعلق ہیں۔

۱۔ سنگرام ڈار:۔ ۱۔ فتح اللہ ڈار ۲۔ محمد صالح ڈار[2]

۲۔ جنید ریشی:۔ ۱۔ ابراہیم شاہ گنائی ۲۔ الیاس بابا ۳۔ عمہ بابا ریشی ۴۔ عبدالرحیم بابا ۵۔ نظام الدین بابا ۶۔ عبدالکریم بابا ۷۔ محمد ہاشم بابا۔

۳۔ میر محمد ریشی:۔ ۱۔ میر عبدالخالق ۲۔ میر فتح اللہ۔

---

[1] اِن تمام اطلاعات کے لئے میں ماسٹر میر غلام نبی صاحب چرار شریف کا ممنون ہوں جو خود میر محمد ریشی کی اولاد سے ہیں۔ [2] اِن کی اولاد سے تعلق رکھنے والوں کا دعویٰ ہے کہ فتح اللہ ڈار اور محمد صالح ڈار کا نسب سنگرام ڈار سے ملتا ہے ہر چند اِن کے پاس کوئی ثبوت موجود نہیں لیکن روایتاً یہی مشہور ہے جو غلب ہے کہ صحیح ہے اِن کو یہاں کی اصطلاح میں ڈانگر کہتے ہیں۔

سنگرام ڈار:۔ سنگرام ڈار کے حسب و نسب اور زلو دیوم کے بارے میں زیادہ اطلاع بہم نہیں ہے۔ اتنا پتہ چلتا ہے کہ اِس کے آبا و اجداد یاردہ کے رہنے والے تھے خود چرار شریف کے قریب ایک وسیع رقبہ کے مالک تھے اِن ہی کی استدعا پر حضرتِ شیخ رہ نے اِس جگہ قیام فرمایا تھا جہاں آج روضہ شریف ہے یہ جگہ سنگرام ڈار کا باغ تھا اِن کا مدفن چرار شریف میں بر سر بازار واقع ہے تاریخ نویسوں کے بقول اِن کی اولاد اب بھی چرار شریف میں موجود ہے بقول بابا خلیل اِن کی اولاد میں سے مہند ڈار کی لڑکی سے جنید ریشی کا نکاح ہوا تھا۔

سنگرام ڈار کے موجودہ آستانہ شریف میں یہ شعر درج ہیں ؎

بنا شدہ آستانۂ سنگرام ڈار — سہ بلدہ سنہ ربیع الثانی در چرار شریف
بہ حسن اہتمام فقیر سبحان — ابد ابدی شدہ رضوان دیکھ ہار

جنید ریشی:۔ تلہ سر کے راجہ خمنی دالو اور بلدو کے راجہ مکندر راز کے درمیان جب لڑائی چھڑ گئی ہے تو خمنی دالو کے سپہ سالار اوگراستر ہوتے ہیں یہ حضرت شیخ العالم رہ کے جد ہیں لڑائی کے دوران مکندر راز کا ایک آدمی اوگراستر کو جب وہ سویا ہوتا ہے خنجر گھونپ کر ہلاک کرتا ہے بعد میں خمنی دالو بھی مکندر راز کو مار دیتا ہے مکندر راز کا یہ آدمی جو اوگراستر کو قتل کرتا ہے سری نگر میں زینہ کدل کے کنارے سکونت اختیار کرتا ہے۔ بقولِ بابا خلیل :۔

"و قاتل اوگراتیز در سری نگر افتاد۔ آن جا سکونت بر شط جوی بہت کہ بہ زینہ کدل اشتہار است اختیار کردہ"

اِن کے بقول اِس کے بعد اِس قاتل کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے جو علم و فضل میں یگانۂ روزگار ہوتا ہے اِس کی اولاد میں شوگہ گنائی نامی ایک شخص ہوتا ہے یہ بھی پڑھا لکھا ہوتا ہے اِس کا بیٹا حسن گنائی اِس کا بیٹا خاکی ریشی، اِس کا بیٹا نوری ریشی، اِس کا بیٹا شاہی ریشی، اِس کا بیٹا جوگی ریشی المعروف بہ جنید ریشی ہے۔ گویا شجرۂ نسب یوں ہے۔ جوگی ریشی المعروف بہ جنید ریشی — شاہی ریشی

خاکی ریشی — حسن گنائی — شاہ ریشی — عالم دنو سیندہ — قاتل اوگراتیز

جوگی ریشی المعروف جنید ریشی کی روحانی تربیت اس کا چچا فستہ ریشی کرتا ہے جو مجرد زندگی بسر کرتا ہے ریشی نامہ بابا خلیل میں درج ہے کہ جنید ریشی نے سنگرام ڈار کی اولاد میں سے نکاح کیا تھا ان کی اہلیہ کا نسب نامہ یوں درج ہے۔

بسنت ہند ڈار — ہند ڈار — رتن ڈار

بہرام ڈار — سنگرام ڈار

بابا جنید ریشی کسب زراعت کرتے تھے اور کسی کا دیا نہیں کھاتے تھے ان کی اولاد میں تین بیٹے اور ایک بیٹی یادگار رہ گئی تھی۔ وفات کے بعد آپ حضرت شیخ رح کے آستانہ میں ہی دفن ہوئے

گرد شمس العارفین این دہ ستارہ روشن اند
نصر الدین و جوگی ریشی لولی حاجی یک تن اند
روپ ریشی ریب ریشی سہہ ریشی نیر ہم
ملا بابا فستہ بابا باجنید این دہ تن اند[1]

میر محمد ریشی:۔ ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کے آبا و اجداد گجرات سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔ میر حیدر رلاری جو تولہ مولہ میں دفن ہیں اور مریدانِ حضرت مخدوم حمزہ کشمیری رح میں شمار ہوتے ہیں وہ بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

میر محمد سے کہ ان کی اولاد میں شمار ہونے والے دو چھٹی داروں میں سے ایک یعنی میر نعمت اللہ کا شجرہ درج ہے

میر محمد ریشی — میر صالح — میر حیات اللہ — میر حاجی نظام — میر سیف الدین

میر نعمت اللہ — میر عنایت اللہ — میر عبدالقادر — میر فتح اللہ

میر عبدالخالق کا شجرہ دستیاب نہیں ہو سکا۔

ان کے سلسلے کے جو خدام اس وقت درگاہ سے وابستہ ہیں ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچی ہے اس لئے ان سب کا حال لکھنا ناممکن ہے۔

۱؎ یہ اشعار آستانہ شریف میں سجادہ نشین کے بیٹھنے کی جگہ کے اوپر کھڑکی سے جڑی ہوئی ایک تختی پر لکھے ہوئے تھے اس کا خط دیکھا تھا جو آستانہ کے زیر نوشتہ رباعیوں کا ہے۔ نائب کا نام قاضی عبدالعزیز ہے آستانہ کی تعمیر نو کے وقت اس جگہ کو منہدم کیا گیا۔

فصل سوم

وادیٔ کشمیر میں حضرت شیخ العالمؒ کی قیام گاہیں

کھی جوگی پورہ

حضرت شیخؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ کیموہ میں پیدا ہوئے لیکن نئی تحقیق کے مطابق وہ کھی میں ہی تولد ہوئے ہیں چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

نتہ کھی ہر کے تیے زم دِتو نُند ہسنز بہ مسلمان

اسی گاؤں میں وہ چشمہ موجود ہے جہاں سدرہ ماں جی کو حضرت شیخؒ کے تولد کی بشارت ملی تھی یہ گاؤں کولگام کے شمال مغرب میں پانچ چھ کلو میٹر کی دوری پر موجود ہے حضرت شیخؒ کی والدہ کو جب یہ خبر ملی کہ صبح چشمہ میں دو گلدستے نمودار ہوں گے تو وہ علی الصباح چشمہ پہ چلی گئیں جہاں یاسمن کا گلدستہ ظاہر ہوا اس کو انہوں نے سونگھا جس کے طفیل بعد میں حضرت شیخؒ پیدا ہوئے۔

یہاں کچھ تبرکات موجود ہیں جو اس کہانی کو مزید مستحکم کرتے ہیں۔ چشمہ کے کنارے وہ پتھر موجود ہے جس پہ ہاتھ کا عکس موجود ہے کہتے ہیں گلدستے کو سونگھنے کے بعد سدرہ ماں جی کو بھاری پن کا احساس ہوا چنانچہ انہیں اس پتھر کا سہارا لینا پڑا اور ہاتھ کا عکس پتھر پر محفوظ ہو گیا جس پتھر سے سدرہ ماں جی کو ٹیک لگانے کی ضرورت پڑی اور اس پر کمر کا نشان پڑ گیا پتھر بھی چشمہ کے بیچ میں ہے ایک پتھر پر اونٹ کے پاؤں کا نشان ہے روایت ہے کہ اس اونٹ کے پاؤں کا ہے جس پر حضرت امیر کبیرؒ سوار تھے وہ سید حسین سمنانیؒ کے ہمیت سدرہ ماں جی کی تبرگری کے لئے آئے تھے جس گھوڑے پہ سید حسین سمنانیؒ سوار تھے اس کے سم کا عکس بھی ایک پتھر پر موجود ہے ایک پتھر پر حضرت شیخؒ کے پائے مبارک کا عکس بھی موجود ہے۔ اسی طرح سے حضرت شیخؒ کے نعلین مبارک کا عکس بھی ایک پتھر پر موجود ہے۔

ساگام برنگ:- ریشی نامے کہتے ہیں کہ حضرت شیخؒ کی اہلیہ محترمہ زِ تے دید ساگام برنگ کی رہنے والی تھیں لیکن تحقیق کے بعد یہ بات غلط ثابت ہوتی ہے کیونکہ زِ تے دید ساگام کی نہیں بلکہ ڈاڈسرہ کی تھیں۔ بطور شہادت یہ شلوک پیش کیا جاتا ہے۔

زِ تے بہ ڈراییس منز ڈاڈسرے .... الخ

کیموہ:- ضلع اننت ناگ کی تحصیل کولگام میں ونپوہ سے تین کلو میٹر کے فاصلے پر کیموہ نام کا گاؤں واقع ہے اکثر حضرات اس بات پہ متفق ہیں کہ حضرت شیخ یہیں تولد ہوئے۔

مراز کے مشہور گھاٹ کھڈونی سے متصل ہونے کی بنا پر کیموہ خود پرانے وقت میں جب حمل ونقل کا دارومدار کشتیوں پر تھا ایک اہم تجارتی مرکز رہا ہے اس کے قریب ایک گھنا جنگل بھی واقع تھا کلہن پنڈت اپنی تاریخ راج ترنگنی میں لکھتے ہیں کہ راجہ تمین کی بیوی واک پشتا بہ گرمشں اور راسش گاؤں میں دو خیرات خانے کھولے تھے آرل سٹین کہتے ہیں کہ کیموہ اور ییدمرہ یہی دو گاؤں تھے رجلیتا اس کا پرانا نام کیہ ورن تھا

کیموہ میں حضرت شیخؒ کے تولد کے معاملے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں لیکن متفقہ طور یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ ان کا بچپن اسی گاؤں میں گذرا یہیں للہ عارفہ نے انہیں تربیت عرفان سے سرفراز کیا حضرت میر حسین سمنانیؒ نے نغمہ معرفت سنایا اور امیر کبیرؒ نے نگاہ کیمیا اثر ڈالی یہیں حضرت شیخؒ نے نکاح کیا اور صاحب اولاد بنے اور یہیں سے انہوں نے وہ راہ اختیار کی جس کا پہلا زینہ گوپھ بل میں غار نشینی تھا۔

شیخ العالمؒ کیموہ میں کس جگہ تولد ہوئے اس میں بھی اختلاف ہے کچھ لوگوں کے بقول ان کی سکونت کرال ناگ کے پاس تھی یہ جگہ زیارت کیموہ سے تقریباً دو سو گز دور ہے ریشی نامے اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ ان کے ہمسایہ کلال یعنی کرال (کمہار) رہتے تھے دوسری رائے ہے کہ وہ اس جگہ پیدا ہوئے جہاں آج جامع مسجد کی وہ کھڑکی ہے جو زیارت شریف کے دائیں طرف ہے۔

حضرت شیخؒ کے اہل خانہ تمام کیموہ میں دفن ہیں اور ان سب کی قبور زیارت گاہ خلائق ہیں اس زیارت گاہ میں شیخ سالار دین، سدرہ ماجی، زِ تے دید، زون دید اور بابا حیدر یعنی بالترتیب والد، والدہ، اہلیہ، دختر اور فرزند دفن ہیں۔ زیارت گاہ کے پاس چشمہ میں وہ تختہ اب تک موجود ہے

جس کے بارے میں منقول ہے کہ حضرت شیخؒ نے اپنے بچوں کو اسی پر غسل دیا تھا۔ یہ زیارت گاہ پگوڈا طرزِ تعمیر کی یادگار ہے اس کی چار چھتیں ہیں اور ان چھتوں پر ایک شاندار کلس استادہ ہے زیارت گاہ کا اندرونی حصہ اور ڈیوڑھی رنگ برنگ نقش و نگار سے مزین ہے۔ دائیں طرف جامع مسجد ہے جس کا ایک حصہ پرانا اور دوسرا نیا ہے۔

اس کے علاوہ کیموہ کے گرد و نواح میں کچھ جگہیں ہیں جو حضرت شیخ سے متعلق ہیں۔

۱۔ شیخہ عنارہ:۔ ایک بڑا دھان کا کھیت ہے کہتے ہیں حضرتِ شیخؒ خود اس میں نلائی کرتے تھے اس میں کبھی کھاد ڈالنے کی ضرورت نہیں رہی۔

۲۔ ندری سر:۔ یہ تالاب سدرہ ماں جی سے منسوب ہے کہتے ہیں اس میں بہت لذیذ ندرو اُگتے تھے

۳۔ پش پہل:۔ بابا بام الدین کے والد اتن پنڈت سکونت فرماتے تھے اور مورتیاں گڑھتے تھے کچھ عرصہ قبل کھدائی سے کچھ مورتیاں بھی دستیاب ہوئی ہیں کہتے ہیں کہ اتن پنڈت نے یہاں سے مٹن (ذمہ زو) کی طرف ہجرت کی جہاں مورتیوں کے لئے وافر مقدار میں پتھر موجود تھے

۴۔ ووڈری نار:۔ یہ گوپھ بل کے سامنے واقع ہے یہاں وہ جلاہا رہتا تھا جس کے پاس حضرت شیخؒ کو کسب ہنر کے لئے بھیجا گیا تھا۔

۵۔ گوپھ بل:۔ یہاں وہ غار ہے جس میں حضرتِ شیخؒ نے بارہ سال ریاضت کی غار کے نزدیک ایک بڑا درخت (ELEM) ہے جس کے بارے میں روایت ہے کہ حضرتِ شیخؒ نے اس کو اپنے دستِ مبارک سے لگایا تھا۔ غار کے اندر اس درخت کی دو جڑیں ہیں غار میں اترنے کے لئے ایک سیڑھی بنی ہے گوپھ بل میں نئے آستانہ کے قریب ایک پرانا حجرہ بھی ہے جس میں سبز رنگ کا ایک پتھر ہے کچھ اصحاب کا خیال ہے کہ یادن شر اسی جگہ حضرتِ شیخؒ کو ہٹانے کی نیت سے آئی تھی غار میں ایک آدمی کے لیٹنے کی جگہ موجود ہے

۶۔ مانچھ ناگ:۔ یہ چشمہ زیارت کے آنگن میں ہے لمبائی ۱۲ فٹ اور چوڑائی ۹ فٹ ہے۔ ارد گرد اونچی دیوار ہے۔

ہر سال ۲۶ ر پوہ ۔ گوکیموہ میں حضرت شیخ رح کا عرس عقیدت اور احترام کے ساتھ منایا جاتا ہے اِس موقع پر کچھ تبرکات کی نشان دہی بھی کی جاتی ہے ایک چھوٹا پھرن جو حضرت شیخ رح کو حضرت سید حسین سمنانی رح نے عطا فرمایا تھا ایک پیالہ جس میں حضرت شیخ رح دودھ پیتے تھے ایک پتھر کی اوکھلی جس میں آپ کاسنی کوٹتے تھے اور ایک عصا شریف بھی موجود ہے۔

ڈاڈہ سرہ ترال حضرت شیخ رح کی اہلیہ محترمہ زَے دید کا میکہ اِسی گاؤں میں تھا۔ بقول شاعر ؎

زے یہ ڈرایس منز ڈاڈہ سرے
اکبر دین چھم مالس ناو
جمال دین کمال دین باے چھم گرے
شیخہ بہ مرے تہ روزی کتھ

(زے نام کی میں ڈاڈہ سرہ سے آئی۔ میرے باپ کا نام اکبر دین ہے جمال دین کمال دین میرے بھائی اپنے گھر میں ہیں۔ اے شیخ میں مرجاؤں گی اور بات رہ جائے گی)

ڈاڈہ سرہ میں اکبر دین کا مقبرہ اب بھی مرجع خلائق ہے زَے دید کے دونوں بھائی جمال دین اور کمال دین بھی والد کے پہلو میں دفن ہیں۔

محلہ مختہ پکھری سری نگر یہ سری نگر میں وزیر باغ کے قریب واقع ہے حضرت شیخ العالم رح نے یہاں چھ مہینے قیام کیا ہے روایت ہے کہ سوزن ریشی کو تباہ کرنے کے بعد یادن لولی حضرت شیخ رح کو بھٹکانے کی نیت سے یہیں پر آئی تھی لیکن حضرت شیخ رح کی کرامت سے اِس کی صورت مسخ ہو جاتی ہے اور وہ تائب ہو کر ساری عمر حضرت شیخ رح کی ہو کر رہ جاتی ہے لیکن کچھ لوگوں کے بقول یہ واقعہ گوہ پل میں پیش آیا تھا۔ موختہ مل میں اِس پتھر پر زیارت تعمیر ہوئی ہے جس پر حضرت شیخ رح نے قیام کیا تھا۔

ہونچی پورہ یہ گاؤں تحصیل بیروہ میں واقع ہے روایت ہے کہ جب حضرت شیخ رح یہاں پہنچے تو گاؤں کے باہر ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے دیکھا تو کچھ لڑکیاں کرژھ کاٹ رہی تھیں حضرت شیخ رح نے فرمایا ؎

کَندِ ماجہ چھو نیشِل کتران　　ترَن دِ وان در دتو،
کوٗنہٕ ماجہ چھےٚ پلک سران　　تتہِ ہوٗرن بۆرن کوتو،

جواب ملاسہ　　اُسی ہا مالِہ چھہ مالِہ ڈُکر دِدان
تۆ سۆتۍ ہوران داسس درا تو،
ژٕ چھکھ ماجہ رۄہۍ سا سا کتران
گۆژھ چھکھ کران زن تو دَرتو،

یہ لڑکی شام دیدؒ تھی جس کا روضہ شریف پشکر میں واقع ہے آپ یہیں حضرتِ شیخؒ کے حلقۂ معرفت میں داخل ہو گئیں۔ روایت ہے کہ اس کے بعد حضرتِ شیخؒ نے عصا کا استعمال ترک کیا اس مقام پر حضرتِ شیخؒ نے سات سال قیام کیا اسی قیام کے دوران "دہت دیدؒ" اور "بہت دیدؒ" بھی حضرتِ شیخؒ سے فیض یاب ہوئیں جو زاپہ کور کے نام سے مشہور رہیں۔

کہتے ہیں حضرتِ شیخؒ یہاں سے کھاگ جانے پر آمادہ نہ ہوتے تھے اور کہتے تھے کھاگ جنت کا باغ ہے اگر یہیں ملا تو وہاں کیا کروں گا۔

ستہ ہاون:۔ ہونچی پورہ سے روانہ ہونے کے بعد حضرتِ شیخؒ نے چھ مہینے ستہ ہاون میں قیام کیا یہ گاؤں بیروہ تحصیل میں واقع ہے یہاں ایک زیارت گاہ ہے جو مرجع خلائق ہے وہ پتھر بھی موجود ہے جس کے اوپر حضرتِ شیخؒ نے قیام فرمایا ہے یہاں سے حضرتِ شیخؒ دریہ گام کے لئے تشریف لے گئے

دریہ گام:۔ حضرتِ شیخؒ نے دریہ گام میں بارہ سال قیام فرمایا سنگی گنائی نے اس تمام عرصہ میں آپ کی خدمت کی۔ روایت ہے کہ حضرتِ شیخؒ یہاں پہنچے تو ان کو کانگڑی کی حاجت محسوس ہوئی سنگی گنائی آگ سے بھری ہوئی کانگڑی لے کر آیا اور گھر میں آنے کی التجا کی حضرتِ شیخؒ سنگی گنائی کے ہاں سے بدستور دودھ پیتے رہے آخر اس کی بیوی کی کسی غلطی پر حضرتِ شیخؒ وہاں سے روانہ ہوئے آپ نے فرمایا کہ جس کو کچھ مانگنا ہو وہ یہاں جمعرات کو آئے اور مانگے۔

یہاں ایک پُر رونق زیارت موجود ہے جو پگوڑا طرز تعمیر کی ہے ہر سال یہاں حضرتِ شیخؒ کا

عصائے مبارک ۲۔ لوہ کو سنایا جاتا ہے اور ان تبرکات شریف کی نشان دہی کی جاتی ہے۔
۱۔ جامۂ مبارک ۲۔ عصائے مبارک ۳۔ وہ اوکھلی جس میں کاسنی کوٹتے تھے ۴۔ دودھ پینے کا پیالہ۔

دریگام میں سنگی گنائی کی اولاد سے اب کوئی موجود نہیں۔ آستانہ شریف کے مجاور ظریف بیگ کی نسل سے ہیں جس نے سنگی گنائی کی بیٹی سے نکاح کیا تھا وہ خود بدخشان کا رہنے والا تھا۔

روپہ ون:۔ چرار شریف کے شمال مغرب میں پون میل کی دوری پر روپہ ون واقع ہے حضرت شیخ کی زندگی کے آخری سات سال اسی جگہ گزرے ہیں حاکم وقت نے روپہ ون ان کے پردادا کو جاگیر میں دیا تھا لیکن افتاد زمانہ سے یہ ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا حضرت شیخ یہاں جس پتھر پر تشریف رکھتے تھے موجود ہے یہاں وہ درخت بھی موجود ہے جس کے نیچے بیٹھ کر حضرت شیخ کاسنی کوٹا کرتے تھے یہاں ایک آستانہ شریف موجود ہے۔

گوڈ ستھو:۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے اور سری نگر کے ہوائی اڈہ کے جنوب مغرب میں آباد ہے راج ترنگنی کے مصنف پنڈت کلہن کے بقول یہ وہ گاؤں ہے جہاں راجہ دامودر نے کریوہ پر پانی چڑھانے کی کوشش کے سلسلے میں ایک بند تعمیر کیا تھا بابر سنز کی وفات کے بعد حضرت شیخ کے والد گرامی حضرت شیخ سالار دین اسلام قبول کر کے اسی گاؤں میں سکونت پذیر ہوئے یہیں ان کا نکاح صدرہ ماں جی کے ساتھ ہوا۔ اس کے بعد وہ کیموہ میں جا کر بس گئے۔

○

تجزیۂ سخن

موتی لال ساقی

موتی لال ساقی

حضرت شیخ کی شاعری

حضرت شیخ" کی ہمہ جہت شخصیت روشنی کا ایک ایسا مینار ہے، جس سے کشمیریوں نے صدیوں سے کسب فیض کیا ہے۔ وہ بیک وقت ایک عظیم ریشی، بالغ نظر مفکر، بلند مرتبہ مبلغ بلند قامت شاعر اور انقلابی تھے۔ ان کی ضیا پاش شخصیت نے ہماری تہذیب اور ثقافت کو ضیا بار کر رکھا ہے۔

حضرت علمدار "جمہوریت" کے اولین علمبردار ہونے کے ناطے ایک ایسی درخشندہ اور تابندہ علامت بن کر ابھرے ہیں جس نے ہماری تہذیب کو ایک منفرد مزاج عطا کیا ہے۔ ایک ایسا مزاج اور رنگ جس کی بدولت گزشتہ چھ سات سو سال کے دوران ہمارے یہاں انسان کی عظمت اور انسانی قدروں کا بول بالا رہا ہے ؎

شو چھے تھلہِ تھلہِ رُد زان!
موزان ہیوند تہٕ مسلمان!
ترُکھے چھکھ پننُن پان پرزان
سوے چھے صاحبس زانی زان

ترجمہ: سورج کی کرنیں جس طرح کائنات کے ذرّے ذرّے کو منور کرتی ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کا جلوہ ساری دنیا میں جاری و ساری ہے۔ ہندو اور مسلمان الگ الگ نہیں ہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو روپ ہیں۔ اگر تو عقلمند ہے تو جان لے کہ تمہارا یہ جسم بھی کسی اور کی امانت

ہے ۔ اس راز کو پانا ہی حق تک رسائی پانے کے برابر ہے ۔

یہ اسی آفاقی پیغام کا نتیجہ ہے کہ جس وقت برصغیر ہند و پاکستان میں انسان انسانی قدروں کو پامال کر کے وحشی اور درندہ بن گیا ۔ اُس وقت بھی کشمیر میں بھائی چارے اور اخوت کا پھریرا پوری آن بان کے ساتھ لہراتا رہا ۔

شیخ العالمؒ کی زندگی اور پیغام کو سمجھنے میں تاریخ کی کتابیں زیادہ دُور تک ہمارا ساتھ نہیں دیتیں مگر اُن کا رس بھرا کلام ہر موڑ اور ہر مرحلے پر ہماری راہنمائی کرنے کے لئے کافی ہے ۔ جس شخص نے حضرت شیخ کے کلام کا ڈوب کر مطالعہ نہیں کیا وہ اُن کی رُوحانی عظمت ، ریشیت کی اساس اور اُن کے انقلابی ذہن تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا ۔ اور تو اور اُن کی زندگی کے متعدد گوشوں کی جانکاری بھی کلام کا مطالعہ کئے بنا ناممکن العمل ہے ۔ اس لحاظ سے اُن کا کلام ایک ایسا صحیفہ ہے جو نہ صرف اُن کی شاعری یا نہ پڑھائی کو ظاہر کرتا ہے بلکہ اُن کی زندگی اور پیغام کو سمجھنے کا واحد ذریعہ ہے ۔

حضرت شیخؒ کے کلام کو قرآنِ کریم کا کشمیری رُوپ کہا جاتا ہے جو بذاتِ خود اس کلام کے تقدس کا ضامن ہے مگر اس کے علاوہ اُن کی شاعری ہماری توجہ کچھ ایسی حقیقتوں کی طرف مبذول کرتی ہے جن کے بارے میں علمدارؒ کے ہمعصر مورخین یا تو جان بوجھ کر خاموش رہے ہیں یا ورنہ اُن کی توجہ اِن حقیقتوں کی طرف مبذول نہیں ہوئی ہے ۔

اس سے پہلے کہ ہم شیخ العالمؒ کے کلام کا جائزہ مختلف حیثیتوں سے لیں ۔ میرے خیال میں یہ بات ضروری ہے کہ ہم اُن ماخذوں کو تلاش کرنے کی کوشش کریں جن کی بدولت اُن کا گراں قدر کلام ہمارا ادبی اور تہذیبی ورثہ بن سکا ہے ۔

حضرتِ شیخؒ کے کلام کے مآخذ

مختلف ریشی ناموں اور نورالدین

ناموں میں اس بات کا تذکرہ موجود ہے کہ حضرت شیخ کا کلام ان کا ایک خلیفہ کشتی پنڈت دوران کے ساتھ ساتھ رہ کر قلم بند کیا کرتا تھا مگر اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ یا اس کی کوئی نقل زمانے کے دست و برد سے بچ کر ہم تک پہنچ نہ سکی ہے۔ دورِ بادشاہی میں کے منفرد عالم اور مورخ ملا احمد کے بارے میں یہ حوالہ دیا گیا ہے کہ اس نے حضرت شیخؒ کے کلام کو فارسی کا جامہ پہنایا تھا۔ مگر ان کی لکھی ہوئی تاریخ "وقایع کشمیر" کی طرح ان کا کیا ہوا حضرت شیخ کے کلام کا فارسی ترجمہ بھی ناپید ہے۔ اب لے دے کے ہماری نظریں ابوالفقرا بابا نصیب الدین غازیؒ کے "نور نامہ" پر جا کے ٹھہرتی ہیں۔ غازی صاحب کا لکھا ہوا نور نامہ اگرچہ علمدار کشمیرؒ کی زندگی کے کچھ اہم واقعات اور معاصر حالات کو سمجھنے میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے مگر جہاں تک کلام شیخ کا تعلق ہے۔ اس اہم کتاب میں حضرت شیخ کا کلام آٹے میں نمک کے مصداق ہے۔

عبدالوہاب شائق کی کتاب "تواریخ ریشیاں" (ریاض الاسلام) راجہ سکھ جیون مل کے عہد کی تخلیق ہے۔ اس غیر مطبوعہ کتاب میں حضرت شیخ اور ان کے خلفائے کے حالات فارسی میں نظم کئے گئے ہیں مگر حضرت شیخ کا کلام اس میں کسی بھی جگہ درج نہیں۔ ملا بہاؤالدین متو کا "ریشی نامہ" بھی حضرت شیخ کی زندگی اور پیام سے متعلق فارسی میں ایک منظوم کارنامہ ہے مگر شیخ کاملؒ کا پُر وقار کلام اس میں بھی نظر نہیں آتا۔

چرار شریف کے بابا کمال اور بابا خلیل صحیح معنوں میں حضرت شیخ کے فدوی ہو گذرے ہیں اور یہ بات بلا خوف و تردید کہی جا سکتی ہے کہ حضرت شیخ کا کلام ہم لوگوں کو ان ہی لوگوں کی دین ہے جس کے لئے تمام کشمیری لوگوں کو ان لوگوں کا شکر سپاس ہونا چاہیئے۔ اگر ان دو حضرات نے حضرت شیخ کے کلام کو ادھر ادھر سے سمیٹ کر اپنے ریشی ناموں میں درج نہیں کیا ہوتا۔ اس صورت میں ہمیں شیخ کاملؒ کے کلام کو مرتب کرنے میں ایسی ہی دقتوں کا سامنا ہوتا جو دقتیں ہمیں آج "لل دید" کے کلام کو مرتب کرتے وقت پیش آرہی ہیں کیونکہ بھاسکر رازدان کے مرتب کئے ہوئے ساٹھ واکھیوں پر مشتمل قلمی نسخے کے سوا اب تک ہمارے پاس ایسی کوئی دستاویز موجود نہیں جو لل دید کے کلام کو

مدون کرنے میں ہماری ممد و معاون ثابت ہوتی۔

چرار شریف کے "ریشی ناموں" میں حضرت شیخ کے کلام کے علاوہ لل دید کے کلام کا کچھ حصہ بھی ایک الگ باب میں درج ہے۔ اس طرح یہ ریشی نامے کلام شیخ کا تحفظ کرنے کے علاوہ کسی حد تک لل دید کے کلام کو بھی کسی حد تک محفوظ کرنے کا ذریعہ بن گئے ہیں۔ لل دید کے کلام کا تحفظ کرنے میں باسکر رازدان کے بعد بابا کمال اور بابا خلیل کا نام آنا اسلئے ضروری ہے کیونکہ قدرت کے لحاظ سے یہ "ریشی نامے" دوسرے نمبر پر آتے ہیں۔ یہ امر تعجب خیز ہے کہ آج تک جن لوگوں نے بھی لل واکھیہ مرتب کیئے ہیں، ان میں سے کسی ایک نے بھی ان ریشی ناموں سے کسب فیض نہیں کیا ہے اور نہ ہی ان کا ذکر کیا ہے۔

میر عبداللہ کے مرتب کردہ "کلام شیخ العالم" میں وہ وسعت اور پھیلاؤ نہیں جو بابا کمال اور بابا خلیل کے ریشی ناموں میں نظر آتا ہے۔ مگر اس کے باوجود بھی اس قلمی نسخے کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلّمہ ہے۔

اس مخطوطے کا واحد نسخہ

کلچرل اکادمی کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ نسخے پر تاریخ تحریر درج نہیں ہے مگر اس کا طرز تحریر اور کاغذ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ نسخہ کم از کم دو لیٹنے دو سو سال پرانا ہے اس نسخے کو اس لحاظ سے بھی کلیدی اہمیت حاصل ہے کہ چرار شریف سے باہر لکھا گیا یہ واحد قلمی نسخہ ہے جس میں حضرت شیخ کا کلام درج ہے۔

حضرت شیخ کے کلام کو کرمشورہ کے علی شاہ نے بھی اپنے کشیری ریشی نامے میں شامل کیا ہے مگر اس کی الگ سے کوئی اہمیت نہیں کیونکہ شاہ صاحب کا ریشی نامہ دراصل بابا کمال کے فارسی منظوم ریشی نامے کا کشمیری روپ ہے اور اس کا کچھ حصہ بابا کمال کے ہی فارسی نثر میں لکھے گئے "ریشی نامے" سے لیا گیا ہے۔

جہاں تک بابا کمال اور بابا خلیل کے ریشی ناموں کا تعلق ہے۔ میری دانست میں

باباکمال کے منظوم ریشی نامے کو اس سلسلے میں اولیت حاصل ہے۔ کیونکہ بابا خلیل نے اپنے ریشی نامے (روضۃ الریاضات) میں ایک جگہ حضرتِ شیخ کے کلام کا وہ فارسی منظوم ترجمہ شامل کیا ہے جو باباکمال کا کیا ہوا ہے۔ باباکمال کے ریشی نامے کو اس لحاظ سے بھی اعتبار حاصل ہے کیونکہ اس کا تعلق براہِ راست ریشی سلسلے کے ساتھ تھا۔ وہ جنید ریشیؒ کی ساتویں پشت سے تعلق رکھتے تھے جبکہ بابا خلیل کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ بات حوصلہ شکن ہے کہ حضرتِ شیخ کے کلام کو مرتب کرنے والوں میں سے کسی ایک نے بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا ہے کہ انھوں نے جو کلام ریشی ناموں میں حضرتِ شیخ سے منسوب کیا ہے اس کی سند کیا ہے۔ نہ ہی انہوں نے اُن ذرائع کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جن کی بدولت اُن کی رسائی کلام تک ہو سکی ہے۔ ریشی ناموں میں درج کلام کے حصول کے میری دانست میں صرف دو ہی ذرائع ہو سکتے ہیں۔ عوامی یادداشت یا کلامِ شیخ پر مشتمل کوئی پرانا نسخہ۔

یادداشت کے سہارے کلام کا قلمبند کیا جانا کوئی تعجب امر نہیں۔ ویدوں کے مقدس منتر صدیوں تک زبانی زبانی گرو سے شِشّ اور باپ سے بیٹے کو منتقل کئے جاتے رہے۔ جب تک ان منتروں کو کاغذ پر اُتارا گیا۔ حافظے کی بنیاد پر قلم بند کئے گئے۔ کلام کو صرف حافظے میں محفوظ ہونے کی وجہ سے غیر مستند نہیں کہا جا سکتا۔ دُنیا کے قدیم ادب کا کافی بڑا حصّہ اسی ذریعے کی بدولت ہماری وراثت بن سکا ہے۔

جہاں تک حضرتِ شیخ کے کلام کا تعلق ہے وہ ہمارے لئے ایک بیش قیمت خزانہ ہے یہ کلام نہ صرف کشمیری ادب کے بابِ اوّلین کا مقتدر حصّہ ہے بلکہ اتھل پتھل کے دور میں کشمیری ذہن کی آئینہ داری بھی ہے۔ یہ کلام وہ روشن قندیل ہے جسے صدیوں پہلے روشن کیا گیا ہے اور کوئی بھی آندھی یا طوفان اس قندیل کو بجھانے میں کامیابی نہیں پا سکا۔

شیخ کاملؒ کے کلام سے متعلق مختلف قلمی نسخوں کے مطالعے سے کچھ اہم سوالات ہمارے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ جن پر غور کرنے سے نتائج اخذ کرنے میں کسی حد تک ہماری رہنمائی ہو سکتی ہے۔

ابتدائی دور میں لکھے گئے ریشی ناموں میں اگرچہ حضرتِ شیخ کا کلام بہت کم درج ہے مگر

ان کا ذکر واضح الفاظ میں ملتا ہے ۔ "اسرار الابرار" میں بابا داوؤد مشکواتی نے اور بالوند کے علاوہ علمدار کے کلام کے ایک حصے کو "گوری" کے نام سے موسوم کیا ہے ۔ خود چرار شریف کے ریشی ناموں میں حضرت شیخ کے کلام کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ پہلے حصے میں وہ اشلوک وغیرہ شامل کئے گئے ہیں جو کسی حد تک قابلِ فہم ہیں ۔ دوسرے حصے میں وہ کلام شامل کیا گیا ہے ، اس حصے کو مرتبین شمسکرتی اور پنڈتی کا نام دیا ہے ۔ اس زمرے میں حضرت شیخ کا وہ کلام شامل کیا گیا ہے جس میں سنسکرت اور قدیم کشمیری پراکرت کے الفاظ قدرے زیادہ تعداد میں ملتے ہیں ۔

کلام کے اس حصے کو مرتبین نے ناقابلِ فہم قرار دے کر بھی درج کیا ہے ۔ اتنا ہی نہیں بابا خلیل نے "روضۃ الریاضات" میں حضرت شیخ ؒ کی نظم "بدھ چیرت" کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ۔

" چوں قدم در سن سی و سہ سال نہادم از غار پُر انوار بر آمدہ روز چند نوم کتابی در تصوف بدچیرت نام یعنی عقل افسرانیدہ بزبان سمش کرتی مشتمل بر دو ہزار بیا صدبیت انشا کردم ۔"

اس سلسلے میں کلام شیخ کے مرتب میر عبداللہ کا یہ بیان بھی قابلِ غور ہے :-

" فقیر حقیر میر عبداللہ متوطن کشمیر جنت نظیر مگویدکہ چوں کلام حقیقت انجام حضرت پیر روشن ضمیر شیخ نورالدین نورانی و حضرت للہ صاحبہ قدس اللہ از مدتے منتشر افتادہ بود بلکہ بعضی ابیات آں الفاظ از صفحہ خاطر و کتب بالکل محو و منسی شدہ بود فقیر حقیر کمر سعی بستہ ۔ از بیاض و منقولات متفرقہ تصحیح رسانیدہ ہم بزبانِ کشمیر دریں رسالہ درج کردم تا پراگندہ نشوند"

ان حقائق کی روشنی میں یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ حضرت شیخ کا کلام کافی دیر تک تحریری صورت میں موجود تھا ۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو مختلف قلمی نسخوں میں حضرت شیخ ؒ کے کلام کے بارے میں تبدیلات کا کوئی ذکر نہ ہوتا ۔ سمشکرتی کلام کو ناقابلِ فہم قرار دے کر بھی ریشی ناموں

میں ان کا اندراج اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ یہ نظمیں یا مسلسل گیت کسی پرانے نسخے سے نقل کئے گئے ہیں۔

بابا خلیل نے جس اعتماد کے ساتھ "بدھ چرت" کا تذکرہ کیا ہے اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ریشی نامہ قلم بند کرتے وقت نظم کا مسودہ فاضل مصنف کے سامنے رہا ہے ورنہ وہ وثوق کے ساتھ نظم میں اشعار کی تعداد، اس کے نفس مضمون اور نظم کی تخلیق کا دن تحریر کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ میر عبداللہ کے بیان میں صفائی کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ کلام کو جمع کرتے وقت مختلف مسودوں اور نسخوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ کے کلام کی تحریری صورت میں موجود ہونے کی تصدیق بابا داؤد مشکواتی کی تصنیف "اسرار الابرار" سے بھی ہوتی ہے بابا داؤد بابا نصیب الدین غازی کے مرید خاص تھے اس لئے اُن کی کتاب کو کم و بیش ہمعصر تاریخ کا رتبہ حاصل ہے۔

چرار شریف کے ریشی ناموں میں مقامات اور واقعات کی مناسبت سے کلام شیخ کی ترتیب نظر آتی ہے۔ اس کی بنا پر بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ریشی نامے لکھتے وقت مصنفین کے سامنے کلام کا کوئی نہ کوئی نسخہ ضرور رہا ہے کیونکہ ہمارے سامنے اس قسم کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ سیاحت کے دوران چرار شریف کا کوئی شخص حضرت شیخ کے ساتھ رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی چرار شریف میں کلام شیخ کی زبانی روایت کا ہونا اس لئے بھی ناممکن تھا کیونکہ حضرت علمدار نے دوران حیات اس جگہ کو کبھی بھی مستقل قیام گاہ نہیں بنایا۔ درِ یہ تمام ، ہوچی پورہ ، اور رزیہ دن میں انہوں نے کل ملا کر زندگی کے چھبیس تیمتی سال گزارے مگر ان مقامات پر ان کے کلام کے بارے میں کوئی زوردار زبانی روایت کا ہونا پایا نہیں جاتا۔ ان سب واقعات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ چرار شریف کے ریشی نامے لکھے جانے سے پہلے بھی حضرت شیخ کا کلام تحریری صورت میں موجود تھا۔ اغلب ہے کہ ابتدائی دور کے نسخے شاردا خط میں لکھے گئے ہوں۔ بعد میں جب شاردا خط کو قبول عام

حاصل نہیں رہا تو زمانے کے اتار چڑھاؤ سے یہ نسخے یا تو مکمل طور پر ناپید ہو گئے یا کسی نہہ خانے میں خاک کی نذر ہو گئے۔ اب بھی کسی نسخے کی دستیابی کو میری نظر میں خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا۔

حضرتِ شیخؒ کے کلام کی قدامت

شتی کنٹھ کو اگرچہ کشمیری کا پہلا شاعر کہا جاتا ہے مگر اس کی زبان عوام کی زبان نہیں۔ علمی تقاضوں کے پیشِ نظر فاضل مصنف کو مہانئے پرکاش میں شودر ہتہ سے متعلق تراکیبات اور مرکبات کو مجبوراً استعمال کرنا پڑا ہے۔ ان حقائق کے پیشِ نظر لل دید اور حضرت شیخؒ کشمیری ادب کے اولین معمار ہیں۔

"ملند پنہا" اور "بہرت کتھا" کے بارے میں کچھ لوگوں نے اس بات کا دعوےٰ کیا ہے کہ یہ کتابیں کشمیری میں لکھی گئی تھیں مگر اس بیان کی صداقت کو ثابت کرنا ابھی باقی ہے "ملند پنہا" کے بارے میں اب یہ بات دریافت ہو گئی ہے کہ یہ کتاب پشتو میں لکھی گئی تھی جس کا ذکر کتاب کے سنہالی ترجمے میں کیا گیا ہے۔ اس وقت اس کتاب کا واحد روپ "سنہالی" میں دستیاب ہے۔ "بہرت کتھا" کے بارے میں اگر کسی جگہ اس بات کا حوالہ ملتا ہے کہ یہ کتاب "پشاچی" میں لکھی گئی تھی تو اس کا مطلب یہ نکالا نہیں جا سکتا کہ کتاب "کشمیری" میں لکھی گئی تھی کیونکہ "پشاچی" ایک واحد زبان نہیں بلکہ زبانوں کا ایک پورا گروہ ہے۔ جیسے ہم "دردی زبانوں" کا گروہ کہتے ہیں۔

"لل دید" کی زبان کو معیار مان کر اگر ان کے کلام کا تقابل حضرت شیخؒ کے کلام کے ساتھ کیا جائے تو ان کے کلام کا ایک کافی حصہ ایسا ہے جسے اصل کے قریب کلام کہا جا سکتا ہے البتہ جس طرح لل دید کے کلام میں بعد کے زمانے میں آمیزش ہوئی ہے اسی طرح علمدارؒ کا کلام بھی اس آمیزش سے پاک نہیں رہا ہے۔ جہاں تک حضرت شیخؒ کی نظموں یا مسلسل

گیتوں کا تعلق ہے۔ ان میں ہندش کی تہ۔ پیچیدگیوں کے پیش نظر قدرے کم آمیزش ہوسکی ہے اور جہاں کہیں آمیزش ہوئی ہے وہ کسی حد تک نمایاں ہے۔ شلوکوں میں آمیزش کا حصہ خاصا بڑا ہے۔ کچھ شلوک ایسے ہیں کہ جن کے بارے میں عام سمجھ بوجھ رکھنے والا انسان بھی کہہ سکتا ہے کہ یہ چیزیں چودھویں صدی کی تخلیق نہیں ہے ؎

باطن صاف تہ ظاہر رشنے ۔۔۔ بہشتس بدل چھی دوہ نار

یا

گنڈ پانس مود رندے ۔۔۔ امہ صابنہ صافی نہ اننے

اس قبیل کے اشعار کو حضرت شیخؒ کے اشعار تسلیم کرنے میں تامل کی بڑی وجہ یہ ہے کہ سلطان شہاب الدین کے دور تک سنسکرت یہاں کی درباری زبان تھی۔ فارسی کی حیثیت ایک نووارد زبان کی سی تھی، جس نے ابھی تک اپنے پاؤں جمائے نہیں تھے۔ خواص میں یہ زبان زور مروج رہی ہوگی مگر عوام میں اس زبان کے الفاظ کو قبول عام حاصل ہونا قرین قیاس نظر نہیں آتا اگر حضرت شیخ کا شاہی دربار کے ساتھ کوئی رابطہ رہا ہوتا اس صورت میں اگر حضرت شیخ کی شاعری پر فارسی کا اثر ہوتا تو کوئی مضائقہ نہیں تھا مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ حضرت شیخ کا شاہی دربار کے ساتھ دور کا بھی تعلق نہیں رہا ہے۔ وہ تو عوام کے ہیرو تھے اور عمر بھر عوام کے ساتھ رہے اس لئے ان کی شاعری میں دور از کار فارسی الفاظ اور ترکیبات کا پایا جانا ناممکن العمل ہے۔ ہاں کچھ ایسی اصطلاحات جن کا تعلق دین اسلام کے ساتھ ہے کے استعمال کو بعید از قیاس قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ ایسی اصطلاحات اور الفاظ کا تعلق لوگوں کی روزمرہ کی زندگی کے ساتھ رہا ہوگا۔ ایسے الفاظ میں محمدؐ، نکیر، منکر، قرآن، نماز وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ الفاظ فارسی کی وساطت سے آئے ہوں گے۔

حضرت شیخؒ کا مشن تبلیغ کا مشن تھا اور اس مشن کی کامیابی کا دارومدار اس بات پر تھا کہ وہ عوام کی روزمرہ کی زبان میں ان سے مخاطب ہوں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان

پیغام سے مستفید ہوں۔ اس لئے لازم ہے کہ اُن کی شاعری کی زبان اُس وقت کی عوامی زبان رہی ہوگی جس پر سنسکرت کی گہری چھاپ تھی کیونکہ بابا نصیب الدین غازی نے لکھا ہے کہ حضرت شیخؒ کے زمانے میں بھی یہاں کے باشندوں کی اکثریت ہندو تھی۔

یہاں پر ایک سوال اُبھر کر ہمارے سامنے آتا ہے کہ حضرت شیخ کی شاعری اُن کے قریبی ہم عصر اوتار بٹ کی شاعری کے ساتھ کیوں لگا نہیں کھاتی۔ اس سوال کے دو پہلو ہیں، جہاں تک علمدارؒ کی سنسکرتی نظموں کا تعلق ہے وہ نظمیں اپنے دور کی شاعری کے شانہ بشانہ چلتی ہیں اور زبان و بیان کے وقتی تقاضوں کو پورا کرتی ہیں۔ مگر بنیادی طور پر حضرت شیخ کا مقصد شاعری کے پردے میں اپنے علم کا مظاہرہ کرنا نہیں بلکہ اپنے پیغام کو لوگوں تک پہنچانا تھا چنانچہ بھگوان بدھ سے لیکر بھگت کبیر تک تمام بڑے بڑے مذہبی رہنماؤں نے عوامی زبان کو ہی اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس بات کے مقابلے میں اُن کے دوسرے ہمعصر شعرا عموماً عالم اور فاضل تھے اُن کی شاعری عمل کی نہیں بلکہ علم کی شاعری تھی حضرت شیخ کی احساس اور جذبے کی شاعری ہے جب کہ اوتار بٹ کی شاعری میں النکار کی شعبدہ بازیاں اور شاعرانہ صناعی کی بھرمار ہے۔

جذبے کی سچائی اور احساس کی گرمی شاعری کی جان ہے یہ دونوں چیزیں للہ وید اور حضرت شیخ کی شاعری کے اکثر حصے میں نظر آتی ہے جب کہ اوتار بھٹ کی شاعری میں شاعرانہ صداقت کے مقابلے میں لفظوں کا اُلٹ پھیر زیادہ نمایاں ہے ؎

اُزِ مِین آے نہ گژھن گژھے
پکُن گژھے دِین کیاہ راتھ
یورے آے توری گژھُن گژھے
کینہہ نہ کینہہ نہ کینہہ نہ کیاہ (للہ دید)

ترجمہ: آنے اور جانے کا چکر ازل سے ہی جاری و ساری ہے
یہ سفر رات و دن جاری رکھا جاتا ہے

جہاں سے ہم نے سفر کی ابتدا کی وہی ہماری آخری منزل بھی ہے
اگر یہ سب کچھ نفی کی سرحدوں میں مقید ہے مگر کہیں نہ کہیں اثبات کا ہاتھ کارفرما ہے

ژٕے دِیہِ دِرتھس تہٕ گرتھس پزکھ
ژٕے دِیہِ کرژنزن ہندُے چھانپھ
ژٕے دِیہِ ٹھینٹھہِ روستُے وُزکھ[1]
کیا چھُے پوژُ نہٕ کیا چھُے پاپھ (شیخ العالمؒ)

ترجمہ: آکاش اور دھرتی کی حکمرانی تمہارا حصہ ہے - میرے اللہ
ہمارے روپ اور رنگ میں تمہارے ہی خدوخال نمایاں ہیں
آواز کے بنا ہی تمہارا غلغلہ چاروں اور رہے -
گناہ اور ثواب کی سرحدیں کہاں سے شروع ہوتی ہیں اس کا فیصلہ کیا جانا باقی ہے -

پیامہٕ گژھہ مارنے شُمتہٕ یِنے مارنے
(اوتار بھٹ)

ترجمہ: (ا) میرے محبوب تو لڑائی میں شریک ہونے کے لئے نہ جا
وہ لوگ سبھی مل کر تم پر لوٹ پڑیں گے
(ب) میرے محبوب نہ جا کہ وہ تمہیں مار ڈالیں گے
وہ ایک ہو کر تمہیں قتل کرلیں گے -

کسی قدیم مستند اور معتبر نسخے کی غیر موجودگی میں حضرت شیخؒ کی شاعری پر کاتبوں اور نقل نویسوں کے ذریعے کیئے گئے تصرفات کی نشاندہی کرنا ناممکن ہے - ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسا نسخہ ہاتھ آجائے جس کی بدولت ہم اصلیت تک رسائی حاصل کر سکیں مگر موجودہ حالات میں آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے ضبطِ تحریر میں لائے گئے ریشی ناموں پر تکیہ کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں - حضرت شیخ کے بہت سارے شلوکوں کی داخلی شہادت ان کو مستند تسلیم کرنے کیلئے

---

[1] کشمیر شومت میں اس بات کو "آزناہت" کا نام دیا گیا ہے -

کافی ہے۔ میری نظر میں ہم ایسے شلوکوں کو مستند تسلیم نہ کرنے میں حق بجانب نہیں جن کی داخلی شہادت اُن کی قدامت کی طرف اشارہ کرتی ہے، جب ہم صرف باسکر رازدان کی شہادت پر "لل دید" کے ساتھ واکھیوں کو اُس کا معتبر کلام تسلیم کرنے میں کوئی حجت محسوس نہیں کرتے۔ حالانکہ باسکر رازدان نے اپنے سے پہلے کی کسی بھی تحریری روایت کا ذکر تک نہیں کیا ہے مگر حضرت شیخ کے شلوکوں کے بارے میں تحریری روایت کے بیّن حوالے موجود ہیں۔

حضرت شیخ کے کلام میں مقتدر اشخاص کا ذکر۔

کشیری شاعری کی زینت لل واکھیوں کی تخلیق کار "لل دید" کا ذکر اُس کے ہمعصر مورخ زونراج نے اپنی کتاب زینہ راج ترنگنی میں نہیں کیا ہے۔ جہاں تک کتابوں میں حوالوں کا تعلق ہے۔ لل دید کا ذکر سب سے پہلے بابا نصیب الدین غازی کے ریشی نامے اور اُس کے بعد بابا داؤد مشکواتی کی کتاب اسرار الابرار میں ملتا ہے۔ مگر لل دید کے وجود کی ہم عصر شہادت ہمیں حضرتِ شیخؒ کی ایک نظم میں ملتی ہے۔ جس کا پہلا بند اس طرح ہے ؎

تَس پدمان پورچہ للے   تمہِ گلے امرِتھ چیوو
تمہِ شِو وُچھ تھلے تھلے   تیتھۍ مے وَر دِتو دیوو

ترجمہ: پدمان پور (پانپور) کی وہ لل دید، جس نے جی بھر کر امرت پی لیا۔ اُس نے ہر طرف شو ہی شو کو جلوہ افروز دیکھا۔ میرے اللہ مجھے بھی اُس جیسا رتبہ عطا کر)

اس بند سے نہ صرف لل دید کے وجود کی تصدیق ہوتی ہے بلکہ اُس کی روحانی عظمت کا بھی سُراغ ملتا ہے۔ یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ لل دید پانپور کی رہنے والی تھی جو اس زمانے میں اپنے اصلی نام پدم پور کے بدلے پدمان پور کے نام سے ہوتا تھا۔ حضرتِ شیخؒ جیسا کامل ولی لل دید کے روحانی مرتبے کی تمنا کرتا ہے

بعد کے مورخین نے لل دید کا ذکر اپنی کتابوں میں کافی تفصیل کے ساتھ کیا ہے مگر لکہ کھون کی گونگی، کا ذکر حضرتِ شیخؒ کے کلام کے سوا اور کہیں نظر نہیں آتا جس کے بارے میں روایت ہے کہ وہ پنکھیوں کے ساتھ اُڑ گئی اور آکاش میں کہیں بسیرا کیا۔ اسی طرح ایک اور روایت ہے کہ ایک چرواہا ہرمکھ (پہاڑ) کے آس پاس کہیں اپنے ریوڑ کو چرا رہا تھا کہ اُسے شوجی کے درشن ہوئے اور درشن ہونے کے ساتھ ہی وہ بھی کہیں اُڑ گیا۔ اسی طرح "سید وانی" "جسہ وانی"، "سید سری کنٹھ" وغیرہ کا ذکر بھی حضرتِ شیخؒ نے اُسی نظم میں کیا ہے جس نظم میں سرِ فہرست لل دید کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سبھی لوگ حضرتِ شیخؒ اور لوک روایت کے مطابق پہنچے ہوئے لوگ تھے۔ مگر ان لوگوں کا ذکر تواریخی کتابوں میں نفی کے برابر ہے۔ ان میں سے اکثر لوگ ایسے ہیں جو علمدار سے پہلے ہو گذرے ہیں۔ اِشہ بَر کے سادھو کا ذکر حضرتِ شیخؒ نے بڑی عزت کے ساتھ کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

تُوٗ ٹھکھ اِشہٕ بَر گوسائنس
تمیٚ زانیٚتھ کرٕنۍ سیو
تُوٗ ٹھک رٕکھزائس جسو وائنس
تیٚتھٕے منٛے ؤر دِتو دیو

ترجمہ:۔ اِشہ بر کے گوسائیں کو تم نے اپنے لطف و کرم سے مالا مال کر دیا۔ کیونکہ اُس کو تمہاری عبادت کرنے کا گُر آیا۔ تو نے اپنے کرم سے جسا وانی جیسے کمینے کو بھی نوازا۔ میرے مولا مجھے بھی اُن کا جیسا مرتبہ عطا کر۔)

مگر ریشی ناموں میں آیا ہے کہ اِشہ بر کے گوسائیں کو "یادَن مُنزی" نے روحانیت کی بلندیوں سے نیچے دھکیل دیا۔ جو حضرتِ شیخؒ کے ارشاد کے مطابق صحیح نہیں ہے۔ ریشیت کا سلسلہ ہمارے یہاں بہت دیر سے چلا آرہا ہے۔ مگر نیل مت پوران

کے سوا ایسی کوئی پرانی کتاب دستیاب نہیں جس میں کشمیر کے قدیم رشیوں کا ذکر موجود ہو۔ حضرت شیخؒ کا کلام نیل مت پوران کے بعد دوسری اہم دستاویز ہے۔ جس کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ ریشیت کا چراغ ہمارے یہاں کبھی گُل نہیں ہوا البتہ اس کی روشنی زمانے کے بدلنے پر دھیمی ضرور پڑ گئی۔ اپنی ایک نظم میں علمدار نے چند ایسے رشیوں کا ذکر کیا ہے جو اُن سے پہلے ہو گذرے ہیں ؎

حضرت رُمہ ریشَن — تمؕ سہ رگس اَرزِن جاے
تِتھہِن ہِوپِن ریشَن — کَر یَنڈَن توشہِ خوہ داے
ڈُنڈک وُنک زلگ ریشی — تمیٔ گژھس مُوتگن ماے
تِتھہِن ہِوپِن ریشَن — کَر بَنڈن توشہِ خوہ داے
پلاس ریشی رُوسُو — تمیٔ پھِر ستس لیوٗنِ ڈاے
تَس شب روز مُوڈھ نسُو — کَر بَنڈن توشہِ خوہ داے

(ترجمہ) حضرت رومِ ریشی نے اپنے لئے جنت میں جگہ بنالی۔ ایسے رشیوں کی خدمت کرنے سے اللہ تم پر مہربان ہوگا ——— ڈُنڈک ون کے زلک ریشی نے خودرو جھاڑیوں کا شیرہ نکال کر گذر بسر کی۔ ایسے رشیوں کی خدمت کرنے سے اللہ تم پر مہربان ہوگا ——— پلاس ریشی بھی کیا ریشی تھا وہ پیٹ کی آگ بُجھانے کے لئے سفیدے کو چاٹا کرتا تھا اور رات و دن اللہ کو یاد کرتا تھا ایسے رشیوں کی خدمت کرنے سے اللہ تم پر مہربان ہوگا۔

حضرت شیخ کے عہد میں ریشیت کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ ریشی صرف نام کے ریشی رہ گئے تھے۔ وہ رنگے سیار تھے جو اپنی مطلب برآری کے لئے ریشیت کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھے۔ چنانچہ حضرت شیخ نے ان لوگوں کا ذکر واضح الفاظ میں کیا ہے ؎

أزکی ریشی کیٖلک ریٖشی
یمَن ماز کھینَس کمَ
کھاسی زِ تھَوَن نِشم نِشی
أکِس گوگُل بٔیس کرَم
تہِ کھیتھ ییٚلہِ خوداے مشی
ریٚشے توٚہی تہِ زوٗر کمَ

ترجمہ۔ آج کے ریشی بھروپی ہیں جن کا پیٹ گوشت کھاکر بھی نہیں بھرتا۔ یہ لوگ شلغم اور ساگ کے دو طبق کے ساتھ ساتھ کھانے کے لئے رکھ دیں گے۔ یہ سب کچھ کھاکر بھی اگر ان کا پیٹ نہیں بھرتا پھر اگر تم لوگ ریشی ہو تو کن لوگوں کو چور کا نام دیا جاسکتا ہے۔

ریشیت کا یہی بکھراو دیکھ کر شاید حضرت شیخ کو ریشی سلسلے کو از سرِ نو مجتمع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے تازہ تواریخی حقیقتوں اور ضروریات کے پیشِ نظر اس سلسلے کو ترتیب دیا جو کافی دیر تک ایک زور دار اور با اثر تحریک کی صورت میں کشمیر پر چھایا رہا۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنی سیاحت کے دوران بابا نصر الدین کو اننت ناگ میں ایک جگہ کچھ دیر رُکنے کے بعد کہا کہ اب سے دو سو سال بعد اسی جگہ ریشی مولو نام کا ایک شخص قیام کرے گا اور اُس کے ساتھ ہی ریشی سلسلہ دم توڑ دے گا۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ گذشتہ تین چار سو برسوں کے دوران ریشیت بحیثیت ایک تحریک کے ختم ہو چکی ہے اور اب ریشی سلسلہ محض ریشی ذات تک محدود ہو کے رہ گیا ہے۔

روحِ عصر حضرتِ شیخ کی شاعری کا اکثر و بیشتر حصہ اگرچہ

اُن کے روحانی تجربات کا آئینہ ہے مگر اس کے باوجود اُن کی گیت نما نظموں میں روحِ عصر کا جلوہ نظر آتا ہے۔ ان نظموں کو پڑھ کر اُس زمانے کے واقعات کو ذہن نشین کرنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ اُن کے کچھ شلوکوں میں بھی حضرت شیخؒ کے زمانے کے واقعات کی عکاسی نظر آتی ہے ؎

کینٹرن بر تل ساز ندِ دایان — ووچھ لاگیتھ نیندرے ہٹوتو
کینٹرن رزِ تہ لورے لابان — پانہٕ آشن کس کیا دیتو
کینٹرن ہتہٕ بدک دانکہ کُچھن — ان کُچھن زگ کیا چھوتو
کینٹرن وے نتہٕ موصّم بچھن — پانہٕ آشن کس کیا دیتو
کینٹر پیتھے اسمنے دوان — کموان نتہٕ زانان دزرونو
کینٹر توتھہ بُتر اژ دوان — پانہٕ آشن کس کیا دیتو
کینٹر ٹُرتے پارے لدان — چھی درمس دوان سُمبہ سوتھو
کینٹر کُہتھ خاراتھ نوان — پانہٕ آشن کس کیا دیتو

(ترجمہ) کچھ لوگوں کی ڈیوڑھیوں میں رقص و سرود کی محفلیں آراستہ ہیں۔ جو لوگ ان محفلوں کی اصلیت سے آگاہ ہیں وہ اپنے آپ کو نیند کے ماتے ظاہر کرتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن پر چھڑیوں اور کوڑوں کی بارش ہو رہی ہے۔ اس سارے معاملے میں بھلا اللہ کا کیا دوش ہے —— کچھ لوگوں کے کوٹھار اناج کی مختلف قسموں سے بھرے پڑے ہیں۔ سینکڑوں خروار شالی اُن میں گدام کی ہوئی ہے۔ کچھ نادار لوگ کے بلکتے بچے اپنی ماں کی چھاتی کاٹ رہے ہیں۔ اس ساری کارستانی میں بھلا اللہ کا کیا ہے ہاتھ ہے —— کچھ لوگ زمین کو اپنے ہاتھوں سے آباد کرتے ہیں۔ مگر کچھ ایسے بھی ہیں جو خود کچھ کرتے تو نہیں مگر دوسروں کی کمائی پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ ایسے بھی لوگ ہیں جو بیج کو بُن کر زمین کے سُپرد کرتے

ہیں اور اُن ہاتھ رہ جاتے ہیں۔ اس ساری کارستانی میں بھلا اللہ کا کیا قصور ہے۔ ایسے بھی لوگ ہیں جو مکان اور جھونپڑے تعمیر کرکے لوگوں کی آسائش کا سامان کرکے نیکی کے کام کرنے میں مصروف ہیں مگر ایسے بھی لوگ ہیں جن کا شیوہ لوٹنا اور قتل کرنا ہے۔ اس کارستانی میں بھلا اللہ کا کیا ہاتھ ہے۔

حضرتِ شیخ کے زمانے میں سماجی اونچ نیچ کی بھرپور عکاسی "پانہ آشن کس کیا دِتُو" نظم کرتی ہے۔ یہ نظم میرے خیال میں "شہر آشوب" کے زمرے میں آتی ہے۔ کیونکہ سماجی شکست و ریخت کا جو منظر اس نظم میں نظر آتا ہے اُس کا کوئی ذکر ہمیں عصری تاریخ میں نہیں ملتا۔ لوگوں کی بدحالی اور اُن پر ڈھائے جانے والے مظالم کا جو منظر حضرتِ شیخ نے پیش کیا ہے۔ اُس کے پیشِ نظر یہی کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے روحِ عصر کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا تھا۔ اس شاعری میں وہ کسک اور چبھن موجود ہے۔ جو کسک اور چبھن ایک حساس شاعر کے دِل میں عوام کی بدحالی کو دیکھ کر ہونی چاہیئے۔ یہ شاعری پڑھ کر دِل میں ایک ہوک سی اُٹھتی ہے اور ہمارا ذہن اُس دور کی طرف چلا جاتا ہے جس دور میں یہ عظیم کشمیری ہماری دھرتی پر موجود تھا۔

لڑکی آجکل کے زمانے میں ماں باپ کیلئے ایک وبالِ جان ہے مگر حضرتِ شیخ کے زمانے میں بھی آجکل کے مقابلے میں حالت کچھ بہتر نہیں تھی۔

اَکِس دُیتُن پوتھر دِنو   بیاکھ دِیان کوٗر گنٛدِ زاییے
ترٛیٖیِم تھوٗدُن چھوٗن نہٕ چھوٗ تو   پانہٕ آشن کس کیا دِتو

(ایک شخص صاحبِ اولاد اور صاحبِ ثروت ہے، دوسرا پریشان ہے کہ میرے ہاں لڑکی کیوں پیدا ہوئی، تیسرا بے سہارا اور خالی ہاتھ ہے۔ اللہ نے بھلا کس کو کیا دیا)۔

علمدار کی دوسری نظم "ییٔنہِ کُنجَن مُگہِ ژھو" میں کنڈی علاقوں کی زندگی کا عکس نہایت خوبی کے ساتھ الفاظ کے شیشے میں اُتارا ہے۔ نظم کی استائی (REFRAIN) اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ آج کی طرح ہی کنڈی علاقے اس دور میں بھی خوبصورت تھے مگر اس خوبصورتی کے پیچھے ناسور رِستے تھے۔

نٔیِن وٕنہِ تہٕ وُنِن ہی   یہٕ نُگرا چھوٚن بوٗڈُے گرٕ
کُنہِ ٹُکرِہِن چھوٚت مانچھی   ییٔنہِ کُنجن مُگہٕ ژُھو!

(چراگاہوں میں پودینہ اور جنگلوں میں لاجونتی ہے۔ یہ علاقہ ایک کنگال گھرانہ ہے۔ کہیں کہیں سفید شہد بھی ملتا ہے۔ کنڈی علاقے کی دھوم تو خالی خولی افسانہ ہے)

لوگوں کے رہن سہن کے علاوہ اس نظم میں کنڈی علاقے میں کاشت کی جانے والی فصلوں کا بھی حوالہ بھی ملتا ہے۔ اس کے علاوہ نظم میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ کنڈی علاقوں میں جو لوگ مہمان بن کر آتے ہیں اُن کا شیوہ لوگوں سے نذرانے وصول کرنا ہے۔ دوسرے علاقوں سے آنے والے یہ لوگ کبھی کبھی کنڈی میں رہنے والوں کو ناحق ستاتے اور تنگ کرتے ہیں۔

کنڈی علاقے کی زندگی کی جو تصویر یہ نظم پڑھنے کے بعد ہمارے سامنے اُبھرتی ہے اُس کے مطابق "کاٹ ژٕنی" نام کی کوئی چیز لوگ ٹوپی کے بدلے میں استعمال کرتے تھے اور اون کی پوشاک پہنی جاتی تھی۔ لوگوں کی غذا، پَنگہ، ترُہ نبہ، شول، اور مکئی کا دلیا تھا۔ کہیں کہیں السی کی کاشت بھی ہوتی تھی۔ شفتالو، انگور، آخروٹ اور وِرِق نام کے میوے کنڈی علاقے میں پائے جاتے تھے۔ فصلوں کے زمرے میں شالی اور گندم کا نام کہیں نظر نہیں آتا، اسی طرح سیب وغیرہ کا ذکر بھی نہیں ملتا۔

جس سماج میں حضرت شیخ پلے بڑھے اور جوان ہوئے وہ سماج تباہی کے

بھنور میں چکر کاٹ رہا تھا۔ کھوٹے اور کھرے میں تمیز کرنے کی قوت زائل ہو چکی تھی۔ نیک دل اور خدا ترس لوگوں کیلئے اُس سماج میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ چنانچہ اس کا اظہار انہوں نے اسطرح کیا ہے ؎

سوٗنَس تہٕ سَرتَلہٕ اَکُے ژلُن ا
تَوے زِد میوٗن کَلُن ہیوٗت ا
وُچھِم نُندہن لیٚتھ تہٕ ڈٕہٹھِن پھوٚلُن
تَوے مٕے اندون ژلُن ہیوٗت

(سونا اور پیتل ۔ دونوں کی چمک دمک ایک جیسی ہے۔
میری زبان گنگ ہوتی جارہی ہے۔ میں نے خُدا دوست لوگوں کے حق میں مصیبت اور ظالموں کے گھروں میں خوشی اور شادمانی کے چراغ روشن دیکھے۔ اسی لئے تو میں نے دُور دراز جنگلوں کی راہ لی)۔

یہ شلوک اُس سماج کی ایک دردبھری تصویر ہے جس سماج نے حضرت شیخ کو بستیاں چھوڑ کر جنگلوں کی راہ لینے پر مجبور کیا۔ جیسا کہ انہوں نے کہا ہے وہ دنیا سے بھاگنا نہیں چاہتے تھے مگر گردوپیش کے حالات نے اُن کو ایسا کرنے پر مجبور کیا۔ وہ کبھی ٹرسبتر کے پہاڑوں کے دامن میں گوشہ نشین ہو جاتے ہیں اور کبھی ہونزی پورہ کے گھنے جنگل۔ کبھی سنتھارآن میں بسیرا کر لیتے ہیں اور کبھی درؔیہ گام کے چناروں کے درمیان۔ سماجی بدعنوانیاں اور چیرہ دستیاں اُن کو ایک ڈیرے کو چھوڑ کر دوسرا ڈیرہ جمانے پر مجبور کرتی ہیں۔

حضرت شیخؒ کا کلام بِلا شُبہ معرفت اور عرفان کی سرحدوں کا اتا پتا دیتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس کا مطالعہ ہمیں اس دور کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی حالات کو سمجھنے میں بھی ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

حضرت شیخ کی زبان

لسانی نقطۂ نظر سے حضرتِ شیخؒ کے کلام کی اہمیت ایک مسلّمہ امر ہے۔ کیونکہ اُن کے بعد کافی دیر ہماری رسائی کسی ایسی چیز تک نہیں ہوسکی ہے جس کو سامنے رکھ کر زبان کے تدریجی ارتقاء کا مطالعہ کیا جاسکے۔ علمدارؒ کا کلام پڑھ کر چودھویں صدی میں مروج کشمیری زبان کا مزاج جاننے اور ذخیرہ الفاظ اور اصنافِ سخن کے بارے میں جانکاری حاصل کرنا سنجیدہ طالب علم کیلئے آسان بن جاتا ہے۔ اُن کا کلام اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ چودھویں صدی میں سنسکرت کے متعدد الفاظ اپنے کشمیری روپ میں ہمارے یہاں مستعمل تھے۔ کشمیری زبان کا کوئی بھی سروے اُس وقت تک مکمل نہیں سمجھا جاسکتا جب تک کہ حضرتِ شیخؒ کے کلام کا بہ نظرِ غایر مطالعہ نہ کیا گیا ہو۔ کیونکہ اُن کی شاعری میں ایسے الفاظ کی کافی بڑی تعداد موجود ہے جو اب مستعمل نہ ہونے کی وجہ سے تقریباً متروک ہوچکے ہیں مگر ان الفاظ کی لسانی اہمیت اور افادیت اس کے باوجود مسلّمہ ہے۔ یہ الفاظ کیوں اور کیسے روزمرہ سے خارج ہوگئے اُس کے پیچھے کچھ تواریخی، سماجی، تہذیبی اور سیاسی واقعات کارفرما ہیں۔

شاہمیری دور میں ہی کشمیر میں فارسی نے سنسکرت کے بدلے درباری یا سرکاری زبان کا رتبہ حاصل کرلیا۔ آہستہ آہستہ اس زبان نے یہاں کی سرزمین میں اپنی جڑیں پیوست کرلیں۔ چنانچہ ایک وقت کشمیر میں فارسی کو اتنا فروغ حاصل ہوا جس کی بناء پر اُسے ایرانِ صغیر کہا جانے لگا۔ ان حالات کا اثر تواریخی عمل کے تحت کشمیری نے بھی قبول کرلیا۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں کشمیری نے اُسی طرح فارسی الفاظ سے اپنا دامن بھر لیا جس طرح کسی زمانے میں اس نے سنسکرت کی خوشہ چینی کی تھی۔ حضرت شیخ کے کلام میں استعمال کئے گئے جو الفاظ اب لگ بھگ متروکات کے دائرے میں آگئے ہیں۔ اُن کی فہرست اس لحاظ سے کافی طویل ہے کہ یہ الفاظ

اگرچہ اب بھی دیہات میں کہیں کہیں مروّج ہیں مگر تحریروں میں ان کا استعمال عنقا ہو گیا ہے، ساتھ ہی یہ الفاظ شہر اور قصبوں میں مروج نہیں۔ لسانیات سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے یہاں پر چند ایک الفاظ کا درج کرنا میرے خیال میں مزید تحقیق اور تفتیش کیلئے راستہ ہموار کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

۱۔ آدر (عزت)۔ یہ لفظ اب بھی کشمیری پنڈت روزمرہ کے طور استعمال کرتے ہیں۔

۲۔ ارِین۔ (جنگل)۔ اس لفظ کا استعمال ہمیں اس محاورے میں ملتا ہے — "ارِین کالن" یعنی وہ وقت جب ہر طرف جنگل ہی جنگل تھے۔

۳۔ آر۔ (بیچارگی کی حالت)۔ یہ لفظ کشمیری میں عار سے لکھا جاتا ہے اور اسے فارسی سے ماخوذ تصور کیا گیا ہے، مگر اُرت (بیچارہ، غریب) اسی لفظ کی اصلی صورت ہے، یہ لفظ کشمیری پنڈت اب بھی استعمال کرتے ہیں اور اکثر بھگتی شاعروں نے اس لفظ کا استعمال کثرت کے ساتھ کیا ہے، مگر روزمرہ کی زبان میں اب اس کا استعمال نہیں ہوتا۔

۴۔ اُگنیا (اجازت، حکم):۔ اس لفظ کا استعمال صرف کشمیری پنڈتوں تک محدود ہے۔

۵۔ اُلگن: (جاگ اُٹھنا۔ بھڑک اُٹھنا) اب متروک ہے۔

۶۔ اگہ ہوت (جلدی میں):۔ قلیل الاستعمال ہے اور صرف بوڑھے کشمیری پنڈتوں تک محدود ہے۔

۷۔ امبر (پوشاک):۔ متروک ہے۔

۸۔ اہار (غذا۔ خوراک):۔ یہ لفظ کشمیری پنڈتوں میں بھی اب قلیل الاستعمال ہے۔

۹۔ اگن۔ (آگ):۔ صرف کشمیری پنڈت خاص موقعوں پر استعمال کرتے ہیں۔

١٠۔ اڈہر (حادثہ)۔ دیہات میں اب بھی مروّج ہے۔

١١۔ انتھ (آخر، انجام) اس لفظ کی موجودہ صورت اُنتھ ہے۔

١٢۔ اُند (باطن) :۔ متروک ہے۔

١٣۔ اُنگ (یہ دنیا) متروک ہے۔

١٤۔ آش (اللہ، خدا) قلیل الاستعمال ہے۔

١٥۔ اہنکار (غرور) اس لفظ کا استعمال صرف کشمیری پنڈتوں تک محدود ہے۔

١٦۔ بل (طاقت)۔ قلیل الاستعمال ہے۔

١٧۔ بگی (بھگوان۔ اللہ) متروک ہے۔

١٨۔ بتل (دھرتی، زمین)۔ متروک ہے۔ اس لفظ کی موجودہ صورت "بتراتھ" ہے۔

١٩۔ بوزن (بھوجن، غذا)۔ صرف ۔ بوڑھے کشمیری پنڈتوں تک محدود ہے۔

٢٠۔ بشن (خوفناک، خطرناک)۔ متروک ہے۔

٢١۔ بوَن (رہنے کی جگہ، دنیا)۔ کشمیری پنڈتوں تک محدود ہے۔

٢٢۔ بلہ ووث (طاقتور) :۔ متروک ہے۔

٢٣۔ بکر (چہرہ) :۔ قلیل الاستعمال ہے۔

٢٤۔ بوسبند (دُنیا) :۔ کشمیری پنڈتوں میں بھی قلیل الاستعمال ہے۔

٢٥۔ بوسر (دُنیا) :۔ قلیل الاستعمال ہے۔

٢٦۔ پوَن (ہوا، سانس) : قلیل الاستعمال ہے۔

٢٧۔ پونی (ثواب) :۔ یہ لفظ کشمیری پنڈتوں میں اب بھی مستعمل ہے۔

٢٨۔ پنھان (راستہ، سڑک) : متروک ہے۔

٢٩۔ پرکتھ (پرکرتی) : قلیل الاستعمال ہے۔

٣٠۔ پردوہ پکار (دوسرے کی خیر) صرف کشمیری پنڈتوں تک محدود ہے۔

۳۱- پڑنِن (نصیحت کرنا) : اب تمسخر اڑانے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

۳۲- پڑکھٹن (ظاہر ہونا) :- کشمیری پنڈتوں میں بھی بہت کم مروّج ہے۔

۳۳- نٕ رگ (گھوڑا) :- قلیل الاستعمال ہے۔

۳۴- پیٖنزر (پنجرہ۔ ڈھانچہ) :- تقریباً متروک ہے۔

۳۵- تابٕس (شگون) :- تقریباً متروک ہے۔

۳۶- دژاُلِد (مفلس۔ غریب) :- تقریباً متروک ہے۔

۳۷- دِہ ہیچھ (لڑکی) :- متروک ہے۔

۳۸- دِہُل (ضرر رساں) :- قلیل الاستعمال ہے۔

۳۹- دوٕرزَن (بدذات۔ کمینہ) :- متروک ہے۔

۴۰- درتھ (دھرتی) :- متروک ہے۔

۴۱- دٔیان (دھیان) :- قلیل الاستعمال ہے۔

۴۲- دمامہٕ (ڈھول) متروک ہے۔

۴۳- داٗرد (صاف۔ ملاوٹ کے بغیر) متروک ہے۔

۴۴- دِہہ بل (جسمانی قوت) : تقریباً متروک ہے۔

۴۵- دِہ، دِہہ دار (جسم) :- صرف کشمیری پنڈت استعمال کرتے ہیں۔

۴۶- رُن (جنگ۔ لڑائی) :- متروک ہے۔

۴۷- رَم (ریوڑ) :- صرف دیہات میں مستعمل ہے۔

۴۸- رنگ (ناٹک) :- ان معنوں میں اس لفظ کا استعمال متروک ہے۔

۴۹- رُد (سورج) :- قلیل الاستعمال ہے، لوگ شاعری میں کہیں کہیں ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

۵۰- زُورِ لگُن (پھانسی لگنا) :- تقریباً متروک ہے۔

۵۱۔ رہکاے (انبار۔ ڈھیر) :۔ تقریباً متروک ہے۔

۵۲۔ ژہنٹھ (چپت)۔

۵۳۔ ژِتلُن (محسوس کرنا)۔

۵۴۔ سبد (پہنچا ہوا)

۵۵۔ سنگ (ساتھ)۔

۵۶۔ سوباد (عادتہً)۔

یہ الفاظ کشمیری پنڈت روزمرہ میں استعمال کرتے ہیں۔

۵۷۔ ساس (سہاگہ) :۔ قلیل الاستعمال ہے۔

۵۸۔ سرٗین (گھاس پھوس)۔ دیہات میں مستعمل ہے۔

۵۹۔ سُت (لڑکا) :۔ متروک ہے۔

۶۰۔ سأسِل (سہاگہ وغیرہ) :۔ متروک ہے۔

۶۱۔ سہز (سہج) :۔ صرف کشمیری پنڈتوں تک محدود ہے۔

۶۲۔ سلہر۔ سلل (پانی) :۔ متروک ہے۔

۶۳۔ سکل (سب۔ سارے) :۔ ان معنوں میں اب متروک ہے۔

۶۴۔ سُنز ژہنٹھ (موجود۔ جمع کیا ہوا) :۔ صرف کشمیری پنڈتوں تک محدود ہے۔

۶۵۔ شوب (خیر۔ بھلا) :۔ صرف کشمیری پنڈتوں تک محدود ہے۔

۶۶۔ شُنُن۔ (سُننا) :۔ متروک ہے۔

۶۷۔ شرادھ (مرنے کے بعد سالانہ یادگار کا دِن) :۔ صرف کشمیری پنڈتوں میں مروج ہے۔

۶۸۔ شیر (سر) :۔ قلیل الاستعمال ہے۔

۶۹۔ ششر کل (ششی کلا) :۔ صوفی شعراء کے ہاں مستعمل ہے۔

۷۰۔ کرُود (غصّہ) :۔ صرف کشمیری پنڈتوں تک محدود ہے۔

۷۱۔ کام (شہوت) : ایضاً۔

۷۲۔ کول (قبیلہ۔ خاندان) :۔ صرف کشمیری پنڈتوں تک محدود ہے۔

۷۳۔ کرے (عمل) :۔ قلیل الاستعمال ہے۔

۷۴۔ کرول (آرایش) :۔ صرف کشمیری پنڈتوں تک محدود ہے۔

۷۵۔ کہ زن (بدذات) :۔ ״

۷۶۔ کیسر (شیر) : متروک ہے۔

۷۷۔ کیلک (رنگا سیار)۔ متروک ہے۔

۷۸۔ کیول (اکیلا۔ دوسرے کے بغیر) :۔ صرف کشمیری پنڈتوں میں مروّج ہے۔

۷۹۔ کھولن (چمکنا) :۔ متروک ہے۔

۸۰۔ کینتھ (کپڑا) :۔ متروک ہے۔

۸۱۔ کند (جسم) :۔ متروک ہے۔

۸۲۔ کند (کیونکر۔ کیسے) متروک ہے۔

۸۳۔ کرشی (کاشت) متروک ہے۔

۸۴۔ کٹہ رائے (قلعوں کے سردار) متروک ہے۔

۸۵۔ گیہہ (گھر)۔ متروک ہے۔

۸۶۔ گگن۔ (آسمان) قلیل الاستعمال ہے۔

۸۷۔ گار (زہر ہلاہل) قلیل الاستعمال ہے۔

۸۸۔ گرشن (پوچھنا)۔ دریافت کرنا) :متروک ہے۔

۸۹۔ گمبُر (گھمبیر) :۔ تقریباً متروک ہے۔

۹۰۔ گال (شرم۔ گالی) :۔ قلیل الاستعمال ہے۔

۹۱۔ گُپت (چُھپا ہوا) :۔ کشمیری پنڈتوں میں بھی قلیل الاستعمال ہے۔

۹۲۔ لز (لجا۔ شرم): کشمیری پنڈتوں میں مروج ہے۔

۹۳۔ گمبزم (باوقار) متروک ہے۔

۹۴۔ لیبزم (نرم۔ شریف): قلیل الاستعمال ہے۔

۹۵۔ لُب (لوبھ۔ طمع): صرف کشمیری پنڈتوں میں مروج ہے۔

۹۶۔ مَد (غرور) قلیل الاستعمال ہے۔

۹۷۔ میتھر (دوست): قلیل الاستعمال ہے۔

۹۸۔ مُہہ (موہ): کشمیری پنڈتوں میں مروج ہے۔

۹۹۔ مُرکھ (مورکھ۔ نادان): کشمیری پنڈتوں میں مروج ہے۔

۱۰۰۔ نِنگرُ (مفلس): قلیل الاستعمال ہے۔

۱۰۱۔ نکس (ہر کسی کو): متروک ہے۔

۱۰۲۔ نِہواُرن (معاف کرنا): کشمیری پنڈتوں میں بھی قلیل الاستعمال ہے۔

۱۰۳۔ وِنتھ (گزارش): "وِنتی" کی شکل میں کشمیری پنڈتوں میں مستعمل ہے۔

۱۰۴۔ وِشو (جگت۔ کائنات): متروک ہے۔

۱۰۵۔ ویلہ (موقعہ): قلیل الاستعمال ہے۔

۱۰۶۔ ووپکار (نیکی۔ بھلائی): کشمیری پنڈتوں میں ابھی بھی مروج ہے۔

۱۰۷۔ واشر (سہاگے کا ڈیر): متروک ہے۔

۱۰۸۔ وُد (ہوشیار)۔ قلیل الاستعمال ہے۔

۱۰۹۔ وِد (جاننے والا): "

۱۱۰۔ واوِدُر (پیٹ۔ معدہ): صرف کشمیری پنڈتوں میں مروج ہے۔

۱۱۱۔ دیپتھ (آفت۔ بلا): تقریباً متروک ہے۔

۱۱۲۔ وَٹھکی (باڑی)۔ متروک ہے۔

۱۱۳۔ ہۆنژ (حیلہ گر۔ بہانہ ساز) قلیل الاستعمال ہے۔

۱۱۴۔ ہاٹیک (ترازو)۔ متروک ہے۔

یہ اور اس قبیل کے دوسرے الفاظ اور ترکیبات ہی عام قاری کیلئے حضرت شیخ کا کلام سمجھنے میں سدِ راہ ہوتی ہیں۔

حضرت شیخ ؒ کا کلام ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ اُن کے کچھ اشعار گہرے تجربات کے آئینہ دار ہونے کی وجہ سے اب ضرب المثل بن چکے ہیں۔

۱۔ اَن پوشہ تیٛلہِ ییٛلہِ وَن پوشہِ
(جنگلوں کے وجود سے ہی زمین اناج پیدا کرتی رہے گی)

۲۔ بُختس بو دچھے خدمتگار
(عقل تقدیر کی باندی ہے)

۳۔ کاوِ کھییہِ گوٗج کان ستنس۔
(اگری کوے نے کھائی اور بیچارہ ہُدہُد تیر کا نشانہ بنا)۔

۴۔ دُنیا چھہ راتک سوٗپن۔
(دنیا تو رات کا سپنا ہے۔)

۵۔ اَزلس لیمنہٕ ژَلنس جاے۔
(تقدیر سے بھاگ نہیں سکا)

۶۔ ہیٛتس ہیتہٕ کار کرِ نے
(ہمدرد شخص ہمدردی کا مستحق ہے)۔

لسانی اعتبار سے حضرت شیخ کے کلام کا تجزیہ کرنا باقی ہے۔ اُن کے کلام میں کتنے ہی مرکبات اور کتنی ہی ترکیبیں ایسی ہیں جن کی بدولت ہماری زبان کا دامن کشادہ ہو سکتا ہے۔ کشمیری۔ کشمیری ڈکشنری کا تتمہ نکالتے وقت حضرت شیخ ؒ

کے کلام کو بنیاد بنانے کی زبردست ضرورت ہے۔ کیونکہ یہی وہ واحد ذریعہ ہے جس کی بدولت کشمیری زبان کے عام طالب علم کی رسائی اپنے کلاسیکی ادب تک ہو سکتی ہے۔

شاعری کی ہیئت حضرت شیخ کی شاعری کو عام طور پر شُرک کا نام دیا گیا ہے مگر یہ نام اس صداقت کے ایک ہی پہلو کا احاطہ کرتی ہے۔ ریشی ناموں میں ہمیں کچھ گیت (وژُن) نما قدرے طویل منظومات بھی ملتے ہیں جن کو "شُرک" کے زمرے میں رکھا نہیں جا سکتا۔ میری دانست میں یہ طویل منظومات باقاعدہ نظمیں ہیں۔ کیونکہ ان میں خیالات کی ہم آہنگی موجود ہے۔ ہاں استائی (REFRAIN) ہر نظم کا خاصہ ہے۔ ان منظومات کو کشمیری میں اولین نظمیں کہنے میں مجھے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ ریشی ناموں میں شمسکرتی نظموں کے سمیت اس قسم کی بیس سے زاید نظمیں موجود ہیں جن میں سے چند ایک کی استائیاں (REFRAIN) اس طرح ہیں :-

۱۔ تِیُتھُے مےٚ وَر دِیتَو دِۄ
(میرے اللہ مجھے بھی ایسا ہی رُتبہ عطا کر)

۲۔ پانہٕ آشَن کَس کیا دِیتوٗ
(اللہ کس کے گھر کیا لے کے آیا)

۳۔ بارِ خودایا پاپ نِوار
(میرے اللہ میرے گناہ بخش دے)

۴۔ ہوٗن پِچھے دَپان وَو باوَو
دسگتے کا سندیشہ ہے کہ بولے جو بولنا ہے)۔

۶۔ چھُھم ژیِنٛس میٚہر بانہٕ

(میرے کرم فرمایں تمہیں بھول نہیں سکتا)۔

۷۔ ییٚتہٕ کٕنجن تِگہٕ ژھو

(کنڈی علاقے تو بس دور سے ہی حسین نظر آتے ہیں)

۸۔ یُس کرِ گوٚنگُل سُے کرِ کراو

(جو بوئے گا سو کاٹے گا)

۹۔ کرٛوٚد نو مُسلمانس پٔزی۔

(مُسلمان کو غرور نہیں ہونا چاہئیے)

۱۰۔ چھُون آتہٕ گتھ لوٚگُے وٚتہٕ گتھ بامیانہٕ پانہٕ

(میری مسافر جان تمہارا یہ آنا اور جانا بے کار ہی ثابت ہوا)

۱۱۔ پیٚکھ پانُس یاوُن مٔژی۔

(یووُن کے مدھ میں شرابور نازنین تو بھی کسی دن سچائی کی تہہ تک پہنچ جائے گی)۔

جہاں تک شٔرُک کا تعلق ہے یہ سنسکرت فارم شلوک کا کشمیری روپ ہے۔ شلوک کی جگہ "شرُک" لفظ کب سے مستعمل ہے اس بارے میں یقین کے ساتھ کسی رائے کا اظہار کرنا ممکن نہیں۔ البتہ ریشی ناموں کے مطالعے کے دوران میں اس بات سے آشنا ہو گیا کہ کئی جگہوں پر مجھے 'شرُک' کی جگہ شوک یا شک لِکھا ہوا نظر آیا۔ حالانکہ 'کلیاتِ شیخ العالم' کو ترتیب دیتے وقت میں نے 'شرُک' لفظ کا ہی استعمال کیا ہے کیونکہ حضرتِ شیخؒ کے کلام کے لئے اب یہی لفظ زبان زد ہے مگر میرا اندازہ ہے کہ حضرتِ شیخ کے کلام کے لئے 'شرُک' کا لفظ بعد کی اختراع ہے جبکہ انہوں نے خود شک یا شوک لفظ کا استعمال کیا ہے ۵

ا۔ کُن ٹھُو ٹھوکین رُشکیں تہٕ بنیہ ہنج سوٗرَن

ب۔ کُن ٹھو ٹھوکین رُشکین حضرتِ قرآنس

"شلوک" کی جگہ 'شوک' کا استعمال صرف شاعری میں ہی نہیں ہوا ہے۔ بلکہ ریشی ناموں کی فارسی عبارت میں بھی حضرتِ شیخ کی شاعری کے لئے یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

لل دید کے واکھیہ اور حضرتِ شیخؒ کے شُرُک میں حدِ فاصل قایم کرنا ایک امرِ محال ہے کیونکہ اکثر و بیشتر صورتوں میں ان دونوں کی ترتیب اور بندش ایک جیسی ہے۔ فرق صرف نام کا ہے۔ واکھیہ اور شُرک میری نظر میں ایک ہی صنف کے دو الگ الگ نام ہیں اور یہ صنفِ سخن بھی ایسی ہے جس کے خدوخال اور قواعد و ضوابط اب تک معین نہیں کئے جا سکے ہیں۔ جس طرح لل دید کے واکھیہ کبھی کبھی چار سطروں سے تجاوز کر جاتے ہیں اسی طرح حضرتِ شیخ کے شُرک بھی کسی بندش کے مطیع نہیں۔ اُن کے بعض شُرک، چھ، آٹھ، دس، بارہ، چودہ، اٹھارہ اور بائیس سطروں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ہاں ایک بات ہے کہ ہر شُرک میں سطروں کی تعداد جفت ہے۔

سنسکرت میں شلوک کی جو تعریف کی گئی ہے، حضرتِ شیخ کے شلوک قطعیت کے ساتھ اس کے دائرے میں نہیں آتے۔ شلوک میں چار پد ہوتے ہیں اور ہر پد میں آٹھ ارکان کا ہونا لازمی ہے اور ایک پورا شلوک بتیس ارکان پر مشتمل ہوتا ہے۔ شلوک کی ایک خاص بحر مقرر ہے جسے انشٹبھ کہتے ہیں۔ حضرتِ شیخ کی شاعری میں اکثر و بیشتر اس پابندی کا لحاظ رکھا نہیں گیا ہے۔ سنسکرت شلوک کے ساتھ شُرک کا تعلق صرف اس کے نام کے ناطے قایم ہے۔

شُرکوں کے مطالعے سے اُن کی جو مختلف صورتیں نظر آتی ہیں اُن کی بندش

کچھ اس طرح ہے:۔

(۱)

.... ا

.... ب

.... ا

.... ب

(۲)

.... ا

.... ب

.... ج

.... ب

(۳)

.... ا

.... ا

.... ب

.... ب

حضرتِ شیخ رح کے بعد اگرچہ شرک کی کوئی باقاعدہ روایت جاری نہیں رہی پھر بھی یہی ہیت کبھی کبھی زین الدین ریشی مرزہ کاک وغیرہ کی بھی ہے۔

حضرتِ شیخ کی جائے پیدائش کا ذکر

اکثر و بیشتر موزخوں اور ریشی نامے تالیف کرنے والوں نے کیموہ کو حضرتِ شیخ کی جائے پیدائش قرار دیا ہے۔ مگر

حضرتِ شیخ کا یہ شلوک اُن سب لوگوں کے دعویٰ کی نفی کرنے کے لئے کافی ہے ؎

تَنتہٕ کھیمہِ ہُرک منٛے زَم دُیتو
نُنْدہٕ سَنْز بہٕ مُسلمان

(کھی کے گاؤں میں اللہ کے فضل سے میری پیدائش واقع ہوئی میں نندا سنز مُسلمان ہوں)۔

اس شلوک کی روشنی میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ حضرتِ شیخ کا جنم کیموہ میں نہیں بلکہ کھی جوگی پورہ میں ہوا تھا۔ شلوک کی زبان بھی زبانِ حال سے اپنی قدامت کا اظہار کرتی ہے۔ اتنا ہی نہیں، کھی جوگی پورہ کی مقامی روایت بھی اس بات کے حق میں ہے کہ اُن کا جنم کھی میں ہی ہوا تھا۔ وہ مشہور و معروف مقدس چشمہ اب تک کھی جوگی پورہ میں بہتا ہے۔ جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اسی چشمے کی گہرائی سے یاسمن کا وہ گلدستہ اُبھرا تھا جسے سونگھ کر سدرہ ماجی کا گربھ رہا اور اُس کے بطن سے حضرت شیخ کا جنم ہوا۔

قبولِ اسلام کشمیر کے مورخین اور ریشی نامے تالیف کرنے والوں نے اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ حضرتِ شیخ کے والد بزرگوار سلتہ سنز یا سلر سنز مشرف بہ اسلام ہوئے مگر اس بات پر اختلاف ہے کہ آیا وہ یاسمن ریشی کے ہاتھوں مسلمان ہو گئے تھے یا حضرت سید حسین سمنانی کے ہاتھوں حضرتِ شیخ کے کلام کی داخلی شہادت اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اُن کے والد حضرتِ سید حسین سمنانی کے ہاتھوں مسلمان ہو گئے تھے۔ فرماتے ہیں ؎

اَکھ سُتہ سلِتہ سَنْز پٔرمانو   تٔمہ دٕیہِ مُسلمان گت۔ پوٚز
تَس گورِ سید حسین سمنانو   یُس حیدر کوہ لگا مُتِن دیُن

(اُس کا باپ ایک بادشاہ لڑکا سلت سنز تھا جو اپنی بھلائی کیلئے مسلمان ہوگیا۔ اُس کا مرشد سید حسین سمنانی تھا جو حیدر کو لگامی کے وقت میں وہاں سکونت کرتا تھا)

حضرتِ شیخ کی شاعری صرف تبلیغ تک محدود نہیں بلکہ یہ شاعری زندگی کی وسعتوں کا بھی احاطہ کرتی ہے۔ اس میں داخلی تجربات کی سچائیوں کے ساتھ ساتھ زمانے کی چیرہ دستیوں کے خلاف زبردست ناراضگی کا اظہار ہے۔ راہی صاحب کی اس رائے کے ساتھ مجھے پورا پورا اتفاق ہے کہ حضرتِ شیخ ؒ کے کچھ اشعار دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح ہیں جن کی گرمی قاری محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

شاعری میں طنز کے زہریلے تیر چلانے کا جو ملکہ حضرتِ شیخ کو حاصل ہے اُس کا جواب اب تک کی کشمیری شاعری میں کہیں اور نظر نہیں آتا۔ اسی طرح جہاں کہیں بھی انہوں نے اپنے تصورِ مرگ کو زبان عطا کی ہے، وہ اظہار اس قدر زوردار اور پُراثر ہے کہ پڑھنے والا سکتے میں آجاتا ہے اور اُسے محسوس ہوتا ہے کہ موت آکر اُسے دبوچ لے گی۔ اسی طرح تصورِ حق کو حضرتِ شیخؒ نے کئی ایک مقامات پر استعدِ فنکاری کے ساتھ بیان کیا ہے کہ قاری کو اپنے اردگرد ایک پُرعظمت اور پُرجلال روح محوِ رقص نظر آتی ہے۔ یہ وہ رقص ہے جسے محسوس کیا جا سکتا ہے، مگر بیان نہیں کیا جا سکتا۔

حضرتِ شیخ کی شاعری زندگی کی تہہ داری اور روحانی تجربات کا ایک ایسا گلدستہ ہے جس کے عطر سے ہم لوگوں کے ذہن صدیوں تک مہکتا رہیگا۔

للّہ دید کے بعد حضرتِ شیخؒ کشمیری کے وہ واحد شاعر ہیں جن کے کلام کا ترجمہ انگریزی، ہندی، پنجابی، اُردو اور ڈوگری میں ہو چکا ہے اور کتابی صورت میں منظرِ عام پر آچکا ہے۔

حلقۂ یاراں

محمد اسد اللہ وانی

فصل اوّل

حضرت شیخ العالمؒ کے خلفاء

سرخیلِ طائفہ ریشیانِ کشمیر حضرت شیخ العالمؒ، شمس العارفین، علمدارِ کشمیر، شیخ نورالدین نورانی المعروف نُند ریشی کشمیر کی وادیٔ سرو سمن کی ایک ایسی دل نواز اور دل آویز شخصیت ہیں۔ جو حقیقی معنوں میں سلسلۂ ریشیت کے بانی، کامل صوفی منش شاعر، مجسمۂ خلوص و مروّت اور پیکرِ تحمل و انکسار تھے۔ ان کی شخصیت تصوّف اور روحانیت کا ایک دلپذیر مرقع تھی۔ یہ ان کی روحانیت کی ایک معمولی سی جھلک ہے کہ چھ سو برس گزر جانے کے بعد بھی ان کی خانقاہِ فیض پناہ بمقام چرار شریف مرجع خلائق بنی ہوئی ہے۔ وادیٔ کشمیر اور اس سے باہر ان کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے۔ ان کے نور کی کرنیں بلالحاظ مذہب و ملّت سبھی فرقوں اور طبقوں سے تعلق رکھنے والوں کے لئے رہنمائی کا کام دے رہی ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ حضرت شیخ العالمؒ نے جب زندگی کے مختلف مراحل سے گزر کر عملی زندگی کو اپنایا تو انہوں نے محسوس کیا کہ انھیں اپنا پروگرام وادی کے کونے کونے تک پہنچانے کیلئے اپنے جاں نثاروں کی ضرورت ہے جو ان کے نقشِ قدم پر چل کر ان کے مشن کو جاری رکھیں، اسکی ابتداء انہوں نے ایسے لوگوں کے ساتھ مناظروں اور مجادلوں کے علاوہ روحانی کمالات اور تزکیۂ نفس کی پرکھ سے کی جو اس وقت روحانی اور دنیاوی لحاظ سے بامِ عروج پر تھے ان لوگوں کیساتھ

بحث و مباحثے کے بعد حضرت شیخ العالمؒ نے انہیں اپنا ہم خیال بنا کر اپنے تانے بانے کو وسعت دی، اور اپنے مقاصد کی آبیاری کی۔ اس طرح سے دین کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ دائرہ ریشیت بھی وسیع ہوتا گیا۔ اس ضمن میں ہمارے سامنے حضرت شیخ العالمؒ کے خلفاء کی مثال واضح ہے جن کا تعلق کسی نہ کسی لحاظ سے کشمیر کے سربرآوردہ لوگوں سے تھا۔ خصوصی طور پر پہلے چار مقتدر خلفاء کا رتبہ سیاسی، مذہبی اور سماجی لحاظ سے کشمیر میں اس وقت کافی بلند تھا۔ ان کے دائرہ اثر میں لوگوں کی کافی تعداد تھی۔ اور جب وہ حضرت شیخ العالمؒ کے مرید بن گئے تو کشمیر کے طول و عرض میں ان کے اثر و نفوذ کی بدولت ریشی مسلک کافی پھولا پھلا اور اسے اپنے طرزِ عمل، طریق بود و ماند، اندازِ عبادات، واذکار، زہد و اتقاد اور دیگر عملی میدانوں میں انفرادیت حاصل ہونے کی وجہ سے دنیا کے صوفیوں کے دوسرے گروہوں سے ایک الگ مقام حاصل ہوا ہے۔ سلسلہ ریشیان یا ریشی مسلک کشمیر کی پیداوار ہے۔ اس کی نشاندہی کشمیر کے قدیم تاریخی اور ماقبل تاریخی دور سے بھی ہوتی ہے۔ اور پھر یہاں مختلف مذاہب کے پھیلاؤ کے بعد بھی ان کی انفرادیت قائم رہی۔ اسلام کی آمد کے بعد ان لوگوں نے دائرہ اسلام میں شامل ہو کر اسلامی عبادات کو بھی اپنایا مگر رہبانیت، ترکِ لذات اور نفس کشی کے طریقے لگ بھگ وہی رہے جو اس سے قبل تھے۔ البتہ ایک بات ضرور نظر آتی ہے کہ حضرت شیخ العالمؒ کے دور میں ریشی سلسلے کا باقاعدہ ایک گروہ پیدا ہو گیا اور اس کی ایک قسم کی تنظیم وجود میں آئی جبکہ اس سے پہلے یہ لوگ انفرادی حیثیت میں مختلف مقامات پر عبادات و اذکار میں مصروف رہتے تھے۔ مگر حضرت شیخ العالمؒ نے باقاعدہ مریدوں کا سلسلہ شروع کر کے اس مسلک کو وسعت بھی دی اور ریشیوں کی ایک منظم جماعت کی بنیاد بھی ڈالی۔ اس لحاظ سے انہیں اس سلسلے کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔

آیئے حضرت شیخ العالمؒ کے مریدوں کے بارے میں اجمالاً واقفیت حاصل کریں۔

مقتدر خلفاء

حضرت شیخ العالمؒ کے چار مقتدر خلفاء بابا بام الدینؒ، بابا زین الدین

بابا نصیر الدین، اور بابا لطیف الدین ہیں۔ ان خلفاء کے ساتھ حضرت شیخ کی وابستگی، ان کے روحانی مراتب اور ان کا دائرہ ریشیت واسلام میں داخلہ کافی دلچسپی کا باعث ہے۔ حضرت شیخ کے ہاتھ پر بیعت ہونے سے قبل بھی انہیں کسی نہ کسی طرح روحانی یا دنیاوی لحاظ سے اعلیٰ مقام حاصل تھا اور پھر حضرت شیخ کی تربیت کی بدولت انہیں مزید جلا ملی۔ یوں تو حضرت شیخ کے اور بھی خلفاء تھے مگر ان میں سے چار خلفاء پر انہیں ہمیشہ ناز تھا۔ اسی لئے انہوں نے اپنے کلام میں ان کا ذکر کیا ہے۔

بمہ نصر تہ بابہ زانو	لطیف زینہ دنوئے چھس
دُرین دیشم تیز بھاسو میرنو	یہے میانہ پہ پھینہ چھس

ترجمہ:۔ بام الدین، نصر الدین، بابا زین الدین اور لطیف سبھی اچھے اعلیٰ گوہر تھے خدا کی دین تھی کہ میں دنیا میں یاترا کی غرض سے آیا تھا۔ اور یہاں پر یہ میرے ہیں اور میں ان کا ہوں۔

بابا بام الدینؒ:۔ اسلام قبول کرنے سے قبل ان کا نام "بم ساد" تھا جو بم زو میں اپنے عقیدے کے مطابق تپسیا میں مصروف رہتا تھا اور لوگوں میں اپنی کڑی تپسیا اور روحانی کرامات کی وجہ سے "بم ساد" (بم زو کا سادھو) کے نام سے مشہور تھا۔ یہ اس وقت وادی کے تمام ریشیوں میں سے زبردست ریاضت کرنے والا ریشی تھا۔ اس کے مندر واقع بم زو میں ۳۶۰ بت تھے۔ روحانی کمالات کا یہ عالم تھا کہ پو پھٹنے سے قبل وہ وادی کشمیر کے پانچ تیرتھ استھانوں کا درشن کر آتا تھا جو کہ ایک دوسرے سے سینکڑوں میل دور ہیں مثلاً بارہمولہ میں کھادن یار، جھیل ولر میں ویرناگ، چھتہ بل میں چھتر یار، کوہ سلیمان کے دامن میں شیو پورہ اور بجبہاڑہ میں زندریار۔ یہ سبھی مقدس مقامات وادی کے مختلف حصوں میں ہیں اور طلوع سحر سے قبل اشنان کر کے ان مقامات پر جانا نہانا دھو کر پوجا پاٹھ کر کے واپس بم زو لوٹنا کوئی معمولی روحانی کمال نہ تھا۔ اسی وجہ سے بم ساد کشمیر میں بہت بڑا روحانی گرو مانا جاتا تھا جس کے زیر اثر اس وقت کشمیر کی بہت سی آبادی رہی ہوگی۔

جب حضرت شیخ العالمؒ کو ان کی روحانیت کا یہ حال معلوم ہوا تو انہوں نے سوچا کہ ایسا عالم باکمال شخص دائرہ اسلام میں داخل ہونا چاہیئے چنانچہ انہوں نے اس پر غور و فکر کرنے کے بعد بم ساد

لہ اننت ناگ، پہلگام سڑک پر ایک جگہ کا نام

نے دو بدو بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

لہذا حضرت شیخ نے اُس کی روحانی طاقت کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد اپنی روحانی طاقت سے بم ساد کی ساری روحانی طاقت سلب کرکے اس سے مقابلہ کرنے کی ایک ترکیب سوچی۔ چنانچہ وہ خون میں لت پت گائے کا چمڑا لے کر مندر میں گھس گئے۔ حضرت شیخ کا ایسا کرنا تھا کہ سادھو غصہ میں بھرا ہوا انہیں بُرا بھلا کہنے لگا۔ اور کہا کہ گائے کے چمڑے کی بدولت میرا مندر گندہ اور ناپاک کر دیا۔ اُس پر حضرت شیخ نے فرمایا کہ جب گائے کا گوبر اور موت گندہ نہیں ہوتا تو چمڑا کیسے گندہ ہوا۔ یہ بات حضرت شیخ نے بڑی حلیمی اور حکمت سے سنائی۔ جس پر بم ساد نے کہا کہ شاید تو تُنڈویشی ہے۔ اقرار کرنے پر پوچھا کیا چاہتے ہو؟ حضرت شیخ نے کہا، تمہارا راہ راست پر آنا یعنی اسلام قبول کرنا۔ جس پر بم ساد نے حضرت شیخ سے جھگڑنا چاہا۔ انہوں نے مورتیوں کی طرف نگاہ کر کے بم ساد سے سوال کیا۔ یہ مورتیاں کس نے بنائی ہیں؟ جواباً کہا کہ سنگتراشی نے اور ساتھ ہی حضرت شیخ کو چلے جانے کے لئے بھی کہا۔ مگر انہوں نے کہا کہ سادھو ذرا کچھ کھلاؤ تو سہی۔ سادھو نے نفی میں جواب دیا۔ مگر حضرت شیخ نے کہا کہ کچھ نہ ہونے کا رونا کیوں روتا ہے۔ دیگچی تو بھری پڑی ہے۔ سادھو نے کہا یہ کس سحر کے زور سے تو نے ایسا کیا۔ شیخ نے فرمایا۔ یہ قدرت (خدا) کی کاریگری ہے۔ وہ ہر شے پر قادر ہے۔ مگر تمہارے یہ خدا (بت) نہ کسی فائدے اور نہ کسی نقصان کا باعث بن سکتے ہیں۔ تم خدا کی وحدانیت کا اقرار کیوں نہیں کر لیتے بم ساد نے کہا میں تمہاری ان لگی لپٹی باتوں میں آنے کا نہیں۔ اپنا اس طرح بت پرستی چھوڑنے والا بھی نہیں۔ اس پر حضرت شیخ نے کہا کہ اگر یہ تمہارے بت خدا کا اقرار کریں تو پھر مسلمان بن جاؤ گے۔

بم ساد نے کہا ہاں۔ حضرت شیخ نے مورتیوں کو مخاطب کر کے پوچھا، خدا کتنے ہیں؟ مندر کے سب بت بہ یک آواز بول اٹھے لا الٰہ الا اللہ۔ جب سادھو نے بتوں کو خدا کی وحدانیت

کا اقرار کرتے دیکھا تو اس کے پاس اب اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ کہ وہ بھی خدا کی یکتائی کا اقرار کرے چنانچہ وہ بھی مسلمان ہو گیا۔

حضرت شیخؒ نے اسے نہ صرف سلب کی ہوئی طاقت واپس کی بلکہ اپنی توجہ سے سلوک کے اعلیٰ و ارفع مقامات پر پہنچا دیا۔ اور اس کا نام بم سادے سے بدل کر بام الدین رکھا جو بعد میں بابا بام الدین مشہور ہو گیا۔

اسلام قبول کرنے کے بعد بابا بام الدین نے حضرت شیخ سے پوچھا کہ پیر مرشد آج کے بعد میں کس سے افطار کروں کہتے ہیں کہ حضرت شیخ نے ایک سفید پتھر کی طرف اشارہ کیا (جو آج بھی موجود ہے) کہ اسے گھس کر افطار کیا کرنا۔ دیئے میں تیل کے بجائے پانی جلتا تھا۔ اس کے بعد بابا بام الدین بارہ سال زندہ رہے۔ اور اپنے مرشد کی ہدایات پر عمل کرتے رہے۔ مرتے دم تک کسی کی خدمت کے محتاج نہ رہے۔ لوگوں سے بالکل میل جول نہ رکھا صبر و قناعت کی زندگی بسر کی۔

کہتے ہیں کہ سلطان سکندر کا بیٹا علی شاہ اپنے باپ کے فرمانے پر شاہی لباس کے بجائے سادہ لباس زیب تن کر کے بابا بام الدین کے حضور پیش ہوا اور عرض کی کہ مجھے کچھ نصیحت کیجئے۔ بابا بام الدین نے کہا کہ شاہی لباس تو اتارا مگر ابھی تک بادشاہی کا خیال دل سے نہیں گیا اور نخوت کی ردئی ابھی تک کانوں میں موجود ہے میری نصیحت تمہیں کیا اثر کرے گی۔ کیونکہ بادشاہوں کی مثال آگ جیسی ہے جو ہوا سے زیادہ بھڑک اٹھتی ہے۔ علی شاہ نے کہا اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو حکم دیا جائے۔ بابا بام الدین نے فرمایا کہ آئندہ یہاں آنے کی تکلیف گوارہ نہ کرنا۔ اور میرا نام اپنی مجلسوں میں نہ لینا۔ علی شاہ نے کہا کیا آپ کو اہل دنیا سے نفرت و عداوت ہے جواباً کہا اس سے کہیں زیادہ جتنی میں دنیا سے نفرت کرتا ہوں۔ علی شاہ نے کہا کہ دنیا دار اور درویشوں میں کیا فرق ہے؟ انہوں نے فرمایا اندھے اور آنکھوں میں جو فرق ہے۔ کہتے ہیں علی شاہ کے چلے جانے کے بعد بابا بام الدین نے اپنی کٹیا کو دھو کر صاف فرمایا۔

کہتے ہیں جب حضرت بابا بام الدین کا آخری وقت آیا تو حضرت بابا زین الدین کو یاد فرمایا۔

جو اُن دنوں جلاوطنی کے دن لداخ میں گذار رہے تھے۔ انہیں روحانی طور پر معلوم ہوا اور طے مکان کر کے بمزو پہنچے اور ان کے سرہانے پر بیٹھ گئے۔ وفات کے بعد بابا زین الدّین نے ہی انہیں غسل دیا اور ان کی ہی کوٹھری واقع بمزو میں سپردِ خاک کیا۔

بمزو میں بابا بام الدّین کی زیارت جو ان کے اسلام قبول کرنے سے قبل مندر تھا اب آج کل مرجع خلائق ہے۔

بابا بام الدّین کے مریدوں میں سے بابا رجب الدّین، بابا شکور الدّین، بابا فخر الدّین، بابا نور دوز ریشی، بابا نند و ریشی، بابا حاجی ریشی، بابا شمس الدّین، اور بابا حنیف الدین حیدر قابلِ ذکر بزرگ تھے۔

بابا زین الدّین۔ یہ علاقہ بلپاڑ[۱] کے رہنے والے تھے اور ان کا نام جے سنگھ یا زیا سنگھ تھا۔ ان کا تعلق وہاں کے راجہ خاندان[۲] سے تھا۔ ان کا باپ اقتدار کی ایک جنگ میں مارا گیا تو بیوہ ماں کو بچے کی پرورش اور دیکھ بھال کے سلسلے میں سخت پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا اور جب ایک مرتبہ اس کی آنکھوں کا تارا بیمار پڑا اور کافی علاج معالجہ کے بعد اس کے بچنے کی کوئی امید باقی نہ رہی تو ظاہر ہے اُس کے دکھی دل سے کوئی ایسی دُعا نکلی ہوگی جس نے بارگاہِ ایزدی میں شرفِ قبولیت

---

[۱] مورخ حسن ان کی جنم بھومی بھنڈار کوٹ لکھتا ہے ریشی ناموں کے مطابق یہ جگہ باندر کوٹ (بھنڈار کوٹ) ہے جیسے بلپاڑ اور بھنڈار کوٹ ملحقہ علاقے ہیں۔ جانکی ناتھ گنہار اپنی کتاب JAMMU SHRINES AND PILGRIMAGES میں صفحہ ۱۲۲ پر لکھتے ہیں کہ زین الدّین علاقہ بلپاڑ کے رہنے والے تھے اور انہوں نے بھنڈار کوٹ کے غار میں بہت سا عرصہ گذارا۔

[۲] ممکن ہے ان کا خاندان بھی شیخ العالمؒ کے خاندان کی ہی کوئی شاخ ہو کیونکہ اس خاندان کے کچھ افراد نے نہ صرف ان علاقوں کو اپنی حکومت میں شامل کیا تھا بلکہ کچھ لوگوں نے وہاں جاگیریں حاصل کر کے سکونت بھی اختیار کی تھی (م۔ا۔د)

کا جامہ پہن لیا اور روایت ہے کہ عین جان کنی کے وقت روحانیت کے بحر بے پایاں حضرت شیخ العالمؒ کا وہاں پر ظہور ہوا اور لڑکے کی ماں سے بچے کے بارے میں دریافت کرنے کے بعد فرمایا کہ اگر تیرا بچہ صحت یاب ہو جائے تو مجھ سے وعدہ کرو کہ تم دونوں کشمیر آکر مسلمان ہو جاؤ گے۔ ماں نے وعدہ کیا اور حضرت شیخؒ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ جب زیا سنگھ صحت یاب ہوا تو ماں نے کشمیر آنے کا ارادہ یا تو ترک کیا یا آنا ہی بھول گئی مگر جب وہ دوبارہ بیمار ہوا تو ماں کو اپنی وعدہ خلافی یاد آئی چنانچہ اُس نے رخت سفر باندھا اور بیٹے کو لے کر کشمیر کی طرف روانہ ہوئی۔ ادھر حضرت شیخ العالمؒ نے بابا بام الدینؒ سے فرمایا کہ کشتواڑ سے ایک عورت اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر پہنچ رہی ہے۔ ان کے لئے کھانے پینے اور رہنے سہنے کا انتظام کیا جائے۔ ماں بیٹے کے بابا بام الدین کے پاس پہنچنے کے چند دنوں بعد جب حضرت شیخ خود بھی آپہنچے تو انہیں دیکھتے ہی ماں نے پہچان لیا۔ پھر ماں بیٹے دونوں نے حضرت شیخ سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا۔ جے سنگھ یا زیا سنگھ کا نام زین الدین رکھا گیا اور یہیں سے ان کے بے پایاں روحانی سفر کا آغاز ہوا۔ بابا زین الدین نے اپنے پیر و مُرشد سے تربیت پا کر وہ مرتبہ حاصل کیا۔ کہ خود شیخ العالمؒ ان کی تعریف میں کہتے ہیں۔

زینہ میون چھُے امرت گوزوٗ

تمۍ تہٕ آدرُ سمار کو

گوتہٕ گوٗرس ژاٹھارۍ رٕد

تیتھ مےٚ ورد تو دو

ترجمہ :۔ میرا زینہ سرچشمۂ آبِ حیات ہے اُس نے اللہ تعالیٰ کی اس قدر کڑی عبادت کی کہ شاگرد اُستاد سے آگے نکل گیا۔

جب بابا زین الدین نے اپنے اُستاد کی توجہ و تربیت سے مقاماتِ سلوک طے کیے تو شیخ العالمؒ نے انہیں حکم دیا کہ وہ عیشِ مقام کو اپنا مسکن بنائیں۔ اور حسبِ ارشاد جب وہ وہاں پہنچے تو کہتے ہیں کہ انہوں نے وہاں بچھو اور سانپ بے شمار دیکھے۔ جن کو مخاطب ہو کر انہوں نے فرمایا کہ اے مخلوق خدا یہ غار اب درویشوں کو دیا گیا ہے۔ یسے خالی کرو۔ سانپوں اور بچھوؤں نے ان سے رات کی مہلت مانگی اور دوسرے دن وہاں سے ایک دوسرے جنگل میں منتقل ہو گئے کہتے ہیں کہ یہ سانپ اور بچھو کسی کو ڈنک نہیں مارتے کیونکہ حضرت زین الدینؒ نے ان سے وعدہ لیا ہے کہ وہ کسی کو گزند نہ پہنچائیں۔ اس کے بعد انہوں نے اسی جگہ یادِ خدا میں اپنی عمر بسر کی۔

ان کی کرامتیں اور خوارق عادات بے شمار ہیں چند ایک کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ رہے گا۔

(۱) کہتے ہیں کہ جب بابا زین الدینؒ عیشِ مقام کے غار میں محوِ عبادت رہتے تھے اور وضو وغیرہ کے لئے پانی نزدیک کہیں نہ تھا۔ اس لئے مریدوں کو دور سے پانی ڈھونڈنا پڑتا تھا۔ ایک دن کا ذکر ہے حاجی شمس الدین پانی لا رہا تھا کہ پاؤں پھسل گیا جس کی وجہ سے اس کا گھٹنا ٹوٹ گیا اور گھڑا بھی گر کر چور چور ہو گیا۔ وہ روتا دھوتا بابا کے پاس پہنچا۔ سارا ماجرا کہہ سنایا جس پر حضرت زین الدین نے حاجی کے گھٹنے کی مالش کی اور وہ ٹھیک ہو گیا پھر پاس ہی ایک گڑھا کھودا اور پانی کے لیے دعا فرمائی۔ یکایک پانی کا چشمہ ابل پڑا۔ کہتے ہیں کہ پانی کے آگے آگے جہاں تک بابا صاحب تشریف لے گئے وہاں تک پانی بھی بہا اور پھر وہیں زمین میں جذب ہو گیا۔

یہ آج بھی وہیں تک بہتا ہے ۔

(۲) بابا زین الدینؒ کا قیام عیش مقام کے غار میں ایک مقامی گڈریے کو ناگوار گذرا چنانچہ اُس نے ایک دن ایک بکری کے بچے کو مار کر اُس کی کھال وغیرہ موقعہ پاکر حضرت زین الدینؒ کی جائے نماز کے نیچے چھپا کر رکھ دی اور خود کوتوالی میں رپٹ لکھوائی۔ کارندے آئے اور گڈریے کی نشاندہی کرنے پر متعلقہ چیزیں برآمد کر لی گئیں۔ کہتے ہیں بابا زین الدینؒ نے میلے کی ٹانگیں سر اور کھال اکٹھا کر کے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی کہ بکری کا بچہ نہ صرف زندہ ہو گیا بلکہ اصلی واقعہ بھی سنایا۔ جس سے گڈریے کی قلعی کھل گئی اور بابا صاحب کی شہرت دور دور تک جا پہنچی اور بے شمار لوگ عقیدت مند ہو گئے۔

(۳) بابا زین الدین عیش مقام سے اوپر گرنڈی مرگ نام کے ایک جنگل میں عبادت کرتے تھے جہاں جنگلی جانوران کے ارد گرد جمع ہو جاتے تھے جنہیں دیکھ کر اصحاب رنج کرنے والے بھاگ جاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ان کا ایک مرید ان سے ملنے جا رہا تھا کہ لوگوں نے جو ایک نہر کی کھدائی وغیرہ کر رہے تھے۔ اُسے بھی بیگار کے طور پر روک لیا اور اُس سے بھی کھدائی کا کام کرایا جب وہ بابا صاحب کے پاس دیر سے پہنچا تو انہوں نے دیر کی وجہ دریافت کی اور مرید نے حقیقت حال کہہ سنائی بابا زین الدین کو کافی غصہ آیا اور خود نہر پر آ کر اپنی لاٹھی کو نہر میں گاڑ دیا اور کلاہ زمین پر رکھ دی۔ بابا زین الدینؒ کا ایسا کرنا تھا کہ پانی خشک ہو گیا۔ کارندے یہ دیکھ کر حیران ہو گئے اور دوڑے دوڑے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر منت سماجت کر کے معافی مانگی اور ساتھ ہی یہ گذارش بھی کی کہ آپ اپنے مریدوں کے لئے کوئی مخصوص نشانی رکھیں تاکہ ان سے کوئی شخص باز پرس نہ کرے۔ اس پر حضرت بابا زین الدینؒ نے نہر سے لاٹھی نکالی اور پانی جاری ہو گیا اور ساتھ ہی دھاری دار پگڑی اپنے مریدوں کو باندھنے کی ہدایت کی جسے کشمیری میں (ریشی کا ٹن) کہتے ہیں۔

(۴) کہتے ہیں ایک دن بڈشاہ شاہ کوہل کی کھدائی کے کام کا جائزہ لینے گیا اور وہاں

سے ہی بابا زین الدین سے ملاقات کرنے بھی گیا۔ مگر بابا نے کوئی خاص توجہ نہ دی جس پر برانگیختہ ہو کر بادشاہ نے انہیں تبت جلاوطن کیا۔ جہاں انہوں نے اسلام کی تبلیغ کا کام کیا روایت ہے کہ وہاں بھی ایک دن تبت کے راجہ کا بیٹا مر گیا۔ اور اُس نے یہ الزام بابا پر لگایا کہ ان کے آنے کی وجہ سے یہ شامت آگئی ہے لہذا میرے بیٹے کو زندہ کیا جائے۔ بابا نے ایک رات کی مہلت چاہی اور کہا کہ جو خدا کی مرضی ہوگی وہی ہوگا لہذا خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ دوسرے دن صبح کو راجہ کا بیٹا زندہ ہو گیا

اس بات کا پہلے بھی تذکرہ آچکا ہے کہ جب بابا بام الدین نے رحلت فرمائی تو بابا زین الدین طے مکان کر کے بم ترد پہنچے اور ان کی تجہیز و تکفین کی اور پھر واپس تبت چلے گئے۔ ان ہی ایام میں زین العابدین (بڈ شاہ) کے پاؤں میں ایسا درد ہوا کہ کسی طور آرام نہ آیا آخر خیال آیا کہ شاید بابا زین الدین کی ناراضگی کا سبب ہو چنانچہ بڈشاہ نے اپنے بیٹے حیدر خان کو بھیج کر بابا کو تبت سے عزت و احترام کے ساتھ بلا لیا۔ اور خود بڈشاہ نے اپنے پاؤں پر چل کر بابا کا استقبال نہیں کیا اور پاؤں کا درد بھی جاتا رہا۔

مشہور ہے کہ جب بابا زین الدین نے وفات پائی تو ان کی نعش کو غسل دے کر غار سے کچھ دور فاصلے پر قبر کھود کر نماز جنازہ پڑھی اور تابوت میں سے نعش کو نکال کر قبر میں اتارنا چاہا تابوت خالی تھا۔ مرید اور دوسرے حاضرین زار و قطار روئے آخر تابوت وہیں چھوڑ کر واپس اپنے گھروں کو چل دیئے۔ رات کو ایک مرید نے خواب میں دیکھا کہ بابا نے ہدایت کی جس جگہ تابوت ہے وہاں پر ہی قبر کھود دی جائے۔ اُس نے کہا کہ وہاں ایک قبر کے بغیر جگہ نہیں ہے آخر ہم لوگوں کی قبریں کہاں ہونگی اس پر انہوں نے کہا کہ کچھ دور اوپر دوسری قبر تیار کریں ان دو قبروں کے درمیان دوسری قبروں کے لیے جگہ نکلے گی۔ ان کی ہدایت کے مطابق دوسرے روز ایسا ہی کیا گیا۔ ان دو قبروں کے درمیان اس وقت بھی اٹھارہ قبریں موجود ہیں۔ یہ قبریں مرجع خلائق ہیں۔ بابا غار میں جس جگہ بیٹھتے تھے وہاں بھی ایک فرضی قبر بنائی گئی ہے۔

بابا زین الدین کا عرس ہر سال کشمیری حساب کے مطابق ویشاکھی شرحی کو منایا جاتا ہے

انہوں نے حضرت شیخ کی ساری عمر خدمت کی۔ آپ ان کے محرم راز ہم نشین، خدمت گذار اور فقیروں اور درویشوں کے لیے ایسے قدردان تھے کہ حضرت شیخ کے اکثر ملفوظات ان سے ہی مخاطب و منسوب ہیں۔ آپ کے ساتھ حضرت شیخ بہت ہی بے تکلف تھے چنانچہ اپنے اشلوکوں میں انہوں نے انہیں نصر یا بابا نصر و کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ اسی لئے عوام میں آپ نصیر الدین کے بجائے میں بابا نصر کے نام سے زیادہ معروف ہیں۔

روایت ہے کہ بابا نصیر الدین کے والدین کافی دولتمند تھے لیکن بابا نصیر الدین جس کا پہلا نام اوتر تھا، کو بچپن میں قے آنے کی ایسی بیماری شروع ہوئی کہ کافی علاج معالجہ کے بعد بھی آرام نصیب نہ ہوا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئے اور بستر کے ساتھ لگ گئے۔ جب ہر طرف سے مایوسی دکھائی دی تو ایک رات کو بابا نے خواب دیکھا کہ ایک محفل میں کافی لوگ بیٹھے ہیں جن کے درمیان ایک نورانی بزرگ تشریف فرما ہیں بابا نے کسی سے دریافت کیا تو جواب ملا کہ بزرگان خدا کی جماعت ہے اور یہ نورانی بزرگ حضرت شیخ العالمؒ ہیں جو کیموہ (اننت ناگ) میں گوشہ نشین ہیں۔ ممکن ہے اُن کی نظر سے تمہاری بیماری دور ہو جائے۔ جاگنے پر بابا نے خواب کی کیفیت والدین سے بیان کی وہ اسی وقت اپنے بچہ کو لے کر حضرت شیخ کی خدمت میں حاضری کے لئے چل دیئے۔ جب وہاں پہنچے تو حضرت شیخ نے نام وغیرہ دریافت کر کے بابا کو کھانا پیش کیا اور ان کا کھانا کھانا تھا کہ اُس کے بعد بیماری ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رفع ہو گئی۔

حضرت شیخ العالمؒ کی توجہ سے نہ صرف بابا نصر کی بیماری دور ہوئی بلکہ اُن کی دنیا بھی بدل گئی چنانچہ انہوں نے حضرت شیخ کے ہاتھ پر بیعت کی اور نصیر الدین نام پا کر حضرت شیخ کی خدمت گذاری کو اپنایا۔ حضرت شیخ نے انہیں باورچی کا منتظم مقرر کر کے فقیروں اور درویشوں کی دیکھ بھال اور خاطر مدارت کا کام سونپا۔ جسے وہ احسن طریقے سے ساری عمر انجام دیتے رہے۔

تیرھویں کی رات کو سارے علاقہ میں چوب چراغ جلا کر چراغاں کرتے ہیں جسے وہاں کے لوگ کشیری میں تماہبہ کہتے ہیں۔

بابا زین الدین بڑے متقی پرہیزگار اور خدا ترس بزرگ ریشی تھے کہتے ہیں انہوں نے ساری عمر اخروٹ کے چھلکوں پر گزارہ کیا ہے اور اپنے معبود حقیقی کی عبادت اور عوام کی بھلائی کے بے شمار کام کئے۔

بابا زین الدینؒ نے حضرت شیخ العالمؒ کے انتقال کے دس برس بعد وفات پائی آپ بڑے صاحب حال ریشی تھے۔ آپ کے کشف و کرامات نے لوگوں کو آپ کا بہت گرویدہ بنا لیا تھا۔ اسی لئے عوام میں آپ زینہ شاہ صاحب کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ آپ کے تربیت یافتگان میں کافی لوگ بلند مرتبہ ولی اور بزرگ ہوتے ہیں جن میں سے بابا شمس الدینؒ بابا پیام الدینؒ بابا داریادینؒ، سنگ بی بی اور بابا شکر الدینؒ کا نام سرفہرست ہے۔

حیات نصیر الدینؒ :- بابا نصیر الدینؒ کو کچھ محققین حضرت شیخ العالمؒ کا چوتھا خلیفہ مانتے ہیں مرغوب بانہالی ڈاکٹر صوفی کا حوالہ دیتے ہوئے خلیفہ اول گردانتے ہیں حالانکہ ڈاکٹر صوفی نے انہیں خلیفہ اول کہیں بھی نہیں لکھا ہے۔ بلکہ انہوں نے حضرت شیخ کے خلفاء کا ذکر کرتے ہوئے کشیر کے صفحہ ۱۰۲ پر یہ عبارت لکھی ہے SHAIKH NUR-UD-DIN HAS FOUR DISCIPLES! NASR-UD-DIN, BAM-UD-DIN, ZAIN-UD-DIN AND LATIF-UD-DIN. BABA NASR-UD-DIN IS TO BE SEEN BEHIND SHAIKH NUR-UD-DIN IN THE PORTRAIT. OPPSITE PAGE 98

اس سے ڈاکٹر صوفی کی مراد تصویر میں حضرت نصیر الدین کی نشاندہی کرنا ہے۔ روحانی مرتبہ اور حضرت شیخ العالمؒ کے یاران باصفا میں شامل ہونے کے لحاظ سے یہ حضرت شیخ کے تیسرے خلیفہ ہیں۔ جو ان سے بیعت ہونے کے بعد وصال تک سائے کی طرح ان کے ساتھ ساتھ رہے۔

۱ شیرازہ شیخ العالم نمبر ص ۷۰

بابا نصیر الدین نے حضرت شیخ سے سلوک کے وہ مدارج طے کیئے کہ روحانیت میں وہ ایک اعلیٰ و ارفع مقام کے مالک بن گئے۔

کہتے ہیں کہ مطبخ کے نگران کی حیثیت سے انہوں نے کبھی بھی شکم سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا بلکہ جو بھی پکتا تھا سب بانٹ دیتے تھے۔ اور خود تھوڑی سی لاکھ پانی میں گھول کر پی لیتے تھے۔ جب کسی شخص نے انہیں ایسا کرتے دیکھا تو اُس نے حضرت شیخ العالمؒ سے شکایت کی کہ بابا نصر خود دودھ پیتا ہے اور ہمیں جنگلی ساگ کھانے کو دیتا ہے۔ اس پر حضرت شیخ نے اُس شخص سے کہا کہ جب وہ دودھ پینے لگے تو اُس سے پیالہ لے کر میرے پاس لے آنا۔ شام کو جب افطار کے وقت بابا نے پیالہ لے کر کچھ پینا چاہا تو اُس شخص نے پیالہ ہاتھوں سے چھین لیا اور حضرت شیخ کی خدمت میں لے گیا۔ حضرت شیخ نے اُس آدمی سے کہا کہ اس دودھ کے پیالے کو میرے سامنے پیالو۔ جونہی اُس نے ایک گھونٹ پیا اُس کے حلق اور زبان کو سخت تلخی محسوس ہوئی اور وہ اُسے نہیں پی سکا۔ بعد ازاں حضرت شیخ نے بابا کو بلایا اور آئندہ چاول سے افطار کرنے کی ہدایت کی اور پھر وہ چاول کے اٹھارہ[۱] دانوں کو پکا کر روزانہ کھاتے تھے اور ساری عمر اسی پر قناعت کی۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت شیخ کے حکم سے چلّے کو بیٹھے گئے اور چار عدد اخروٹ ساتھ رکھے جب دس روز گذرے تو ایک اخروٹ توڑنا چاہا۔ جونہی اخروٹ توڑتے حضرت شیخ آنکلے۔ پوچھا بابا نصر کیا کر رہے ہو۔ جواب دیا اخروٹ توڑ رہا ہوں۔ حضرت شیخ نے فرمایا میں سمجھ رہا تھا کہ نفس توڑ رہے ہو لیکن تم تو ابھی تک اخروٹ کے ہی خیال میں پھنسے ہو۔[۱] کہتے ہیں کہ جب وہ چالیس روز کا چلّہ کاٹ کر نکلے تو چاروں اخروٹ اپنے مرشد کی خدمت میں پیش کئے۔

الغرض بابا نصیر الدین کڑی ریاضت اور محنت شاقہ کرنے والے ریشی تھے۔ جو بط نفس میں لاثانی تھے۔ حضرت شیخ کی صحبت میں عمر کا بیشتر حصہ گذارنے کی وجہ سے ان کی بہت سی

---

[۱] تذکرہ اولیائے کشمیر از حسن ص ۱۴۲

خدمات کا ظاہر ہے ان پر کافی اثر پڑا ہوگا۔ کیونکہ انہوں نے حضرت شیخ کی مریدی اختیار کرنے کے بعد ان کے وصال تک جی جان سے ان کی خدمت کی اور بعد وصال بھی ان کی زیارت کے سجادہ نشین بن کر فقیروں، درویشوں اور بزرگانِ خدا کی خدمت انجام دیتے رہے۔

روایت ہے کہ بابا نصیر الدّین صاحب کا جب آخری وقت آن پہنچا تو انہوں نے حضرت شیخ کو خواب میں دیکھا۔ انہوں نے فرمایا کہ تم نے بہت تکلیف اٹھائی ہے۔ اب میرے پاس چلے آؤ اور ملک جوگی رینہ کو اپنا منصب سونپ دو۔ جب بابا نیند سے بیدار ہوئے تو کافی متفکر ہوئے۔ ملک جوگی رینہ کو جاکر سب کیفیت سنائی۔ اس نے اول انکار کیا مگر بعد میں اس کے دل میں یہ ذمہ داری قبول لینے کا پختہ ارادہ ہوا اور وہ بابا نصر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بابا بستر پر پڑے تھے۔ جوگی رینہ ان کی تیمارداری میں لگ گئے اور ان کی توجہ سے مقامات سلوک بھی طے کئے۔ کئی دن بیمار رہنے کے بعد بابا نصیر الدّین نے رحلت فرمائی اور حضرت شیخ العالمؒ کی زیارت کے اندر ہی واقع چرار شریف میں دفن کئے گئے۔ کسی نے یہ تاریخ کہی ہے

سال رحلتش باز جستم سیدم از عقل

عارف باللہ نصیر الدّین بگفت (۸۵۵ھ)

بابا لطیف الدّین :- حضرت شیخ العالمؒ کے چوتھے خلیفہ تھے۔ اسلام قبول کرنے سے قبل ان کا نام بقول حسن آدتیہ رینہ اور بقول خواجہ اعظم دیدہ مری لدی رینہ تھا۔ قبولِ اسلام کے بعد لطیف الدّین نام پایا۔ ان کا آبائی وطن حضرت شیخ العالمؒ اور بابا زین الدین کی طرح علاقہ کشتواڑ ہے۔ ان کا تعلق مڑوہ واڑون کے ایک حکمران راجپوت گھرانے سے تھا۔ جو ہر سال حاکم کشمیر کے تئیں خراج پیش کرتا تھا۔[۲] اور اسی تعلق کی بنا پر بابا لطیف الدّین کا حضرت شیخ العالمؒ کے ساتھ ملاقات ہوئی کیونکہ حضرت شیخ کا ان دنوں کشمیر کے اطراف و اکناف میں کافی چرچا تھا

---

[۱] ملک جوگی رینہ اس وقت وزیر تھا لیکن بعد میں اس نے وزارت چھوڑ کر درویشی اختیار کی۔

فٹ نوٹ ۲ اور ۳ اگلے صفحے پر ملاحظہ کیجئے

اس لئے ملاقاتوں کے دوران شیخ کا فی بحث وتحقیق کے بعد اسلام قبول کیا اور دنیاوی جاہ وحشمت چھوڑ کر عقبیٰ کی سرخروئی حاصل کی۔ ان کے متعلق جی ایم۔ ڈی صوفی لکھتا ہے۔

BABA LATIF-UD-DIN IT IS SAID WAS HINDU AND AN OFFICIAL OF MARVA WARWAN AND ACCEPTED ISLAM AFTER A LONG DISCUSSION WITH SHEIKH NOOR — UD — DIN[1]

آپ کے اسلام قبول کرنے اور کشف وکرامات کے بارے میں مصنف اسرار الاخیار لکھتا ہے

"حضرت شیخ اوزا شیخ لطیف الدین نام نہادہ وبخدمت خاص اوزا اختصاص بخشید از مردانِ کارساز و دلیران جانباز وصاحب سوز وگداز بود۔ حالتی عجیب داشت کہ مردمان نزک دنیا از دآموختند وریاضت ومجاہدت ازدیدہ بآتش غیرت سوختند"

بابا لطیف الدین نے حضرت شیخ العالم سے تربیت پاکر بہت بلند مرتبہ حاصل کیا اور جب حضرت شیخ کو اپنے شاگرد رشید کی بالغ علمی اور علو مرتبہ کا احساس ہوا تو انہوں نے انہیں دین کی تبلیغ کا کام سپرد کیا چنانچہ وہ ددوپکھری کے مقام پر عبادت خانہ تعمیر کر کے عبادت وریاضت اور تبلیغی کاموں میں مصروف ہو گئے۔ کچھ عرصہ وہاں گذارنے کے بعد وترہیل اور پھر بیروہ میں پشکر کے مقام پر تادم حیات قیام کیا۔ رحلت فرمائی

[2]:- یہاں حضرت شیخ العالم تربت کے ارد گرد دس اصحاب دفن ہیں جن کے بارے میں کسی شاعر نے کہا ہے

گرد شمس العارفین این دہ ستارہ روشن اند
نصر حیدرین دجوگی ریشی ابی بلبل یک تن اند
زین ریشی وپپ ریشی سہنہ لیکھیر ہم
لاپا با غستہ باہ با جنید این دہ تن اند

اور یہ سب حضرت نصیر الدین کے مقتدر مرید ہوئے ہیں۔

[3] تذکرہ اولیائے کشمیر از حسن ص ۱۳۲

[1] KASHIR VOL I BY G.M.D SOFI P-102

کے بعد اسی جگہ نعش کو سپرد خاک کیا گیا۔ جہاں ان کی زیارت زائرین کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ ان کا عرس ہر سال ۲۵ پھاگن بکرمی کو منایا جاتا ہے

بابا لطیف الدین نے بھی سلسلہ ریشی برقرار رکھا اور شیخ پرباز، شیخ لچھم ریشی لدی کٹور بابا نور ریشی، بابا جنیدہ ریشی، بہرام ریشی شیخ شریف اور بابا لدی گنائی جیسے کئی بزرگ ان کے تربیت یافتہ ہیں۔

بابا لطیف الدین پرحد درجہ کے متقی اور پرہیزگار تھے ان کی ریاضت، عبادت بڑے بڑے عابدوں کے لیے باعث رشک و تقلید تھی۔

کہتے ہیں جب بابا لطیف الدین دودہ پتھری میں مقیم تھے تو اتیل ساگ کے سوا کچھ نہ کھاتے تھے۔ ان دنوں بابا پرباز اور شیخ شریف انکی خدمت میں رہتے تھے۔ ایک دن آپ کسی کام کے لیے باورچی خانے میں آنکلے تو دیکھا کہ ہانڈی میں ساگ پک رہا ہے۔ جو مارے جوش کے بک بک کی آواز پیدا کر رہی ہے۔ آپ نے شیخ شریف سے دریافت کیا اور معلوم ہوا کہ اتیل ساگ سبز تھا اس پر بابا لطیف الدین نے کہا کہ یہ زندہ ساگ تھا اسی لیے چلا رہا ہے آج سے میں اسے نہیں کھاؤں گا۔ یہ سن کر شیخ شریف نے تیز ہو کر کہا پھر کیا کاژن یعنی اندرامن کھائینگے، بابا نے کہا ہاں وہی کھاؤں گا اور پھر ساری عمر اسے ہی کھاتے رہے حالانکہ یہ بہت ہی زہریلی اور کڑوی شے ہوتی ہے۔

بہرحال بابا لطیف الدین ترک لذات اور ضبط نفس میں لاثانی اور عبادات و ریاضت میں یکتائے روزگار تھے۔

فصل دوم

قریبی خدام و دیگر خلفاء

حضرت شیخ العالمؒ نے اپنے مشن کو وادی کے کونے کونے تک پہنچانے کی خاطر خلوت نشینی چھوڑ کر مختلف مقامات پر قیام فرمایا اور راہِ حق کے جادہ پیماؤں کی تربیت، رہبری اور رہنمائی کی تاکہ وہ کام بطریقۂ احسن انجام دے سکیں۔ اِس سلسلے میں جہاں بہت سے بزرگوں کو براہِ راست حضرت شیخ العالمؒ سے ہدایت و تربیت پانے کے مواقع مل سکے وہاں بہت سے لوگوں کو اِن کی خدمت گزاری بھی نصیب ہوئی اور اِس طرح سے اِن کے خلفاء کی تعداد میں کافی اِضافہ بھی ہوا جن میں سے چند ایک کا یہاں اجمالاً ذِکر کیا جاتا ہے۔

سنگرام گنائی

حضرت شیخ العالمؒ جب دورانِ سیاحت دریہ گام پہنچے تو وہاں کا ایک دولت مند سنگرام(۱) یا سنگی گنائی اِن کا معتقد بن گیا۔ جس نے حضرت شیخؒ کو اپنے گھر لاکر ایک کوٹھڑی میں بٹھایا اور اُن کی خدمت کرنے لگے۔ وہ اپنی گائیوں کا دودھ دوہ کر اُنہیں پینے کے لئے دیا کرتے تھے۔ یہاں حضرت شیخؒ نے ۱۲ سال تک قیام کیا۔ روایت ہے کہ حضرت شیخؒ نے دریہ گام

---

(۱) سنگرام گنائی کے متعلق خاطر خواہ معلومات بہم نہیں ہیں شاید اِسلئے کہ دریہ گام کے کسی شخص نے ریشی نامہ نہیں لکھا ہے۔

پہنچنے پر ایک گھر کے دروازے پر دستک دے کر کھانگڑی مانگی لیکن گھر کی مالکن نے اُنہیں ایک عام بھکاری جان کر کچھ نہ دینا مناسب سمجھا اور چلے جانے کو کہا مگر جب اُس کا خاوند سنگرام گنائی گھر پہنچا تو سب کیفیت جان لینے کے بعد حضرت شیخؒ کو اپنے ہاں لایا۔ یہ بھی روایت ہے کہ سنگرام گنائی کی بیوی نے جب ایک دن سب گایوں سے دُودھ لیا تو حضرت شیخؒ نے ایک گائے سے متعلق دریافت کیا کہ اُس سے دُودھ کیوں نہیں لیا۔ اِس پر سنگرام گنائی کی بیوی نے بتایا کہ یہ گائے بانجھ ہے۔ حضرت شیخؒ نے فرمایا کہ بسم اللہ پڑھ کر اِس سے بھی دُودھ لے لو اور ایسا کرنے پر گائے نے واقعی دُودھ دیا اور وہ مُسلسل چھ سال تک دُودھ دیتی رہی اور حضرت شیخؒ اُسی گائے کے دودھ سے افطار کرتے تھے۔ یہاں سے متعلق ایک اور روایت ہے کہ ایک روز سنگرام گنائی اور اُسکی بیوی کہیں چلے گئے اور حضرت شیخؒ کی خدمت کے لئے اپنی بیٹی کو ہدایت دے گئے۔ جب وہ لڑکی حضرت شیخؒ کے لئے دُودھ کا پیالہ لے کر گئی تو اُس نے عجیب و غریب لوگوں کی ایک جماعت دیکھی۔ اِس بارے میں حضرت شیخؒ نے لڑکی کو کسی سے نہ کہنے کی تاکید کی مگر لڑکی سے نہ رہا گیا اور اُس نے اپنے والدین سے یہ بات کہدی اور ایسا کرنے کی وجہ سے وہ لڑکی مرگئی۔ اِس بناء پر سنگرام گنائی کی بیوی کو سخت دُکھ ہوا اور حضرت شیخؒ کو دُودھ نہ دینے کے بارے میں بہانے تراشنے لگی اور حضرت شیخؒ کی خدمت سے بھی جی چُرانے لگی۔ جب حضرت شیخؒ کو حقیقت سے آگاہی ہوئی تو وہ وہاں سے "رُوپہ وَنہ" کی طرف چلدیئے۔ اِس کا پتہ جب سنگرام گنائی کو چلا تو وہ اُنہیں واپس لانے کیلئے دوڑا مگر تب تک حضرت شیخؒ وہ ندی پار کر چکے تھے جس کے بارے میں اُنہوں نے سنگرام گنائی اور سنگرام ڈار[1] دونوں کو مخاطب ہو کر کہا تھا۔ ؎

شنگی گنیس تہ سنگرام ڈارس
یامہ ترٛ آرس تام چھس پٔھسون

(ترجمہ)
سنگی گنائی اور اے سنگرام ڈار
جب تک ندی عبور کرواؤں تب تیرا ہوں

---

[1] ڈار شریف کالنگ صاحب ثروت شخص تھا۔ جو حضرت شیخؒ کا خاص مُرید و خدمت گار تھا

روایت ہے کہ دریگام سے چلتے وقت حضرت شیخؒ نے کہا تھا کہ اگر سنگرام گنائی میرے ندی پار کرنے سے پہلے آگیا تو میں یہاں ہی رہوں گا ورنہ سنگرام ڈار کے پاس چلا جاؤں گا کہتے ہیں کہ حضرت شیخؒ نے کہا ہے کہ جس کسی کو من کی مراد پانا ہو اُسے چاہیئے کہ وہ جمعرات کو دریگام آئے۔

سنگرام ڈار

سنگرام ڈار کے آباء و اجداد بارہ مولہ کے رہنے والے تھے مگر وہ خود چرار شریف کا مکین تھا۔ دنیاوی طور پر کافی صاحب ثروت شخص تھا اور دینی طور پر جب وہ حضرت شیخ کا مرید بن گیا تو اُس کی دینوی زندگی بھی سنور گئی۔ چرار شریف میں جس جگہ اسوقت حضرت شیخؒ کی زیارت ہے اس جگہ کا نام زیر بار تھا اور یہاں سنگرام ڈار کا باغ تھا۔ اس کے پاس ہی ایک مسجد تھی۔ جو یعقوب شاہ چک کے دور تک موجود تھی۔ اس جگہ اب ایک نئی مسجد تعمیر ہوئی ہے۔ یہاں حضرت شیخؒ رُوپوون میں سات سال قیام کرنے کے دوران جمعہ نماز ادا کرنے جاتے تھے۔

سنگرام ڈار نے حضرت شیخؒ کی ہر طرح سے خدمت بجا لائی۔ وہ عبادت، ریاضت اور زہد و تقویٰ میں اپنے آپ کو ہر دم مصروف رکھتا تھا۔ کافی بلند حوصلہ اور وسیع القلب شخص تھا۔ وفات پانے کے بعد چرار شریف میں ہی دفن ہوا جہاں اب ایک آستانہ بنایا گیا ہے۔ چرار شریف کا ٹلو خاندان اُسی کی ذریت سے ہے۔

بابا تاج الدین

بادشاہ وقت کے محکمہ پولیس کے آفیسروں میں سے تھا۔ کہتے ہیں کہ جب حضرت شیخؒ نے گھر بار چھوڑ کر غار نشینی اختیار کی تو ان کی بیوی نے سلطان کے پاس جا کر نان و نفقہ کے لئے چارہ جوئی کی درخواست کی۔ اس پر سلطان نے حضرت شیخؒ کو دربار میں حاضر کرنے کے لئے تاج الدین یاتا زدین کو حکم دیا۔ اور جب یہ حضرت شیخؒ کھولانے کھیموہ کے غار دروازے پر پہنچا اور حضرت شیخؒ کو سلطان کا حکم سنایا تو حضرت شیخ غار کے دروازے تک آئے اور اُس پر ایک پر جلال نگاہ ڈالی۔ تاج الدین غش کھا کر گر پڑے۔ جب ہوش آیا تو حضرت شیخؒ سے بیعت ہو کر توبہ کی۔ سرکاری وردی اُتار پھینکی اور نوکری سے دستبردار ہو کر فقیری کا لباس پہنا۔ ساری عمر اللہ تعالےٰ کی بندگی میں گزاری اور بلند پایہ ریشیوں میں شمار ہونے لگے۔ وفات پانے کے بعد وتر ہیل میں

دفن کئے گئے

باباغلام الدین

باباغلام الدین حضرت میر محمد ہمدانی کے تربیت یافتہ سید سائتھوں میں سے تھے اور ہمیشہ اُن ہی کی صحبت میں رہ کر اُن کی خدمت بجا لاتے تھے حضرت میرؒ اُن کی کافی قدر کرتے تھے۔ روایت ہے کہ جب حضرت میرؒ نے حضرت شیخؒ کو خطِ ارشار عطا کیا تو حضرت شیخ نے باباغلام الدین کو بھی حضرت میرؒ سے مانگا۔ چنانچہ حضرت میرؒ نے باباکو اُنکے حوالے کیا۔

باباغلام الدینؒ حضرت شیخ کی وفات تک ان کے ساتھ ہی رہے، سلوک اور طریقت کی کئی منزلیں طے کیں۔ حضرت شیخ کی وفات کے بعد برین موجودہ نشاط میں گوشہ نشین ہو گئے اور وہیں وفات پاکر سُپردِ خاک کئے گئے۔

باباقطب الدین

باباقطب الدین کا نام قبولِ اسلام سے قبل قطبی پنڈت تھا۔ وہ دید اور شاستروں کے بہت بڑے عالم مانے جاتے تھے۔ حضرت شیخؒ سے ملاقات ہوئی اور انکی خصوصی توجہ سے اسلام قبول کیا۔ ریشی طریقے کی زندگی وہ چونکہ پہلے ہی سے گزار رہے تھے۔ اس لئے حضرت شیخ کی مصاحبت میں رہ کر اُسے مزید جلا ملی اور بہت بڑے ریشی کہلانے لگے۔ ہمیشہ حضرت شیخؒ کی مجلسوں میں موجود رہتے تھے۔ اور وہ چونکہ پڑھے لکھے تھے اس لئے حضرت شیخ کے کلام کو سنسکرت میں لکھتے رہتے تھے۔ اس وقت ہمارے پاس حضرت شیخؒ کا جو بھی کلام موجود ہے وہ باباقطب الدین کی کاوشوں کی دین ہے۔ کیونکہ اُنہوں نے ہی سب سے پہلے اسے قلمبند کیا تھا۔

باباقطب الدین وفات پانے کے بعد حضرت شیخؒ کے ہی احاطے میں دفن کئے گئے۔

باباقیام الدین

حضرت شیخؒ کے مُریدوں میں سے تھے۔ عالمِ شباب میں ہی ہدایت پائی اور خود رہبر و رہنماں بن گئے۔ اگرچہ پہلے ہی سے خدا رسیدہ تھے مگر حضرت شیخؒ کے مریدوں میں شامل ہونے کے بعد رہی سہی کمی بھی پوری ہو گئی اور بہت عالی مرتبہ ریشی بن گئے۔ اپنے مُرشد کے حکم کے مطابق منزہ گام (دلوسر) کے ایک ٹیلے پر گوشہ نشین ہو گئے۔ ساری عمر ابلی ساگ سے کھاتے رہے۔ صبر و قناعت کی زندگی بسر کی۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے منزہ گام کے ایک چشمہ کے

کنارے سوکھی ٹہنیوں سے ایک کٹیا بنائی۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ٹہنیاں گاڑتے ہی سرسبز ہوگئیں جو ایک مدت تک موجود تھیں۔

وفات پانے کے بعد منزہ گام میں ہی دفنائے گئے۔

مولانا مانک نایک

مولانا مانک ایک پڑھے لکھے عالم و فاضل شخص تھے۔ لگ بھگ تمام علوم پر یکساں دسترس رکھتے تھے۔ حضرت شیخ کے طریقہ ریشیت کو ناپسند فرماتے تھے۔ چنانچہ ان سے بحث و مباحثہ کرنے کے لئے روپہ وَن اپنے ساتھیوں سمیت تشریف لے گئے۔ کہتے ہیں کہ ان دنوں حضرت شیخ ایک پتھر پر محو عبادت رہا کرتے تھے اس پتھر پر بمشکل دو آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ مولانا مانک بھی آکر اسی پر بیٹھ گئے۔ اور جب ان کے دوسرے ساتھی آتے گئے وہ بھی ایک ایک کرکے پتھر پر بیٹھتے گئے یہاں تک کہ سبھی کے لئے وہ پتھر کافی ثابت ہوا۔

مولانا مانک کی حضرت شیخ کے ساتھ کافی گفتگو ہوئی اور آخر کار حضرت شیخ کی کرامت اور توجہ سے مولانا پر وہ اثر ہوا کہ دنیا ترک کرکے حضرت شیخ سے سلوک و معرفت کا درس لیا۔ ساری عمر پرہیزگاری، خدا اور عوام کی بہبودی میں صرف کی۔ وہ روحانیت و معرفت میں کامل دکھتا تھے۔

سوزن ریشی

شاہ آباد (ڈورو) کے گاؤں ہر میں ایک درخت کی جوف میں بیٹھ کر بقول حسن جُلاہے کا کام کرتے تھے۔ شریعت کی پابندی سختی سے کرتے تھے مگر تھے بڑے زاہد خشک، اور انہیں اپنی اس زاہدانہ زندگی پر فخر بھی تھا۔ اتفاق سے حضرت شیخ کی ان سے ملاقات ہوئی۔ کافی بحث و تکرار کے بعد حضرت شیخ نے انہیں اپنا ہم خیال بنالیا اور مریدوں میں شامل کرلیا۔

سوزن ریشی حضرت شیخ سے بیعت ہونے کے بعد موضع پران بُون میں گوشہ نشین ہوئے۔ اور بقیہ عمر عبادت و ریاضت میں گزاری۔ رحلت فرمانے کے بعد بنگر واری میں دفن کئے گئے۔

۱؎ تذکرہ اولیائے کشمیر از حسن ص ۱۱۴ ؛ ۲؎ تذکرہ اولیائے کشمیر از حسن ص ۱۲۵

خاطی ریشی

حضرت شیخ کے قیام رُوپہون کے دوران اُن کے مُرید ہوئے اور اُن کی خدمت گزاری بھی کیا کرتے تھے

لچھم ریشی اوّل

شیخ العالمؒ کے مصاحب تھے۔ کافی متقی پرہیزگار اور نفس کش ریشی تھے وفات کے بعد چرار شریف میں دفنائے گئے۔

لچھم ریشی ثانی

بہت بڑے بزرگ اور حضرت شیخ العالمؒ کے مُرید تھے۔ موضع تھجوارہ کے ٹیلے پر دفن ہیں۔

روپہ ریشی

یہ بھی حضرت شیخ کے مُرید تھے۔ بڑے ریاضت کش اور محتاط تھے۔ وترہیل دفن ہیں۔

سدہ ریشی

حضرت شیخ کے مُریدوں میں سے تھے۔ متقی پرہیزگار اور عارف باللہ تھے وفات کے بعد موضع کھل ناروا میں دفنائے گئے۔

بابا نیروز ریشی

پہنچے ہوئے عارف اور مانے ہوئے ریشی تھے۔ حضرت شیخ سے بیعت ہوکر مُریدوں میں شامل ہوگئے۔ ناگام کے گاؤں بارپ میں دفن ہیں

بابا گلاب ریشی

یہ بھی حضرت شیخ کے مُرید تھے۔ وفات کے بعد کھل ناروا میں دفن کئے گئے۔

سدّہ سیر کنٹھ

پانپور کے مندر کا ایک زبردست نفس کش برہمن تھا۔ کہتے ہیں کہ للہ عارفہ کے ساتھ خدا کے بارے میں تکرار ہوئی اور پھر اُسی کے ساتھ حضرت شیخؒ کی خدمت میں آیا اور مسلمان ہوکر عبادت الٰہی میں مصروف ہوگیا مگر یہ بات زیادہ قرین قیاس نہیں کیونکہ للہ عارفہ کے زمانے میں حضرت شیخؒ کافی چھوٹے تھے۔ البتہ اُنکے مرید ہونے کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

بابا بدرالدّین
بابا صدرالدّین
اور وتی ریشی

یہ تینوں حضرت شیخ کے ارادت مند اور مُرید تھے۔ عبادت ریاضت اور خدا ترسی میں لاجواب تھے۔ وفات پانے کے بعد تینوں بالنگل کے گاؤں سایی میں مدفون ہیں۔

فصل سوم

زنانہ خلفاء

حضرت شیخ العالمؒ کا دائرہ ریشیت صرف مردوں تک ہی محدود نہ رہا۔ بلکہ اس دائرے میں کشمیر کی خواتین بھی شامل ہوئیں اور پہلی بار ہمیں تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ریشیت کی تحریک ہی وہ واحد تحریک ہے جو وادیٔ کشمیر کے کونے کونے میں ایک منظم طریقے سے پھیلی اور معاشرے کے اندر مرد و زن دونوں نے اس کی بھرپور آبیاری کی۔

ریشیت کے قافلہ سالار حضرت شیخ العالمؒ کے حلقۂ ارادات میں جس طرح مرد خلفا میں بھی اس وقت کے سربرآوردہ لوگ شامل ہوئے تھے اسی طرح زنانہ خلفا میں بھی ایسی خواتین شامل ہوئیں جنہوں نے امارت، حسن اور فہم و فراست کے لحاظ سے عوام سے اپنا لوہا منوایا تھا۔ اور ان میں سے کچھ تو سماج میں اپنا ایک خاص مقام بھی رکھتی تھیں۔ مثلاً

شنگہ بی بی:۔ اپنے وقت کی ایک کافر ادا حسین تھی۔ عالمِ شباب مشہور

رقاصہ تھیں۔ حسن کی دلفریبی، آواز کی دل کشی اور رقص کی پختگی کا وہ عالم اور شہرہ تھا کہ منزل رسیدہ زاہدوں اور عابدوں کی برسہابرس کی عبادت وریاضت پر اپنی ایک بھرپور انگڑائی اور ترچھی نظر سے پانی پھیر دیتی تھیں۔ بقول حسن "پری پیکر، دلربا و دل آرام، گل رخسار و گل اندام، حسن وجمال میں پرستان کی پریوں کو شرمانے والی، ناز و ادا سے دلوں کو موہ لینے والی، حزین سریلی دل کش آواز سے نغمہ سرائی میں بلبلوں اور ہزار داستانوں کو خاموش بنانے والی، رقص و ناچ اور رنگ رلیوں میں ناز و ادا اور غمزہ و کرشمہ کی ایک جھلک سے منزل رسیدہ عابدوں اور زاہدوں کو زلف کی ایک تار مو میں پھنسا کر ایمان چھیننے والی مشہور رقاصہ تھی"[1]

ننگہ بی بی اپنے حسن کی دلفریب رعنائیوں اور شباب کی مستیوں کی وجہ سے عوام میں یاون ٹرٹ شرالپور جوہن کی متوالی کے نام سے مشہور تھی۔ اس نے سوزن ریشی کی چالیس سالہ کڑی ریاضت کو اپنے ناز نخروں سے خاک میں ملا دیا تھا۔[2]

حضرت شیخ العالم کی ریاضت، عبادت اور وعظ و تبلیغ کا شہرہ جب وادی کے اطراف و اکناف تک پہنچا تو کچھ شرپسندوں نے اس رقاصہ کو حضرت شیخ کو اپنی راہ سے بھٹکانے کی غرض سے تیار کیا۔ حسن و شباب کی مستیوں میں ڈوبی ہوئی ننگہ بی بی بن ٹھن کر اپنے انگ انگ سے حسن بکھیرتی اور بجلی گراتی ہوئی حضرت شیخ العالم کی عبادت گاہ نوشہرہ

١۔ تذکرہ اولیائے کشمیر از حسن ص ۱۰۲

٢۔ ریشی نامہ ملا بہاؤالدین متو۔ (نوٹ: اس سلسلے میں جناب رشید نازکی ریشیات میں اپنے مقالہ ریشی تحریک کے تیوائی کردار میں ص ۱۷ پر لکھتے ہیں "اس قسم کی مثال موزن ریشی کے حالات میں ملتی ہے جہاں تانک ڈالنا نے انہیں یہ کہہ کر آزمائش میں ڈالا کہ خدا نے ان کی عبادت قبول کرکے انہیں ایک حور بخشی ہے۔ یہ کہہ کر ان کو ... واقعی غارت کر دیا۔ ویسے ہوتے ہی بھاگ گئی ریشی اس غم میں ایک ہفتہ کے اندر ہی مر گیا۔ یہ چاپلوس اور ننگی تارک دنیا ہوتی وغیرہ وغیرہ۔" ملا بہاؤالدین متو اپنے ریشی نامہ میں لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ کو بہکانے کی غرض سے ذہنی عورت بھیجی گئی جس نے دس سے سات بھاگ کے غار میں چالیس سال سے عبادت ... ایک ریشی کو اپنے جلوؤں کی حسن و رعنائی سے بہلایا تھا۔ موزن حسن کا بھی یہی خیال ہے!

واقع منصنہ بکھری نزد ویژار ناگ ۱؎ پہنچ گئیں اور حضرت شیخ کو اپنے ناز نخروں سے متوجہ کرنا چاہا۔

جب حضرت شیخ العالم کو اُس کی آمد کا پتہ چلا تو وہ اپنی جلادت گاہ کے دروازے تک آئے اور رقاصہ پر ایک نگاہِ پرجلال ڈالی تو اُس کی دنیا ہی بدل گئی اُس کا حسن و جمال اُس کی دل کش آواز اور اُنگ اُنگ سے پھوٹتی جوانی ختم ہو چکی تھی۔ وہ رقص کی خاطر تھرکتے قدم، بدن کی انگڑائی آنکھوں کے شوخے سب تھم چکے تھے۔ القصہ شنگ بی بی کی جوانی ختم ہو گئی تھی۔ اُس کی جگہ اب وہ ایک بڑھیا بن کر رہ گئی تھی۔ جب اُسے اپنے بارے میں یہ معلوم ہوا تو حضرت شیخ کے پاؤں پڑ کر کافی گڑگڑائی منت سماجت کی اور اپنے کئے پر نادم ہو کر توبہ کی اور خدا کی مرضی سے دوبارہ جوان ہو گئی بیعت ہو کر دائرہ ارشاد میں شامل ہوئیں ساری عمر عبادت، ریاضت نفس کشی اور ترک لذات میں گذاری۔ "بڑے بڑے بزرگوں اور خدا دوستوں کی خدمت گذاری اور ہم نشینی کی برکتیں حاصل کیں،، ۲؎

حضرت شیخ العالم کی وفات کے بعد چرار شریف میں ان کے آستانہ کے دروازے پر مرتے دم تک سجادہ بن کر بیٹھی رہیں۔ انتقال کے بعد حضرت شیخ العالم کی پائینتی میں سپرد خاک کی گئیں۔

شام بی بی:۔ حضرت شیخ العالم کی زنانہ خلفا میں کافی بلند مرتبہ کی حامل تھیں۔ حضرت شیخ اپنی سیاحت کے دوران جب بھی پورہ (بیروہ) جا رہے تھے تو بھی پورہ اور کچھ ہامہ کے درمیان پنج یاری کے مقام پر ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر آرام کرنے لگے کہ اسی اثنا میں ان کی نظر گاؤں کی کچھ لڑکیوں پر پڑی جو جنگلی سبزیاں چننے میں مصروف تھیں انہیں دیکھ کر حضرت شیخ نے فرمایا۔

۱؎ ملا بہاء الدین متو نے کیموہ کی عبادت گاہ لکھی ہے۔

۲؎ تذکرہ اولیائے کشمیر از حسن ص ۱۰۳

کُنہ ہاجہ چھُونیل کتران تَرن دوان درو تو
کوہہ ہاجہ چھُوپنگ سران تتہ ہورن برن کوتو

ترجمہ:۔ کیوں کاٹ رہی ہو، ان سبز پودوں کو۔ کونپلوں کو کیوں درانتی مار رہی ہو۔ عقبیٰ کی تمہیں کاہے کو فکر نہیں۔ وہاں تو یہ سارا ادھار چکانا ہے۔ یہ سن کر ایک لڑکی نے جواب دیا۔

اُسی ہا مالہ چھہ مالہ ڈی دوان تو ستی ہوران داس وار تو
ژُھچکھ عاصہ ہتھہ ساسا کتران کتھہ چھکھ کران زن نو ور تو

ترجمہ:۔ اے بزرگ ہم تو محض تلاش کر رہی ہیں اور اپنے عمل کا پھل چکا رہی ہیں۔ اپنے ہاتھ میں عصا لئے ہزاروں کی جان لے رہے ہو۔ اور زبان سے میٹھے میٹھے بول ادا کرتے جا رہے ہو

کہتے ہیں جواب دینے والی یہ لڑکی شام بی بی تھی جسے عام طور پر شام دید کہا جاتا ہے[1] رشید نازکی اپنے ایک مقالے میں شام دید سے متعلق لکھتے ہیں کہ "جب وہ بابل کے گھر جا رہی تھی تو ناگاہ حضرت شیخ کی نظر کیمیا اثر ان پر پڑی۔۔۔۔ عنایت کی نظر سے اس خاتون پر جذب کا ایسا عالم طاری ہوا کہ پالکی سے نکل بھاگی، حضرت شیخ کے پاؤں پڑی اور زار زار رونے لگی، ہر چند کہ حضرت شیخ نے سمجھایا کہ چلی جاؤ، پردہ میں بیٹھ کر میاں کی خدمت کرو، ماں باپ کی لاج رکھو، لیکن روتی بلکتی رہی حضرت شیخ کے گرد پروانہ وار گھومتی رہی۔ ساتھیوں کے سمجھانے سے بھی باز نہ آئی۔ لباس اور زیور اتار پھینکے دنیا سے بیزار ہو کر عبادت خدا میں ہمہ تن مصروف ہو گئی۔۔۔۔۔۔"[2] مگر فاضل مقالہ نگار نے اس بارے میں کوئی

---

[1] کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مکالمہ بہت بی بی اور شیخ العالم کا ہے مگر جہاں تک مکالمے کی نوعیت اور بعد میں حضرت شیخ کی وفات پر کہے گئے مرثیہ کا تعلق ہے اسے بہت بی بی سے منسوب کرنا مناسب ہوگا۔

[2] ریشیات منظومہ شیخ العالم ششصد سالہ تقریبات کمیٹی ص ۱۶۷ - ۱۶۸

واقعہ مختہ پکھری نزد ویشار ناگ پہنچ گئیں اور حضرت شیخ کو اپنے ناز نخروں سے متوجہ کرنا چاہا۔

جب حضرت شیخ العالم کو اُس کی آمد کا پتہ چلا تو وہ اپنی عبادت گاہ کے دروازے تک آئے اور رقاصہ پر ایک نگاہِ پر جلال ڈالی تو اُس کی دنیا ہی بدل گئی اُس کا حسن و جمال اُس کی دل کش آواز اور رنگ سے بھرپور جوانی ختم ہو چکی تھی۔ وہ رقص کی خاطر تھرکتے قدم، بدن کی انگڑائی آنکھوں کے عشوے سب تھم چکے تھے۔ القصہ شنگ بی بی کی جوانی ختم ہو گئی تھی۔ اُس کی جگہ اب وہ ایک بڑھیا بن کر رہ گئی تھی۔ جب اُسے اپنے بارے میں یہ معلوم ہوا تو حضرت شیخ کے پاؤں پڑ کر کافی گڑگڑا کر منت سماجت کی اور اپنے کئے پر نادم ہو کر توبہ کی اور خدا کی مرضی سے وہ بارہ جوان ہو گئیں بیعت ہو کر دائرہ ارادت میں شامل ہوئیں ساری عمر عبادت، ریاضت نفس کشی، اور ترک لذات میں گذاری۔ "بڑے بڑے بزرگوں اور خدا دوستوں کی خدمت گذاری اور ہم نشینی کی برکتیں حاصل کیں،،[۲]

حضرت شیخ العالم کی وفات کے بعد چرار شریف میں ان کے آستانہ کے دروازے پر مرتے دم تک مجاور بن کر بیٹھی رہیں۔ انتقال کے بعد حضرت شیخ العالم کی پائنتی میں سپرد خاک کی گئیں۔

شام بی بی:۔ حضرت شیخ العالم کی زنانہ خلفاء میں کافی بلند مرتبہ کی حامل تھیں۔ حضرت شیخ اپنی سیاحت کے دوران جب بھی پورہ (بیروہ) جا رہے تھے تو بھی پورہ اور کچھ ہامہ کے درمیان پنج یاری کے مقام پر ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر آرام کرنے لگے کہ اسی اثنا میں ان کی نظر گاؤں کی کچھ لڑکیوں پر پڑی جو جنگلی سبزیاں چننے میں مصروف تھیں انھیں دیکھ کر حضرت شیخ نے فرمایا۔

۱۔ ملا بہاء الدین متو نے کیموہ کی عبادت گاہ لکھی ہے۔

۲۔ تذکرہ اولیائے کشمیر از حسن ص ۱۰۳

کٔنہٕ ہاجہ چھو ٹسیل کتران — ترن دوان درو تو
کوٚنہٕ ہاجہ چھو پلگ سران — تتہٕ ہورن برن کوتو

ترجمہ:- کیوں کاٹ رہی ہو ان سبز پودوں کو۔ کونپلوں کو کیوں درانتی مار رہی ہو۔ عقبیٰ کی تمہیں کا ہے کو فکر نہیں۔ وہاں تو یہ سارا ادھار چکانا ہے۔ یہ سن کر ایک لڑکی نے جواب دیا۔

اُسی ہا مالہ چھہ مالہ ڈی دوان — تو ستی ہوران داس وارتو
ژٕ چھکھ عاصہ ہتھ ساسا کتران — کتھہ چھکھ کران زن نو ورتو

ترجمہ:- اے بزرگ ہم تو محض تلاش کر رہی ہیں اور اپنے عمل کا پھل چکا رہی ہیں۔ اپنے ہاتھ میں عصا لئے ہزاروں کی جان لے رہے ہو۔ اور زبان سے میٹھے میٹھے بول ادا کرتے جا رہے ہو

کہتے ہیں جواب دینے والی یہ لڑکی شام بی بی تھی جسے عام طور پر شام دید کہا جاتا ہے[1]
رشید نازکی اپنے ایک مقالے میں شام دید سے متعلق لکھتے ہیں کہ "جب وہ بابل کے گھر جا رہی تھی تو ناگاہ حضرت شیخ کی نظر کیمیا اثر ان پر پڑی۔ ۔ ۔ ۔ عنایت کی نظر سے اس خاتون پر جذب کا ایسا عالم طاری ہوا کہ پالکی سے نکل بھاگی، حضرت شیخ کے پاؤں پڑی اور زار زار رونے لگی، ہر چند کہ حضرت شیخ نے سمجھایا کہ چلی جاؤ، پردہ میں بیٹھ کر میاں کی خدمت کرو، ماں باپ کی لاج رکھو، لیکن روتی بلکتی رہی۔ حضرت شیخ کے گرد پروانہ وار گھومتی رہی۔ ساتھیوں کے سمجھانے سے بھی باز نہ آئی۔ لباس اور زیور اتار پھینکے دنیا سے بیزار ہو کر عبادت خدا میں ہمہ تن مصروف ہو گئی۔ ۔ ۔ ۔ "[2] مگر فاضل مقالہ نگار نے اس بارے میں کوئی

1- کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مکالمہ بہت بی بی اور شیخ العالم کا ہے مگر جہاں تک مکالمے کی نوعیت اور بعد میں حضرت شیخ کی وفات پر کہے گئے مرثیہ کا تعلق ہے اسے بہت بی بی سے منسوب کرنا مناسب نہ ہوگا۔

2- ریشیات منظوم شیخ العالم شش صد سالہ تقریبات کمیٹی ص ۱۶۷ - ۱۶۸

حوالہ نہیں دیا ہے۔ بالخصوص شام دید کی شادی کے سلسلے میں کہ یہ واقعہ کس محقق نے کہاں درج کیا ہے۔

بہر کیف شام بی بی نے حضرت شیخ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو کر دنیا بیزاری اور عبادات الٰہی میں ساری عمر گذاری۔ کہتے ہیں کہ عمر بھر جنگلی ساگ پات کھاتی رہیں اور ٹھنڈا پانی کبھی نہیں پیا۔ نہ صرف یہ بلکہ حضرت شیخ العالم خود بھی شام بی بی سے پہلی ملاقات میں ہی اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے سبز کاسنی کھانا چھوڑ دی اور عصا کا استعمال بھی ترک کر دیا۔

شام بی بی نہ صرف ایک بہت بڑی عارفہ تھیں۔ بلکہ کشمیری زبان کی شاعرہ بھی تھیں اور کشمیری ادب میں واحد خاتون ہیں جنہوں نے کشمیری میں پہلا مرثیہ لکھا ہے حضرت شیخ العالم کی وفات پر شام بی بی کا یہ پرگداز مرثیہ وفور جذبات کے اعتبار سے آج تک بے مثل ہے نمونہ ملاحظہ ہو ——

نُندہ سنز گو سورگس موتے   اَسہ سنز گو سورگس موتے
مُندہِ سنز کہ سہنز پیا تے   لِلہ ہانے پُودے کرتے
ٹھلے ژرنے روّس چھنہ رمانے   اَسہ سنز گو سورگس موتے

ترجمہ:- نندہ سنز سورگ کو سدھارے۔ ہمارے سنز سورگ کو سدھار گئے ——
اے نندہ سنز آپ نے سہج تک رسائی حاصل کی تھی۔ میں آپ کا کس قدر ماتم کروں۔ آپ کے سوا ہم یہاں کھوتے کھوتے سے لگتے ہیں۔ ہمارے سنز سورگ کو سدھار گئے

آخری عمر میں شام بی بی بابا لطیف الدین کے ساتھ پشکر میں رہ رہی تھیں یہاں وفات پانے کے بعد بابا کے مرقد کے ساتھ ہی انھیں بھی دفن کیا گیا۔

ہِت بی بی:- ریشی ناموں اور نور ناموں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت شیخ العالم جب سیاحت کرتے ہوئے ڈرکام پہنچے تو وہاں پر انہوں نے ۱۲ سال قیام کیا اس دور میں یہاں

کے ذیلدار یا پٹواری کی دو بیٹیاں بہت بی بی اور دہت بی بی بھی حضرت شیخ کے دائرہ ارشاد میں شامل ہوگئیں۔ بعض مورخین اور محققین حضرت شیخ اور شام بی بی کے مکالمے کو بہت بی بی کے ساتھ منسوب کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں یہ لڑکیاں نہ صرف بہت شوخ اور چنچل تھیں۔ بلکہ کافی ذہین اور نکتہ سنج بھی تھیں یہی وجہ رہی ہوگی کہ حضرت شیخ کی نظر عنایت سے وہ بھی اس کاروان میں شامل ہوگئیں۔

بہت بی بی نے حضرت شیخ کی خدمت میں رہ کر ریاضت اور عبادت کر کے طریقت اور سلوک کے اعلیٰ مدارج طے کئے۔ ساری عمر اپنی محنت سے کما کر جو کی روٹی کھاتی رہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جس نے اپنے آپ کو کام کرنے والا خیال کیا اُس نے سب سے بڑا شرک کیا جس نے اپنے آپ کو مٹا دیا اور اپنی ہستی سے چھٹکارہ پایا اُس نے غموں سے خلاصی پائی، امید و بیم اور رنج و غم سے نجات پائی۔ کہتی تھیں کہ اگر حضرت شیخ میرے مرشد نہ ہوتے تو خدا خود میرا رہبر ہوتا۔ وغیرہ۔ جب وفات پائی تو زالسو کر یوے پر سپرد خاک کی گئیں۔ یہ جگہ چرار شریف کے نزدیک ہے اور آج کل زالہ کورین کے نام سے مشہور ہے۔

دہت بی بی جیسا کہ ابھی اوپر ذکر کیا گیا کہ بہت بی بی اور دہت بی بی دریہ گام کے ذیلدار یا پٹواری کی دو بیٹیاں تھیں جنہوں نے حضرت شیخ سے بیعت ہونے کے بعد ان کی شاگرد بن گئیں اور ساری عمر زہد و تقویٰ میں گذاری۔ اکثر مورخین انہے بہت بی بی کی سگی بہن گردانتے ہیں جبکہ بعض اسے حقیقی نہیں بلکہ روحانی بہن مانتے ہیں حقیقت خواہ کچھ بھی ہو مگر اس امر سے مفر نہیں کہ وہ حضرت شیخ کی مریدہ تھیں اور بڑی حاضر جواب معاملہ فہم اور نکتہ رس عارفہ کاملہ تھیں۔ حضرت شیخ کے خاندان کے حلقے میں داخل ہونے کے بعد ان کی زندگی یکسر بدل گئی اور عرفان و آگہی کے سبھی در ایک ایک کر کے وا ہوتے گئے۔ ان کی فہم و فراست اور عرفان و آگہی کا اندازہ اُن گفتگو سے لگایا جا سکتا ہے۔ جو

اُنہوں نے حضرت شیخؒ اور حضرت میر محمد ہمدانی کی ملاقات کے دوران کی۔

فتحات کبرویہ میں شیخ عبدالوہاب نوری لکھتے ہیں کہ جب حضرت میر محمد ہمدانیؒ اپنے ساتھیوں کو لے کر حضرت شیخ العالم سے ملاقات کی غرض سے نکلے تو حضرت شیخ کو باطنی طور پر معلوم ہوا چنانچہ وہ بھی اپنے مریدوں کو چرار شریف سے ساتھ لے کر زالوسنگ استقبال کو آئے۔ یہاں پر دونوں کی ملاقات ہوئی۔ کافی گفتگو کے بعد حضرت شیخ کو حضرت میر محمد ہمدانی نے خلارشاد عطا کیا وغیرہ یہ گفتگو کس زبان میں ہوئی ہوگی۔ انہوں نے ایک دوسرے کی بات کیسے سمجھی ہوگی ان اور ایسی کئی باتوں کا تشفی بخش جواب نہیں ملتا۔ بہر حال دونوں بزرگوں کی گفتگو کے دوران جب حضرت میر محمد ہمدانی نے حضرت شیخ سے پوچھا، اے شیخ گھوڑے کو اتنا لاغر کیوں بنا دیا ہے؟ حضرت شیخؒ نے از راہ انکسار جواب دیا اناڑی سوار ہوں خدشہ ہے کہ کہیں گھوڑا سرکشی نہ کرے اور مجھے راستے میں ہی گرا دے۔ اس دوران دہت [بی بی] جھٹ سے بول اٹھی منزل رسیدہ کو سواری (گھوڑے) اور کجاوہ کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔

حضرت میر نے پوچھا منزل رسیدہ لوگ کون ہیں؟ دہت بی بی نے جواب دیا جو اپنے آپ سے بے نیاز ہو گئے ہیں حضرت میر نے پوچھا کیا تو اپنے آپ سے بے نیاز ہو گئی ہے؟ بی بی نے کہا اگر ایسا نہ ہوتا تو اس پاک مجلس میں گستاخی ہرگز نہ ہوتی۔ حضرت میر نے پوچھا تو بیٹی ہے یا بیٹا، جواب دیا۔ اگر نیست ہوں تو پھر نہ بیٹا نہ بیٹی ہوں اور اگر ہست ہوں تو پھر بھی کچھ بھی نہیں ہوں۔ لڑکا یا لڑکی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا حضرت شیخ نے پوچھا تمہیں یہ شادمانی کس طرح ملی ہے؟ جواب دیا روحانی موت سے نجات پانے کی وجہ سے۔ حضرت میر نے فرمایا تم بہت معنیٰ خیز باتیں کرتی ہو، دہت بی بی نے جواب دیا مقدس و پاک مجلس میں کلام بھی پاک ہی ہونا چاہیئے۔ اس طرح سے ان کا یہ مکالمہ بہت طویل ہے اور حضرت میران کی اس گفت گو سے بہت خوش ہوئے۔ القصہ دہت بی بی

بہت بڑی عارفہ تھیں، ساری عمر حضرت شیخ کے بتائے ہوئے راستہ پر گامزن رہیں۔ کہتے ہیں حضرت شیخ اور حضرت میر کی ملاقات کے دوران دہت بی بی اور رہت بی بی نے ایک دوسرے سے کہا کہ اگر میں خوش قسمت ہونگی تو میری قبر اسی جگہ ہوگی جہاں حضرت شیخ بیٹھے ہوئے ہیں۔ دوسری نے کہا کہ اگر میری قسمت اچھی ہوگی تو میری قبر اس جگہ ہوگی جہاں حضرت میر بیٹھے ہوئے ہیں۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ یہ دونوں زالسو میں اپنی دو جگہوں پر دفن ہیں یہ جگہ اب کشمیری زبان میں زالہ کورین یعنی خاکمر دلڑکیوں کی جگہ کے نام سے مشہور ہے

دنا بی بی:۔ دنہ بی بی بھی حضرت شیخ العالم کی مریدہ تھیں مگر ان کے حالات تفصیل سے معلوم نہیں ہو سکے ہیں۔ کہ بڑی ریاضت اور اعلیٰ درجہ کی عبادت گذار خاتون تھیں مختہ بھیری موجودہ نوشہرہ میں دفن ہیں۔

سلا بی بی چھوٹی اور بڑی:۔ یہ دونوں خواتین حضرت شیخ کے مریدوں میں شامل تھیں۔ ان کے حالات بھی بہت ہی مختصر معلوم ہو سکے ہیں۔ دونوں بڑی اور چھوٹی سلا بی بی کے نام سے مشہور ہیں۔ دونوں پہنچی ہوئی عارفائیں تھیں۔ وفات پانے کے بعد احاطہ چرار شریف میں دفن ہیں۔ حضرت شیخ کے ان مرد اور خواتین خلفا کے علاوہ بھی اور بہت سارے مرید ہوئے ہیں۔ بلکہ ایک روایت یہ ہے انہوں نے تین سو ساٹھ (۳۶۰) ریشیوں کی خود تربیت فرمائی ہے ان میں سے بہت سے ریشیوں کے حالات اور نام نہیں ملتے ہیں۔ اگر کہیں نام ملتے ہیں تو حالات بالکل ہی ناکافی ہیں۔ بہر حال ان کے مریدوں کا ایک طویل سلسلہ تھا جو وادی کے اطراف واکناف میں سلسلہ ریشیہ میں منظم ہو کر دین حق کی اشاعت میں مصروف تھے۔ یہ لوگ نام و نمود سے بہت ہی دور بھاگتے تھے اسی لیے ان کے ہم تک بہت کم حالات پہنچے ہیں۔[۲]

---

[۲] تذکرہ اولیائے کشمیر از حسن ص ۱۷۱

فصل چہارم

ریشیت، منظر اور پس منظر

کشمیر سے متعلق تواریخی کتب کا مطالعہ ہمیں اس بات سے آگاہ کرتا ہے کہ زمانۂ قدیم ہی سے کشمیر ریشیوں اور اہل اللہ کا مسکن رہا ہے۔ کشمیر جس کے بارے میں روایت ہے کہ یہ خطہ کبھی زیرِ آب تھا، جسے ستی سر کہتے تھے اسے جس شخص نے پانی سے نکالا اور آباد کیا، وہ ایک ریشی ہی تھا جسے کشپ ریشی کہا جاتا ہے۔ اور تو اور رگ وید جو ہندوؤں کا سب سے پہلا اور قدیم وید ہے یا اس کا بھی کچھ حصہ کشمیر کی ہی سرزمین پر تخلیق ہوا ہے۔ چندر بھاگا (چناب) اور وِتستا (جہلم) کے علاوہ مڑوہ دار ڈون (تحصیل کشتواڑ) کے علاقوں کا بھی اس وید میں تذکرہ ملتا ہے۔ نیل مت پوران اور راج ترنگنی میں بھی ان سے متعلق حوالے ملتے ہیں۔ گویا کشمیر پر ریشیوں کا روزِ ازل سے ہی سایہ رہا ہے۔ اسی لیے اس کا نام ریشی وار (ریشیوں کا مسکن) پڑ گیا۔ جس سے صاف عیاں ہے کہ کشمیریوں کی مذہبی، سیاسی، سماجی، اقتصادی، معاشی اور معاشرتی زندگی میں یہاں کے ان برگزیدہ روحانیوں کا دخل رہا ہوگا اور اس سے کسی بھی شخص کو مفر نہیں ہے کیونکہ

۱؎ ویدوں کے خالق بھی ریشی ہی کہلاتے ہیں۔

جب ہم ریشیوں سے متعلق اس قسم کے تاریخی حقائق تلاشتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جب تک مذہب اور سیاست کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ تھا تب تک مذہبی رہنما کا خواہ وہ ریشی تھا یا اور کوئی مبلغ ان اہم شعبوں میں براہ راست دخل تھا۔ اور جب ان دونوں کا ایک دوسرے سے تعلق ٹوٹ گیا، جب بھی سماج اور آبادی کے ایک بڑے حصے پر ان ریشیوں منیوں اور بزرگان خدا کا غلبہ حاوی رہا، اور یہ سلسلہ نہ صرف ان کے جیتے جی جاری رہا۔ بلکہ ان کے انتقال کے بعد بھی ان کے تیرتھ استھان، مرقد، مزارات، زیارتیں، خانقاہیں اور ان سے متعلق دیگر مقامات عوام کی توجہ کا مرکز بنے رہے۔ یہاں تک کہ اس سائنٹفی اور مادی دور میں بھی یہ مقامات مرجع خلائق بنے ہوئے ہیں۔

یوں تو مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے ریشیوں کی مختلف اوقات میں جدا جدا تاویلیں اور تعریفیں کی گئیں ہیں مگر سب کا نچوڑ متقی، پرہیزگار، سچا، اہنسا، عالم اور فنافی اللہ وغیرہ ہے۔ اسلام سے قبل کشمیر میں مندرجہ بالا اوصاف سے متصف ہر شخص ریشی کہلاتا تھا ان میں سے شاذ ہی کوئی گھر گرہستی چلاتا، ورنہ ایسے سبھی لوگ ضبط نفس، ترک دنیا اور ترک لذت کر کے تپسیا کے کڑے اصولوں کے پابند ہو کر جنگلوں، بیابانوں اور گپھاؤں میں دھونی رما کر عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ جیسا کہ پہلے ہی ذکر آچکا ہے کہ کشمیر کا سب سے پہلا آباد کار ریشی ہی تھا اس طرح سے کشمیر کی تاریخ ریشیوں سے ہی شروع ہوتی ہے۔

کشمیر میں بدھ مت کے پرچار سے قبل بھی کئی مت اور ادیان پھولے پھلے ہیں۔ اور بدھ مت کی آمد کے بعد بھی یہاں سانکھیہ، شاکھت، ویدانت، شیومت، ویشنو مت اور برہمن مت جیسے فلسفوں اور تحریکوں کا عمل جاری رہا۔ جن سے بدھ مت کو شدت کے ساتھ دوچار بھی ہونا پڑا۔ یہاں تک کہ کشمیر کے عالموں نے بدھ مت کو یہاں ایک نئی جہت عطا کی اور اسے وسط ایشیا کے ممالک ختن، یارقند، کاشغر، سمرقند، بلخ، بخارا کے علاوہ جاوا، سماترا، چین، تبت، ایران اور منگولیا جیسے ملکوں تک بھی پہنچایا۔ کشمیر میں بھی یہ مذہب خوب پھولا پھلا اور اپنا اثر و نفوذ

قائم کیا۔ یہاں کے رشیوں، منیوں اور لوگوں کے لئے بدھ مت کے اصول بہت سازگار تھے اس لئے انہوں نے اس مذہب کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اسے اپنا کر مکتی کی تلاش میں منہمک ہو گئے۔

کشمیر میں بدھ مت اسلام کی آمد کے وقت تقریباً کمزور پڑ گیا تھا اور سانکھیہ، شاکت، ویشنو اور شیومت کا خاصا بول بالا تھا۔ اس لئے اسلام کے پھیلاؤ اور پرچار کے لئے کسی قسم کی مشکل پیش نہیں آئی۔ کیونکہ یہاں پنپ رہے شیو فلسفے کا تصور اسلام کے ساتھ کم و بیش سبھی باتوں میں مطابقت رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ خاص وجوہات یہ ہیں کہ اسلام کی تبلیغ کے سلسلے میں یہاں جو لوگ باہر سے آئے اُن کا براہ راست یہاں کے حکمرانوں سے رابطہ قائم ہوا اور جب یہاں کے حکمران اسلام کے دائرے میں آ گئے تو عوام کو اسلام چھونے میں ہی بہتری نظر آئی۔ رینچن شاہ (صدر الدین) کی مثال واضح ہے۔ عوام الناس تک اسلام پہنچانے کا کام صوفیاء نے احسن طریقے سے انجام دیا ہے۔ یہ وہی صوفیاء ہیں جن میں سے کچھ تو مبلغین کے ساتھ آئے تھے اور بہت سے یہاں کے ہی رشی منی تھے جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا۔

جیسا کہ پہلے ہی ذکر کیا جا چکا ہے کہ دینی رہنماؤں کا سماج کے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں پر کافی اثر و نفوذ رہا ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ یہاں کے ان رشیوں نے بھی کشمیری عوام کو اپنی زندگی اور اپنے طرز عمل سے کافی متاثر کیا ہوگا اور رد و قبول کے اس سلسلے میں جہاں جہاں بھی اختلافات و اتفاق کی گنجائش پیدا ہوئی ہوگی وہاں وہاں اختلاف و اتفاق ضرور ہوا ہوگا۔ یوں تو یہ رشی لوگ پہلے سے ہی عبادت و ریاضت کے عادی تھے مگر اسلام قبول کرنے کے بعد ان کی زندگی میں نمایاں تبدیلیاں آ گئیں۔

مثلاً شریعت کی پابندی، نماز کا باجماعت ادا کرنا، روزے کے مقررہ ایام، اوقات افطار و سحری، اوقات نماز اور دوسری کئی باتیں جو ان کی زندگی میں قبل از اسلام داخل ہی نہیں تھیں۔ اور اسلام کے قبول کرنے کے ساتھ انہوں نے بھی انہیں اپنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہوگی۔ اس طرح سے جب اسلام کشمیر میں آیا تو یہاں کی موجود تہذیب کے ساتھ متصادم

ہونے اور اس کے نتیجے کے ساتھ ساتھ رد و قبول کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا ہوگا۔ جس سے اُس وقت کے عوام کافی متاثر ہوتے ہوں گے۔ لیکن یہاں اِس سلسلے میں بحث کرنے کی گنجائش کم ہے۔ کیونکہ یہاں اصل مقصد تو یہ معلوم کرنا ہے کہ یہاں کے ریشیوں سے کشمیریوں کی زندگی کس حد تک متاثر ہوئی ہے اور اس کے کیا نتائج نکلے ہیں۔

ریشیت یا سلسلۂ ریشیاں خالص کشمیری سلسلہ ہے جو اسلام کے اندر پنپنے والے صوفیوں کے گروہ کی مانند ہے۔ ریشیوں میں اسلام سے قبل اور بالخصوص حضرت شیخ العالمؒ سے پہلے کہیں بھی یہ سلسلہ باقاعدہ دیکھنے میں نہیں آتا ہے۔ حضرت شیخ العالمؒ پہلے ریشی ہیں جنہوں نے اس سلسلے کا پہلی بار آغاز کیا۔ اور سرخیل کی حیثیت اختیار کی۔ اُنہوں نے اپنے ایک اشلوک میں اپنے سے پہلے کے مقتدر ریشیوں کا ذکر اِس طرح کیا ہے۔

اَوَل ریشی اَحمد ریشی   دوئِم حضرت اَویس آو
ترِیم ریشی زلکار ریشی   ژوُرِیم حضرت پلاس آو
پوٗنژِم ریشی رُمہ ریشی   شیَم حضرت میران آو
ستیِمس کوٗرہم دستہ ہشی   بہ کُس ریشی مے کیاہ ناو

ترجمہ:۔ ریشی سلسلے میں پہلے ریشی حضرت احمدؒ ہوئے ہیں۔ دوسرا ریشی حضرت اویس قرنی ہے۔ زلکار ریشی تو تیسرے ریشی ہو گزرے ہیں۔ جبکہ چوتھے ریشی حضرت پلاس تھے۔ پانچویں ریشی رمہ ریشی تھے۔ اور چھٹے حضرت میران ہو گزرے ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ میں ریشی سلسلے کا ساتواں ریشی ہوں مگر حقیقتاً میں کوئی ریشی نہیں ہوں۔ کیونکہ میرا رتبہ اتنا بلند نہیں ہے۔

غرضیکہ اُنہوں نے پہلی دفعہ اِس سلسلے کی کڑیاں جوڑیں اور پھر اُن کے مریدوں کے مریدوں کا ایک ایسا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا کہ وادیٔ کشمیر میں بے شمار ریشی ہو گزرے۔ اُنہوں نے

کشمیریوں کی مذہبی، سیاسی، سماجی، اقتصادی، تمدنی اور ثقافتی زندگی پر ان ریشیوں کا جو گہرا اثر پڑا اِس کا اجمالاً ذکر ملاحظہ ہو۔

حضرت شیخؒ سے متعلق یوں تو بہت سی روائتیں منسوب ہیں مگر جوانی کے دِنوں میں جب کہ اُن کے بھائی اُنہیں چوری اور نقب زنی کی خاطر ساتھ لے جاتے تھے اور اِس سلسلے میں اِن کا جو ردِ عمل رہا ہے وہ ضرور متاثر کن رہا ہوگا۔ مثلاً جب بھائیوں نے انہیں کسی مکان یا دکان سے بھاری اشیاء پکڑانے کو کہا تو حضرت شیخؒ نے اوکھلی وغیرہ پکڑ لی اور جب ہلکی چیز سے مانگی تو چھانی اور ادن یا موٹی وغیرہ تھمادیں۔ یا ایک گھر سے گائے اور چادر چوری کرکے بھائیوں نے اِن کو گھر پہنچانے کے لئے کہا تو اُنہوں نے راستے میں کتے کے بھونکنے کی آواز وُدُ، وُدُ سنی (کشمیری میں وُد کے معنی بیج بونے کے ہیں) تو حضرت شیخؒ ان کے معنیٰ کے بارے میں سوچنے لگے اور سخت پریشان ہوئے لہذا اُنہوں نے چادر گائے پر ڈالی اور اُسے ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ اسی طرح ایک رات بھائیوں نے اُنہوں نے ایک گھر میں گھسنے کو کہا۔ جب حضرت شیخؒ نے اندر مفلس و مفلوک الحال کنبے کو دیکھا تو اپنی ہی چادر اُن پر پھینک کر باہر آئے۔ یہ یا ایسا اس طرح کے واقعات کو اگر درست مان لیا جائے تو اس امر سے اِنکار نہیں کہ وہ سماج جس کے وہ خود ایک فرد تھے اُن سے کیونکر متاثر نہ ہوا ہوگا۔

حضرت شیخ جب اپنے اہل و عیال کو چھوڑ کر غار نشین ہوئے اور بیوی، بچوں اور ماں سے تعلق توڑ کر خدا سے لو لگائی تو کیا یہ اقدام کسی طرح بھی اِس وقت معمولی نوعیت کا رہا ہوگا۔ ہرگز نہیں۔ بچوں کے لئے دعائے موت مانگنا، بیوی بچوں کو غار میں کانٹوں کے بستر پر رات بسر کرنے کو کہنا اور ماں کو اُس کا پلایا ہوا دودھ واپس کرنا ایسے واقعات ہیں جس کا اِس ماحول اور معاشرے پر اتنا اثر پڑا کہ حاکم وقت کے پاس بیوی نے نان و نفقہ کے لئے شکایت کی اور سلطان نے قاضی یا تاج الدین کو حکم دیا کہ اُسے کچہری میں حاضر کیا جائے [illegible] گھسیٹا ہوا پہنچے تو حضرت شیخ کی نگاہ کیمیا اثر نے وہ کام کیا کہ تاج الدین

خود حضرت شیخ کا مرید ہو گیا۔ اور ساری عمر زہد و تقویٰ میں گزار دی گویا حضرت شیخ کی حیثیت اِس قدر ہو گئی تھی کہ حاکم وقت کبھی اُسے زیر کرنے میں ناکام رہا۔

کشمیر کے ریشیوں کا مرتبہ اس وقت کے سماج میں اِسقدر بلند تھا کہ حکام وقت بھی اِن سے یہ خواہش رکھتے تھے کہ اُن کا آداب بجا لائیں۔ اِس ضمن میں کئی مثالیں موجود ہیں مثلاً حضرت شیخ سے پہلے ایک ریشی سوزن کے نام ہوئے ہیں جنہوں نے تحصیل چاڈورہ کے نزنامی گاؤں کے غار میں چالیس سال تک زبردست عبادت و ریاضت کی۔ اِتفاق سے ایک دن سلطان شمس الدین کا بیٹا سلطان جمشید شکار کھیلتے کھیلتے غار تک چلا گیا اس نے ریشی کو دیکھا مگر ریشی نے بادشاہ کا آداب تک بجا نہیں لایا جس کی وجہ سے وہ سخت آزردہ ہو کر واپس شہر آیا اور وہاں سے ایک مشہور زمانہ بدکار رقاصہ نندہ کچن یا خاندی کو ریشی کے غار پر اس غرض سے بھیجا کہ وہ اپنے حسن و جمال سے ریشی کو اپنے جال میں پھنسا کر بدکاری پر آمادہ کرے۔ چنانچہ وہ بادشاہ کے کہنے کے مطابق ریشی موصوف کے غار پر پہنچی اور اِسے اپنے جال میں پھنسانے میں کامیاب ہو گئی اور رات ریشی کے ساتھ بسر کر کے دوسرے دن سویرے ہی بھاگ کھڑی ہوئی اور بادشاہ کے پاس اپنی کامیابی کا حال کہہ سنایا اور بہت بڑا انعام و اکرام پایا۔ ے۱

ے۱ تذکرہ اولیائے کشمیر از حسن ص ۱۲۱۔ حسن وقائع کشمیر کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ جب نندہ کچن ریشی کے پاس گئی تو اُس نے ریشی کو کہا کہ آپ کی عبادت کے بدلے خدا نے مجھے آپ کی خدمت کے لئے بھیجا ہے اِس لئے مجھے اپنی خدمت کا موقعہ دیجئے۔ ریشی بہک گیا اور دوسرے دِن جب وہ بدکار عورت بھاگ گئی تو رِیشی کو راہ سے بھٹکنے پر کافی ندامت ہوئی لہذا سات روز تک وہ بیزاری کے عالم میں رہا اور نویں دن وفات پا گیا۔ جب اِس کی خبر دلی میں پھیل گئی تو نندہ کچن اپنے کئے پر سخت نادم ہوئی اور توبہ کر کے ترکِ دنیا کی زندگی بسر کی۔ اور اپنی پونجی سے نندہ مرگ کے میدان کے لئے جو کہ تیج بہاڑہ کے نزدیک ہے ولیشو سے ایک ندی نکلوائی جسے ندی کوہل کہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ سلطان جمشید تپ دق کی بیماری سے مر گیا تھا۔

حسن ایک اور واقعہ لکھتے ہیں کہ ایشہ بری میں ایک نفس کش تپسیا کرنے والا سادھو رہتا تھا جو لوگوں کی توجہ کا باعث بنا ہوا تھا اور بے شمار لوگ اُس کے درشن کرنے جاتے تھے اور اپنی مرادیں پاتے تھے۔ ایک دن شہزادہ میرزا شکار کھیلتے ہوئے اِس طرف نکل گیا اور سادھو سے ملاقات بھی چاہی۔ مگر سادھو نے ملنے سے اِنکار کیا جسے شہزادے نے اپنی ہتک سمجھا اور واپس آکر یادن مشری نام کی ایک خوبصورت رقاصہ کو سادھو کو راہ سے بھٹکانے کے لئے روانہ کیا۔ یادن رقاصہ نے سادھو کو اپنے ناز نخروں سے فریب دیکر جال میں پھنسایا اور ساری عبادت و ریاضت پر پانی پھیر دیا۔ دوسرے دن یہ بات سارے علاقے میں پھیل گئی اور سادھو کے عقیدت مند بہت شرمندہ ہوئے۔[1]

حضرت شیخ العالمؒ جب اپنی سیاحت کے دوران غالباً پکھری نوشہرہ میں مقیم تھے تو اُن دنوں اِسی یادن مشری کو بقول حسن اُن لوگوں نے جو ایشہ بری کے سادھو کے عقیدت مند تھے اِنتقام لینے کی غرض سے حضرت شیخ کو ورغلانے کی خاطر نوشہرہ بھیجا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ سادھو کے عقیدت مندوں (ہندوؤں) کا کام نہیں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جب سادھو کو بھٹکانے کے لئے شہزادہ نے یادن مشری کو بھیجا تو ظاہر ہے کہ یہ رقاصہ عام لوگوں سے بلند مرتبہ کی حامل تھی جو عام لوگوں کی بات میں آنے کی نہ تھی بلکہ اسے شہزادہ جیسے لوگوں نے ہی حضرت شیخ کو ورغلانے کے لئے بھیجا ہوگا۔ کیونکہ حضرت شیخ اِس سے قبل بھی بادشاہ کے بلانے پر تاج الدین کے ہمراہ دربار میں حاضر نہ ہوئے بلکہ تاج الدین خود حضرت شیخ کا مرید بن گیا۔ اِسی لئے اگر کسی رشی کا ملاقات نہ دینا بے عزتی کے مترادف ہو سکتا ہے تو بلانے پر دربار میں نہ آنا اِس سے کم ردعمل کا حامل نہیں ہو سکتا ہے۔ لہٰذا

---

[1] تذکرہ اولیائے کشمیر از حسن ص ۱۷۱۔ حسن نے اِس سادھو کا نام نہیں لکھا ہے۔ دت سے حضرت شیخ سے پہلے جس سادھو کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا ہے اُس کا نام سوزن ہی تھا۔ اِس کی تصدیق حضرت شیخ کے ایک شلوک سے بھی ہوتی ہے ؎

ژودیا رتھ پھیور کھ واڑ بر کو زن　　　ژٹے کھ کوژٹے سوزن ناو

حضرت شیخ کو پر کھنے یا پھسلانے کا منصوبہ اُس وقت کے حکمران ٹولے کا ہی ہو سکتا ہے۔ عام لوگ تو اُنکے جاں نثار اور بے پناہ عقیدت مند تھے۔ اور ان عام لوگوں کے لئے ایسے بزرگ کے راہ سے بھٹکنے کا بظاہر کسی طرح بھی سود مند نہیں دکھائی دیتا اور نہ اِس پر یقین ہی کیا جاسکتا ہے۔

اِسی طرح بابا بام الدین اور بابا زین الدین کے ضمن میں بھی اِن باتوں کا ذکر آچکا ہے کہ ایک مرتبہ سلطان علی شاہ بابا بام الدین کے پاس شاہی لباس تبدیل کر کے نصیحت حاصل کرنے گیا۔ بابا نے علی شاہ سے جس طرح کی گفتگو کی اُس سے صاف ظاہر ہے کہ بابا نے جہاں نصیحت کرتے وقت احتیاط و احتراز سے کام لیا ہے وہاں بادشاہ کو دوبارہ نہ آنے اور اپنی مجلسوں میں اُن کا نام نہ لینے کی تلقین بھی کی ہے جس سے ظاہر ہے بادشاہ پر خاطر خواہ اثر ہوا ہوگا۔

بابا زین الدین کے پاس سلطان زین العابدین اپنی شاہ کوہل کی کھدائی کے دوران ملاقات[۱] کے لئے گیا۔ مگر بابا نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اِس پر سلطان ناراض ہوا اور بابا کو جلاوطن کر کے تبت بھیج دیا جہاں اُنہوں نے اِسلام کی تبلیغ کی لیکن ایک دن وہاں کے راجہ کا بیٹا مر گیا جس کی تہمت بابا پر لگادی گئی۔ روایت ہے کہ خدا کی مرضی سے راجہ کا بیٹا پھر سے زندہ ہو گیا اور بابا کی گلو خلاصی ہوئی۔ کہتے ہیں کہ بابا زین الدین کو جلاوطن کرنے کے بعد زین العابدین کے پاؤں میں شدت سے درد ہوا اور کافی علاج کروانے کے بعد بھی آرام نہ ہوا۔ پھر خیال آیا کہ کہیں بابا کی ناراضگی نہ ہو چنانچہ سلطان نے اپنے بیٹے حیدر خان کو نہ صرف عذر خواہی کے لئے بھیجا بلکہ انہیں بڑی عزت و شان کے ساتھ واپس بھی لایا اور سلطان نے خود اپنے پاؤں پر چل کر استقبال کیا اور درد بھی جاتا رہا۔

---

[۱] تذکرہ اولیائے کشمیر از حسن ص ۱۳۱ – ۱۳۲۔

مندرجہ بالا اجمالی واقعات دہرانے سے مراد صرف یہ کہ عوام اور حکام کے تئیں ان کا کیا سلوک رہا اور ان کے طرزِ عمل سے عوام پر کیا کیا اثرات پیدا ہوئے ہوں گے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ان درویشوں، فقیروں اور بزرگانِ خدا کا اہلِ دنیا سے کتنا تنفر تھا۔ اور اہلِ دنیا کو ان سے کتنی عقیدت تھی اور جہاں جہاں یہ ریشی لوگ ان اہلِ دنیا یا حکامِ وقت سے ملتفت نہ ہوئے اس کے نتیجے میں معتوب و عتاب کبھی ٹھہرے۔ لیکن یہ رویہ سب نے نہیں اپنایا۔ شہنشاہ اکبر کی مثال ریشیوں کے تئیں عقیدت و احترام کی ایک زندہ و تابندہ دلیل ہے کہ یہ ان سے بہت متاثر تھے۔ چنانچہ ابوالفضل نے جب ایک ریشی کے بارے میں شہنشاہ اکبر کو بتایا تو اکبر نے اُسے اُس سے ملنے کو کہا۔ اِس سلسلے میں صوفی اکبر نامہ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ ابوالفضل کا بیان ہے کہ :-

I MET WITH THE SAINT..... HE LIVED APART FROM JOY AND SARROW, AND TOOK NOTHING FROM ANY BODY EXCEPT BROKEN BREAD. THOUGH I DID NOT KNOW THE KASHMIRI LANGUAGES YET I GATHERED MUCH EDIFICATION THROUGH AN INTERPRETER, AND A NEW VISION DAWNED ON ME. AS HIS HEART WAS MUCH ALIENATED FROM THE PEOPLE, HE COULD NOT COME OUT FROM HIS CELL HIS MAJESTY WAS DELIGHTED WITH THIS NEWS AND RESOLVED THAT HE WOULD GO IN PERSON[۱]

---

[۱] KASHIR BY G.M.D SUFI VOL I P. 96-97

ابوالفضل آئین اکبری میں کشمیر کے سب سے زیادہ جن قابل تکریم و تعظیم برہمنوں کا ذکر کرتا ہے وہ دراصل یہی ریشی ہیں۔ وہ لکھتا ہے :-

"THEY DO NOT LOOSEN THE TONGUE OF CALUMNY AGAINST THOSE NOT OF THEIR FAITH, NOR BEG NOR IMPORTUNE. THEY EMPLOY THEMSELVES IN PLANTING FRUIT TREES, AND ARE GENERALLY A SOURCE OF BENEFIT TO THE PEOPLE. THEY ABSTAIN FROM FISH MEAT AND DO NOT MERRY. THEY ARE ABOUT TWO THOUSAND OF THEIR CLASS"[1]

اسی طرح کا تذکرہ [illegible] تزک جہانگیری کے حوالے سے اپنی تاریخ کشمیر میں ان الفاظ میں کرتا ہے۔

" THOUGH THEY (THE MUSLIM RESHIS) HAVE NOT RELIGIOUS KNOWLEDGE OR LEARNING OF ANY SORT, YET THEY POSSES SIMPLICITY AND ARE WITH OUT PRETENCE. THEY ABUSE NO ONE. THY RESTRAIN THE TONGUE OF DESIRE AND FOOT OF SEEKING. THEY EAT NO FLESH, THEY HAVE NO WIVES, AND ALWAYS PLANT FR-

---

[1] THE AINI AKBARI TRANSLATED BY COLONOL H.S. JARRETT P-355

-UIT BEARING TREES IN THE FIELDS SO THAT MEN MAY BENEFIT BY THEM, THEMSELVES DESIRING NO ADVANTAGE. THEY ARE ABOUT 2,000 OF THESE PEOPLE[1]

مذکورہ بالا اقتباسات میں بیان کی گئی صفات سے متصف ریشیانِ کشمیر یہاں کے مکینوں کی زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز رہے ہیں۔ کشمیری عوام کی زندگانی کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو رہا ہوگا جس پر یہ لوگ اُس وقت تو کیا آج تک حاوی نہ رہے ہوں۔ ہر ملک میں مذہب سیاست اور تمدن جیسے پہلو قابل ذکر ہیں۔ اور جب ہم ان پہلوؤں پر غور کرتے ہیں تو ان خرقہ پوشوں کا ان سبھی پر واضح اور منفرد رنگ دکھائی دیتا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ اِس سلسلے میں کئی جگہوں پر اختلافات بھی پیدا ہوئے ہونگے۔ مثلاً مذہب کی تبلیغ سادات کے بعد کشمیر میں ریشیوں نے کی ہے لیکن سادات کے طریقۂ تبلیغ اور ریشیوں کے طریقۂ تبلیغ میں خاصا فرق رہا ہے۔ سادات شریعت یعنی قرآن، حدیث کے سخت پابند تھے۔ جبکہ ریشی شرعی اُصول میں سے بعض پر انتہا پرستی کی حد تک کاربند تھے اور بعض باتوں میں وہ شرعی قوانین سے ایک الگ راہ اپنائے ہوئے تھے۔ مثال کے طور پر انہوں نے ازدواجی زندگی سے انحراف کر کے ترکِ دنیا، ترکِ لذات کو اپنا کر گوشہ نشینی اختیار کی۔ سخت عبادت میں محو رہ کر صائم الدہر اور قائم اللیل کی زندگی بسر کی اور عمر بھر کا سنی اور ابتل ساگ پر گزارہ کیا۔ لہٰذا ایسا سب کچھ کرنے کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن یہ لوگ جہاں جہاں گئے وہاں اپنے کردار اور اخلاق سے عوام کے دِلوں میں گھر کیا اور دینِ اسلام پھیلایا۔ اِس طرح سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سادات اور ریشیوں میں ضرور اختلاف پیدا ہوا ہوگا۔ کیونکہ ریشیانِ کشمیر کا جہاں ایک طرف روزمرہ کا یہ معمول تھا جس

---

[1] KASHIR BY G.M.D. SUFI VOL. I P. 97

تا ابھی اس سے پہلے ذکر آچکا ہے وہاں دوسری جانب انہیں کشمیر کے تہذیبی ورثے کے تحفظ کا شدت سے احساس بھی تھا۔ وہ کشمیر میں اسلام کی آمد کو خوش آمدید بھی کہہ رہے تھے مگر یہاں کی صدیوں پرانی سنسکرتی کو چھوڑنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ اس کے برعکس اسلام ہر نقش کہن کو مٹا کر ایک نیا قانون نیا نظام اور نئی تہذیب سے عوام کو آشنا کرانا چاہتا تھا۔ اس طرح سے کشمیر میں دو تہذیبوں کا ایک ایسا تصادم ہوا جس میں بہت سے لوگ ایسے بھی شامل ہوئے جو ہر نئی چیز کو خوش آمدید کہنے کے عادی تھے اور پھر انہوں نے اپنے ہی تہذیبی ورثے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جسے ریشیوں نے بہت ہی ناپسند کیا۔ اس کی سب سے بڑی مثال سلطان سکندر کے وزیر سہہ بٹ کی ہے جس نے ہندوؤں کے مندروں کا انہدام اس زور و شور کے ساتھ کرایا کہ سلطان سکندر کو مورخین نے بت شکن کہنا شروع کیا۔ حالانکہ تصویر کا حقیقی صفحہ یہ نہ تھا۔ بلکہ حقیقت یہ تھی کہ سہہ بٹ نو مسلم تھا۔ اور اسلام قبول کرنے کے بعد وہ پھر ہندومت اپنانا چاہتا تھا۔ مگر ہندوؤں نے اسے اپنانے سے انکار کیا لہٰذا اس کے ردعمل میں اس نے نہ صرف ہندوؤں کو ستایا بلکہ ان کی عبادت گاہوں کی بنیادیں تک ہلا دیں۔ اس کے ایسے اقدامات کے خلاف ہر ذی شعور آواز بلند کرنے کا حق رکھتا تھا پھر جب ریشیوں کے سرخیل اعلانی حضرت شیخ العالمؒ خود موجود تھے تو انہوں نے اس کے خلاف احتجاج کیوں نہ کیا ہوگا۔ اسی لئے کشمیر کے مورخ جونراج کا یہ بیان کہ سہہ بٹ نے مسلمانوں کے سب سے بڑے گورو پر پابندی لگادی ان حالات کے عین مطابق تھا۔ جونراج نے "جونکونایر نم گورم" لکھا ہے یعنی یودلوں (مسلمانوں) کا سب سے بڑا گورو تو اس وقت حضرت شیخؒ سے بڑا مسلمانوں کا گورو کون رہا ہوگا۔

ہری کشن کول نے لکھا ہے:۔

"SUHA BHATTA'S CALUMNY OF SEDITION AGAINST SHEKH - NUR - UD - DIN (MALA NORDINA) PROBABLY RESTS ON THE CHRGE THAT HE TOO...

SIDES WITH THE BRAHMANS WHEN THEY WERE SUBJECTED TO ATROCITIES. IT APPEARS THAT F-REEDOM OF THE SHEIKH WAS CURTAILED BY THE MINISTER[1]

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان ریشیوں کو اپنی صدیوں پرانی روایات سے اس قدر محبت تھی کہ وہ انہیں ترک کرنے پر کسی طرح بھی تیار نہ تھے۔ اور اس طرح سے یہاں ٹکراؤ کی ایک شدید صورت حال پیدا ہوئی ہوگی۔ کیونکہ جیسا پہلے ہی ذکر آچکا ہے کہ سادات کا یہاں کے مسلم حکمرانوں سے براہ راست تعلق تھا جن کے زیر نظر یہاں اسلام کا بول بالا ہوا لیکن جہاں تک رسوم و روایات، تہذیب و تمدن اور دیگر باتوں کا تعلق تھا ریشی لوگ اُس طرح کی زندگی سے اگرچہ منحرف نہ تھے مگر سختی سے عمل پیرا بھی نہ تھے۔ اس لئے اختلافات پیدا ہوتے رہے ہونگے۔ نتیجہ کے طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ ریشیوں نے شہر سے ہجرت کر کے پہاڑوں کے دامنوں میں پناہ لی یا دیہاتوں کی طرف نقل مکانی کر کے چلے گئے۔ اگر ہم اس پر غور کریں کہ جتنے ریشی ہو گزرے ہیں ان میں سے کسی ایک کا مدفن بھی شہر میں موجود نہیں بلکہ پہاڑوں، دیہاتوں اور بیابانوں میں واقع ہیں تو اس کی اس کے سوا اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان بزرگوں کا اس وقت کے حکمرانوں سے نباہ نہیں ہو سکا ہوگا۔ اس ضمن میں چند ایک مثالیں دی جا چکی ہیں کہ جب کبھی کوئی شہزادہ یا سلطان ان سے ملاقات کے لئے گیا تو انہوں نے ان سے کسی بھی قسم کا التفات نہیں برتا۔

حضرت زین الدین کا جلاوطن ہونا، حضرت شیخ پر پابندی لگانا، حضرت شیخ سوزن ریشی یا دوسرے ہندو سادھوؤں کو درغلانے کی کے لئے اُس وقت کی بدکار رقاصہ کو بھیجنا اس کے سوا اور کیا معنی رکھتا ہے کہ ان ریشیوں اور سیاسی رہنماؤں یا مذہبی ٹھیکے داروں کے درمیان کشیدگی

---

[1] RAJTARANGI BY JONARAJA ...T — 138
ENGLISH TRANSLATION BY SRI KANTH KOUL P-101

پیدا ہوئی ہوگی اور یہ انہیں نیچا دکھانے کی کوشش میں لگے رہے ہونگے۔

جہاں تک عوام کا تعلق ہے انہیں ریشیوں کے ساتھ بہت ہی لگاؤ رہا ہے۔ جہاں جہاں ریشی لوگ گئے عوام جوق در جوق ان کی خدمت میں حاضری دیتے رہے اور وہ عوام میں مقبولیت حاصل کرتے رہے۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ ان ریشیوں کی بدولت کشمیر میں زیارتوں اور خانقاہوں کی تعمیر سے یک گونہ فن تعمیر کو رواج ہوا جس سے کشمیری فن تعمیر بھی متاثر ہوا اور نئے طرز تعمیر کو فروغ ملا۔ ریشیوں کے طرز بود و باش کو بھی عوام نے بڑی حد تک اپنایا۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں اس وقت بھی کشمیر میں کئی گھرانے ایسے ہیں جو چند خاص دنوں میں گوشت وغیرہ کھانا ترک کر دیتے ہیں۔

القصہ ریشیان کشمیر کا کشمیر کے سماج، ماحول، یہاں کی سیاست، تہذیب، تمدن، مذہب اور دیگر رسوم ورواج پر گہرا اثر پڑا ہے۔ گو ان کی زندگی سادہ تھی مگر ان کی خدمت بے لوث تھی۔ نام و نمود کی انہیں ضرورت نہ تھی۔ انہوں نے اسلام قبول کیا مگر اپنی روایات کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ انہوں نے مجاہدانہ، مجتہدانہ، عارفانہ اور عابدانہ زندگی تو گزاری مگر یہاں کے خمیر سے اٹھی اُن سب باتوں کو سینے سے لگائے رکھا۔ جس میں یہاں کے عوام کی بہبودی، بہتری انہیں نظر آئی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد ان کے نام بھی اسلام کے مطابق رکھے گئے مگر عوام میں اُن کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ وہ انہیں اپنے ناموں سے یاد کرتے رہے۔ جن سے کشمیریت ٹپکتی تھی۔ حضرت شیخ العالم، نند ریشی، بابا زین الدین، زینہ شاہ یا اسی طرح کے دوسرے کئی ریشیوں کے خالص کشمیری نام ہیں اور وہی مقبول عام ہیں۔ اور اس وقت ان کی زیارتیں عوام کی حاجت روائی کے مرکز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لہذا حالات، واقعات اور دیگر کیفیات کا بغور مطالعہ کرنے اور ان کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ کشمیر کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ریشیوں کی زیارتیں اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ انہوں نے ان مقامات پر عوام کی رہبری، رہنمائی اور انہیں دین اسلام سے آگاہ کرنے کا احسن طریقے سے فریضہ انجام دیا ہے

کشمیر میں ہندو مسلم کے آپسی بھائی چارے اور میل جول کے جو نقوش ابھرتے ہیں ان کے خاکے ان ہی ریشیوں کے رہین منت ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان دونوں طبقوں میں یہ لوگ یکساں مقبولیت رکھتے ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ان بزرگوں کی زیارتیں، خانقاہیں اور آستان، عوامی اجتماعوں اور ملنے جلنے کے خاص مقامات اور کشمیر کی تحریک آزادی کے دوران بھی ان ہی مقامات سے آوازیں بلند ہوتی تھیں۔ اور یہاں سے ہی عزم و حوصلے کے ساتھ عوام غلامی کی زنجیریں توڑنے کا عہد کرتے تھے۔ یہ مقامات آج بھی ان مقاصد کے لئے استعمال ہوتے ہیں خواہ دینی مسئلہ ہو یا سیاسی! ابتدا یہاں سے ہی ہوتی ہے۔

چنانچہ اس امر سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ایسے اولوالعزم بزرگ جو اپنے جیتے جی ہی عوام میں بے پناہ مقبولیت کا باعث تھے۔ ان سے اُس وقت کی تہذیب، سیاست اور اس وقت کے سیاستدانوں، مذہبی رہبروں اور دوسرے آس پاس کے لوگوں نے اثر قبول نہیں کیا ہوگا۔ بقول رومیؒ

یک زمانہ صحبتے با اولیاء   بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا
گر تو سنگِ خارہ مرمر شوی   چون بصاحبدل رسی گوہر شوی

J&K ACADEMY OF ART CULTURE & LANGUAGES

J&K ACADEMY OF ART CULTURE & LANGUAGES